رُوس کی ایک جھلک

ОТРАЖЕНИЕ РАССИЙ

سلمیٰ اعوان

Салма Аван

روس کی ایک جھلک

ОТРАЖЕНИЕ РАССИЙ

(سفرنامہ)

سلمیٰ اعوان

Салма Аван

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-384-6

کتاب	:	رُوس کی ایک جھلک
مصنف	:	سلمیٰ اعوان
موسم اشاعت	:	2010
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	ورڈمیٹ، اسلام آباد
قیمت	:	550.00روپے

دوست پبلی کیشنز، پلاٹ110، سٹریٹ15، I-9/2، پوسٹ بکس نمبر2958، اسلام آباد
فون: 051-4102784-5 E-mail: dostpub@comsats.net.pk

رُوسی قوم کے اُن جذبوں کو سلام!

جنہوں نے بڑے بڑے محل میناروں سے لے کر چھوٹے گلی کوچوں اور اُن کے چوراہوں تک میں بکھری تاریخ کو رنگ و آہنگ کے پیرہن پہنا کر یوں معتبر بنا ڈالا کہ آج ثقافتی و تاریخی ورثے سے مالا مال ملکوں میں رُوس بہت نمایاں اور سربلند ہے۔

Привет Волье Русских Народ

Котори Изобрател Измненя И Собрал, Как Устроиство, Културни. Историю Сахранили Все Раскрашивать Жизн, Верным И Следетве, Бгати Културе. Это Видом – Выдающийся, В Между Багатим Странам.

اظہارِ تشکر

ڈاکٹر اشرف نظامی صاحب، ڈاکٹر عبدالرشید

اور خصوصی شکریہ

شاہد علی

СпосиБо и Помощь ВЧ. Ашраф Низами, ВЧ АБдул Рашид И ОсоБенмо Шахид Али

انتساب

اُن سب کے نام

جو انسانوں کے بے کراں ہجوم میں اک ذرا رُکے، جھکے، ہاتھ تھاما،
راہ دکھائی اور روس کی تھوڑی سی چہرہ شناسی میں مدد دی۔
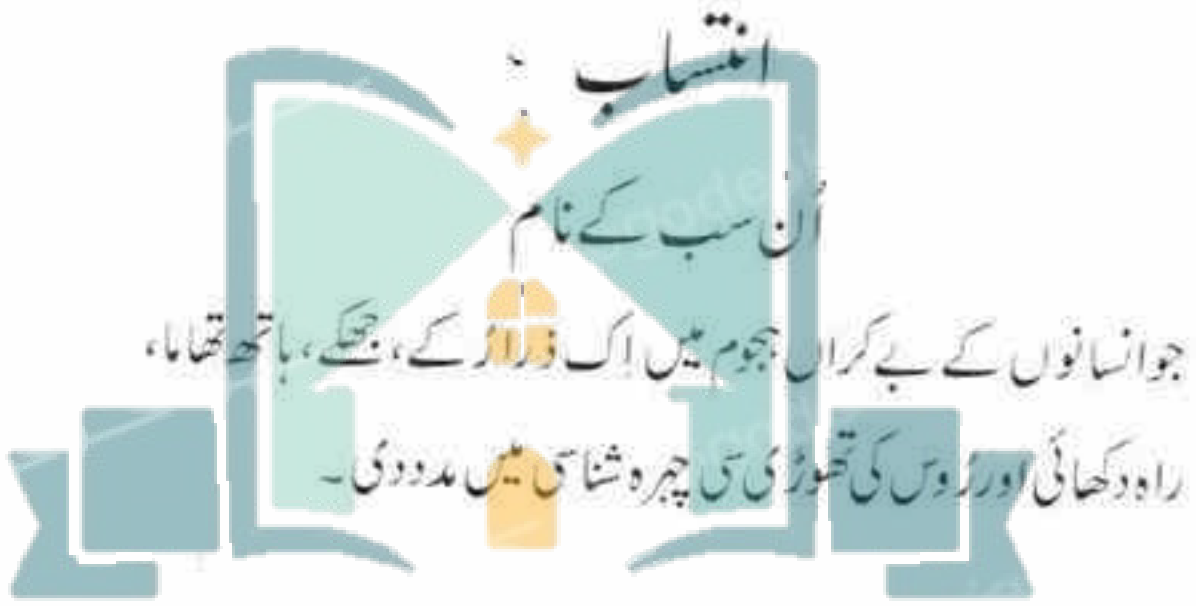
Посвящение

Имена Для Всех

В Талпе Народа , Накленнил , Держат С Рукой , Указал Путь И Нимнога Показал Виражене Русские Лица.

Hasnain Sialvi

ترتیب

E Books
WHATSAPP GROUP

روس کی ایک جھلک

رشین فیڈریشن

مرکزی ماسکو

باب

1

ولولے دلِ ناہنجار کے

انداز کٹھیلے ایف آئی اے کے • وار نو کیلے ماسکو پولیس کے

Неритодно Сердце Подниматся

Певаст ФИА – Остре Московски Млицески Ходар

اب سچی بات یہی ہے کہ میں خواب میں تو رُوس جانے کا سوچ سکتی تھی پر حقیقتاً ایک دن اُس سرزمین پر اُتر جاؤں گی۔ اس کا کوسوں دُور دُور کوئی امکان نہ تھا۔

خدا کی عنایات، اُس کی نوازشات کا ہر لمحہ شکریہ۔ تخلیق ہوں اُس کی۔ زندگی کے سفر میں مختلف مرحلوں پر پیدا ہونے والی خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل کرنا اُس کا فرض ہے۔ پر مقدر ہرگز ایسا نہیں ہے کہ جہاں بن مانگے خوشیاں جھولی میں آ گریں۔ جو نصیب ہوا اُس کے تعاقب میں دعاؤں کی لمبی قطاریں ہیں۔ طویل سجدے ہیں اور اَن تھک محنت کی جانفشانیاں۔

کہیں جھپٹنے سے ہی اس آوارگی کے جراثیم جسم و جان میں رچ بس سے گئے تھے۔ کبھی دادی اور کبھی ماں سے چار چوروں کی مار کھاتی پر باہر گھومنا پھرنا پھر بھی کم نہ ہوتا۔ جب پڑھنے کا چسکہ پڑا تو کوہ قاف کی کہانیاں جان و جگر ٹھہریں۔ کوہ قاف کا تحیّر اجنبی جگہوں اور سرزمینوں کی کھوج میں گھلتا چلا گیا۔ سارے سریر میں مُسرت کی ایک سنسنی سی لہر دوڑا دیتا۔ کسی کتاب، کسی

رسالے، کسی اخبار میں سفرنامے کا کوئی خوبصورت دلچسپ ٹکڑا بے کل کر دیتا۔ چند لمحوں کے لئے کتاب یا رسالہ بند ہو کر سینے پر آ جاتا۔ احساسات کی شدّت آنکھوں کو گیلا کر دیتی۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک شکایت لبوں پر آ کر سوال کی صورت بکھرنے لگتی۔

''آخر اس لکھنے والے کی جگہ میں کیوں نہیں ہوں؟'' پھر اندر سے ایک آہ ''کاش'' میں لپٹی ہوئی نکلتی۔

''کاش'' میں وہاں ہوتی اور یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتی۔ یہ ''کاش'' پھیل کر اتنا بڑا ہو جاتا کہ گلوں اور شکوؤں کا ایک طوفان مجھے اپنے گھیرے میں لے لیتا۔

مغرب کی نماز میں ہمیشہ سے کھلی جگہ پر ادا کرنے کی شوقین رہی ہوں۔ جھٹ پٹے کے وقت آسمان کی رنگت، اُس کی وسعت، اُس کا عجیب سا ایک فسوں میری رگ رگ میں رقت آمیز جذبات کا الاؤ سا دہکا دیتا۔ اکثر و بیشتر میں اپنی چھت پر بکھرے آسمان کے اُس ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے ضدی اور ہٹیلے سے لہجے میں ضرور کہتی۔

مجھے دیکھنا ہے تجھے، اجنبی سرزمینوں پر، رنگارنگ لوگوں میں، نئے آسمانوں، نئی زمینوں اور نئے رنگ و آہنگ میں۔

بہت سے مقامات ایسے بھی آئے جہاں وسائل اور افراد کی دستیابی مجھے خوش قسمت کر سکتی تھی، لیکن نہیں، اُوپر والے نے آب و دانہ نصیب میں نہیں لکھا تھا۔ تاہم پھر بھی شکر گزاری ہے کہ وقتاً فوقتاً تھوڑے سے جھونگے سے اُس نے مجھے بہلانا شروع کر دیا۔ اب اگر وہ یہ بھی نہ کرتا تو بھلا میں نے اُس کا کیا کر لینا تھا۔

یہ اواخر مارچ کے دن تھے۔ میں گوجرانوالہ سے چالیس کلومیٹر دور گاؤں اپنے پھوپھی زاد بھائی کی زمینوں پر گئی ہوئی تھی۔ اُن کے ڈیرے پر شیشم اور نیم کے درختوں کی چھاؤں تلے چارپائی پر بیٹھے ہوئے فضا پر چھائے الوہی سناٹے اور گندم کے تاحدِ نظر پھیلے قدرے سنہری مائل سبز پودوں کے حُسن کو اپنے دل میں اُتار رہی تھی کہ میرے بھائی نے مجھ سے کہا تھا۔

''تم رُوس جانا چاہتی ہو۔''

میرے اس بھائی کو میرے بے تکے مشغلوں اور آوا گونیوں کا بخوبی علم ہے۔

ایک لمحے کے لئے تو میں نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹائیں اور اپنے آپ سے پوچھا؟

''یہ میں نے کیا سنا؟ کہیں میری سماعت کو دھوکا ہوا ہے؟''

اب اس خالص پینڈو ماحول میں حسب معمول میں اپنے بھائی سے یہ تو سننے کی توقع کر سکتی تھی کہ

''بڑے وقت پر آئی ہو۔ چلو پھر تمہیں چھڑی شاہ رائے کا میلہ دکھلاؤں۔ آؤ بابا غلام شاہ کی خانقاہ پر چلتے ہیں۔ رسول نگر قریب ہی تو ہے یہاں سے۔''

دُور نزدیک کہیں کسی میلے ٹھیلے گائیکی کے کسی بڑے پروگرام کی بھنک اُن کے کانوں میں پڑ جاتی، وہ فون پر مجھے کہنا نہ بھولتے۔

''دو تین دنوں کے لئے چلی آؤ۔ بڑے پنڈ ہیر وارث کا ایک نامی گرامی گائیک آیا ہے۔ سنو گی تو بہت لطف اٹھاؤ گی۔ سلطان باہو کے ایک عاشق کو ڈیرے پر بلوایا ہے میں نے۔''

اب ایسے میں اُن کی زبان سے رُوس جانے کا سُننا کچھ ایسا ہی عجوبہ تھا کہ جیسے وہ مجھ سے کسی نائٹ کلب، کسی میوزک کنسرٹ، کسی اوپیرا، کسی بیلے ڈانس یا تھیٹر کے بارے میں کہیں

''تو چلتی ہو پھر۔''

اب اس قسم کی دعوت کے عملی مظاہرے جس کا میں نے ابھی سامنا کیا تھا نے مجھے حیرتوں کے دریا میں دھکیل دیا تھا۔

''اُو کچھ کہا تھا ابھی آپ نے؟''

''تو اتنی ڈور پھبوری (حواس باختہ) کیوں ہوگئی ہے؟ رُوس جانے کا کچھ تیرا شوق ہے تو بول۔ بندوبست کر دوں۔''

میری باچھیں چر کر یقیناً میرے کانوں کی لوؤں کو چھونے لگی تھیں اور داڑھوں تک دانت

نمایاں ہو گئے تھے۔

''واہ اپو نیکی کرتے ہیں اور پوچھتے بھی ہیں۔''

اس وقت مجھے اپنے بھائی کے ساتھ ساتھ خدا پر بھی بے طرح پیار آ رہا تھا۔

''واہ وے میرے سوہنیا ربا صدقے میں تیرے، تو میرے اوپر اتنا مہربان ہو سکتا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اُس کی بھی بلائیں لے لیں۔

تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں تھی کہ ہماری برادری کے ایک صاحب جن کی لمبی چوڑی زمینوں کے بنّے (حدیں) میرے بھائی کے مربعوں کے ساتھ سانجھے تھے۔ موصوف کے کراچی میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے اُس کے زمینی مسائل ٹھیکوں اور کچہریوں جیسے معاملات کی دیکھ بھال رضا کارانہ طور پر میرے بھائی کے سپرد تھی۔ ان کے دو بیٹے گذشتہ چند سالوں سے نہ صرف ماسکو میں کاروبار کرتے تھے بلکہ رُوسی لڑکیوں سے بیاہ بھی کئے بیٹھے تھے۔

''لاہور جا کر اپنا اٹیچی کیس تیار کر و اور پاسپورٹ مجھے بھیج دو۔''

واپسی سے قبل انہیں جپھی ڈالتے ہوئے میں نے حفظِ ما تقدّم کے طور پر کہنا ضروری سمجھا۔

''اپو آپ اُس پر یہ واضح کر دیں کہ میں اور میری ساتھی اُن کے بیٹوں پر کوئی بوجھ نہیں بنیں گے۔ ہم بڑی آپ پھدری اور من موجی قسم کی عورتیں ہیں۔ بس ہمیں تو کسی موزوں سے ہوٹل میں بندوبست اور اجنبی ملک میں تھوڑی سی راہنمائی چاہیئے ہے۔''

میرے بھائی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''چل چھوڑ تو ان سب باتوں کو۔ گردم کرنا ہے اور وہ بھی بھاڑے کا۔ اُس کے لڑکے ہفتوں میرے پاس آ کر رہتے ہیں۔ اُن کے لئے دن سوّنے کھانے پکانے اور پکوانے میں میری بہو ہلکان ہو جاتی ہے۔ ان کے زمینی مقدمے اور جھگڑے میں نبٹتا ہوں۔ اور وہ تمہیں چند دن اپنے پاس نہ رکھ سکیں گے۔''

میں تو نہال ہوگئی تھی۔ گوجرانوالہ سے لاہور تک کا سارا راستہ گنگناتے اور کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتے گزارا۔

پر ہفتہ بھر میں ہی میرے سارے خواب اڑارڑ ارڑم کر کے اُڑ پُڑ گئے۔ ان کے اُڑنے پُڑنے سے جو صدمہ مجھے ہوا وہ تو خیر اپنی جگہ پر میرا پھوپھی زاد بھائی تو جیسے سکتے میں آ گیا۔ وہ تو یاروں کا یار بادشاہ اور یاروں کے لئے جان قربان کرنے والے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھنے والا جی دار بندہ تھا۔

فون پر اُن کی آواز میں یاس کا عنصر تو تھا ہی، پر زمانے کے چلن میں بڑھتی ہوئی خود غرضی کا شکوہ زیادہ نمایاں تھا۔

''ارے اپو چھوڑو۔ اچھا ہوا وہ پرکھا گیا۔'' میں نے ایک لمبی آہ بھر کر اُن سے کہا تھا۔

پر گیلری سے نکل کر ٹیرس کے سر پر بکھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے میں کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

''دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے۔''

میری آواز میں، میرے لہجے میں، میرے دل میں مایوسی اور دُکھ کی چبھن تھی۔ میری زندگی کے کتنے ایسے پہلو ہیں جہاں میں قناعت اور شکر کے ہمراہ رہتی ہوں۔ محل نما خوبصورت گھروں کو دیکھ کر کبھی حسرت نہیں ہوئی۔ رتی سونا پلے نہیں کبھی اس کی چاہت میں بے حال نہیں ہوئی۔ چار جوڑے کپڑوں کے زیادہ بن جائیں تو سمیٹنے اور سنبھالنے مشکل۔ ایک ہی شوق اور اُس کے لئے بھی اُوپر والے کی تھڑ دلی۔ اب لڑائی جھگڑا اور گلا شکوہ تو واجب تھا۔

''یقیناً اس میں بھی کوئی اُس کی بہتری ہوگی۔''

اس خاص الخاص معاملے میں یہ کہنے پر تو نہ میرا دل راضی تھا اور نہ زبان۔ سو میں نے وہی کیا۔ جسے کرنے سے کہیں میرا تپتا اندر کچھ ٹھنڈا پڑ سکتا تھا۔

لڑائی۔

پھر جیسے پیار کی بوندا باندی شروع ہوگئی۔

اور ایک دن جب میں اپنے دفتر میں بیٹھی کام میں مصروف تھی۔ میں نے کام روک کر خود سے پوچھا؟ میں اس سال کہاں جاؤں؟ شام، مراکش، برما، یونان، اٹلی، اسپین یا روس؟ اور جیسے رُوس نے میرے دل پر فیصلہ صادر کر دیا۔

پر رُوس لوہے کا چنا تھا جو میرے دانتوں تلے آ گیا۔ انٹرنیٹ پر کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا یا پھر ہم اناڑی تھے۔ اور سفارت خانے کے ہاں ہوٹل میں قیام کے دنوں کی پوری بکنگ کئے بغیر ویزا دینے کا کوئی رواج ہی نہ تھا۔ خالہ زاد بھائی سے رابطہ کیا جس نے روس کے شہر وارنیش (voronezh) کی یونیورسٹی سے پڑھا تھا۔ اُس کے ہاں بھی آئیں بائیں شائیں تھی۔

مُلّا کی دوڑ مسیت تک۔ شعیب بن عزیز کو فون کھڑکا دیا کہ وہ صوبائی حکومت کی کلیدی پوسٹ کا بندہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پیارا، نفیس اور مددگار دوست ہے۔ شعیب رات کو فون پر تھے۔ ڈاکٹر پرویز خان ترین کے تعارف، فون نمبروں اور اس یقین دہانی کے ساتھ کہ وہ میرے گہرے دوست ہیں۔ ماسکو یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی، آج کل پشاور یونیورسٹی میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک مخلص، قابل اعتماد اور ہر طرح تمہارے لئے معاون ثابت ہوں گے۔

اب ڈاکٹر صاحب سے بات کراچی کے ڈاکٹر زاہد حسین تک چلی گئی دونوں ڈاکٹر صاحبان کی کوشش تھی کہ کسی طرح اس انّی (اندھی) شوقین بی بی کا انتظام کسی سستے ہوٹل میں ہو جائے۔ ماسکو سے ڈاکٹر پرویز کے دوست نے دو سو ڈالر پر کمرے کی اطلاع دی۔

''دو سو ڈالر۔''

میں نے جھرجھری سی لی۔ تھوڑی سی مُنمنائی۔

''ڈاکٹر صاحب مہنگا نہیں ہے؟''

مہنگا تو اُنہیں بھی لگ رہا تھا۔ ''دراصل یہ سیزن ہے۔'' وہ بولے۔ ''بہر حال ایک نمبر لکھو، رابطہ کرو اور مجھے اطلاع دو۔''

نمبر کراچی کا تھا۔ اور نام عثمان قذافی۔

فی الفور فون کھڑ کا دیا۔

اور جب پچیس منٹ بات کرنے کے بعد ریسیور کان سے ہٹایا تو بڑی لمبی آہ سینے سے نکلی تھی۔ میر والی بات ہوگئی تھی کہ جس کے کارن ہوئے بیمار اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں۔

یہ لونڈا میرے اپّو کے اُسی بیلی کا تیسرا لڑکا تھا جو کراچی میں بیٹھا ماسکو میں مقیم اپنے دونوں بھائیوں کے کاروبار کو چمکا رہا تھا۔

تھکی آنکھوں کو انگلیوں سے سکون کا مساج دیتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔

''اب کیا کروں۔ میرا اپّو کیا کہے گا؟'' سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی بات ہوگئی تھی۔ اُگلتی ہوں تب بھی کوڑھی اور نہ اُگلوں تب بھی۔

پر اگلا ڈیڑھ ہفتہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ اُسی دن نیلم احمد بشیر فون پر تھی۔

''شعیب بن عزیز نے اطلاع دی ہے کہ اسد مفتی ہالینڈ سے دلّی پہنچ گیا ہے اور تین دن بعد انڈیا جانا ہے۔ فوراً عابد حسن منٹو کے گھر پاسپورٹ پہنچاؤ۔''

چلو ایک نیا جلاّ گلاّ۔

پانچ دن پٹیالہ یونیورسٹی میں مقالے سننے اور بھاجیاں کھاتے گذرے۔

اور جب سفر کی گرد اُتری۔ میں نے خود سے کہا تھا۔

تو پھر یہ طے ہے کہ مجھے رُوس جانا ہے۔ اور ڈاکٹر پرویز اُن کے کراچی کے دوست ڈاکٹر زاہد حسین اور ماسکو میں مقیم شاہ نواز قصرانی اور ظہیر اللہ خان کو کسی وختے میں نہیں ڈالنا۔

صرف پانچ دن کے اندر میرے ہاتھوں میں رُوس کا ویزا ،ٹکٹ ، ماسکو اور پیٹرز برگ میں ہوٹلوں کے بکنگ کارڈز تھے۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہوا کہ میرے اصرار پر اُس نے پیٹرز برگ سے واپسی پر ماسکو میں مزید دنوں کے لئے ہوٹل کا انتظام ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا کہ میرا اصرار تھا

کہ ہفتہ دس دن میں ہم ماحول سے تھوڑے بہت واقف ہو چکے ہوں گے۔اس لئے کوئی سستا ہوٹل ڈھونڈنے میں ہمیں قطعی کوئی دُشواری نہیں ہوگی۔

میٹھے لب و لہجے والا لڑکا جس نے رشتے داری بھی میرے کاغذات سے کھوج کر لی تھی اس درجہ کاروباری ذہنیت کا مالک ہوگا، میرے سان وگمان میں بھی نہ تھا۔ ائیر پورٹ سے ہوٹل تک گاڑی کے لئے انکار۔ ناشتے کے لئے ہمارے اصرار پر آمادگی ہوئی تھی۔ ہوٹلوں کے بین الاقوامی ضابطوں کے جتنے بھی حوالے میں نے دیئے۔لڑکے نے سبھوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

اور جانے سے دو دن پیشتر میں نے سوچا۔ میں اپنے کزن سے بات تو کروں۔

ہوٹل کا نام بتا کر میں نے ائیر پورٹ سے کسی پبلک سواری کے ذریعے وہاں تک پہنچنے میں دُشواری یا آسانی کے امکانات کا پوچھا؟ وہ ابھی واسہڈ کی لوکیشن کے متعلق پوچھ رہا تھا کہ میں نے میٹرو یا بس کہاں سے مل سکتی ہے؟ جیسا احمقانہ سوال بھی کر دیا۔ پر اُس کے جواب نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ فون پر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

''اتنی ایڈونچرس بننے کی ضرورت نہیں۔ارے بابا ماسکو تو ایک دیو کی طرح ہے۔آپ کے لئے ممکن ہی نہیں کہ ٹیکسی کے بغیر ہوٹل تک پہنچیں۔اور ہاں آپ کا یہ ایجنٹ کس مرض کی دوا ہے؟''

اُس نے نمبر مجھ سے لے کر اُسے فون کھڑکا دیا۔ یقیناً تھوڑی سی اخلاقیات میں لپٹی کڑوی دوائی بھی پلائی ہوگی۔

آدھ گھنٹہ بعد مجھے دونوں کی جانب سے فون وصول ہوئے۔ایجنٹ کی آواز میں خفیف سی بے نیازی کے ساتھ ہدایت تھی۔ ویٹنگ لاؤنج میں ہی رہنا ہے۔ ہمارے آدمی آپ کو ڈھونڈ لیں گے۔ میرا بھائی فاروق بھی وہیں ہوگا۔ فاروق نام یاد رکھیئے گا۔

پر نصیر الدین ہمایوں کے لب و لہجے میں ایجنٹ کی بے حسی پر شدید احتجاج کی جھلک تھی۔

''کمال ہے۔لوگوں کو راہ چلتے چلتے بغیر ہینگ پھٹکری لگے مفت کی نیکیاں کمانے کا بھی شعور نہیں۔ پی آئی اے کے جس جہاز نے آپ کو لے کر جانا ہے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اُس کی واپسی ہوتی ہے۔مسافروں اور اُن کے سامان کی لوڈنگ اور کلیرنس کے لئے اُن کے کسی ذمہ دار بندے کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ٹیک آف کے بعد واپس جاتے ہوئے اُن کے لئے آپ کو ہوٹل ڈراپ کرنے کا کوئی مسئلہ ہے کیا؟اب کوئی بتائے کہ ہم بتلائیں کیا؟''

کراچی ائیر پورٹ پر کافی تماشا ہوا۔چیکنگ کرتے عملے نے ایف آئی اے کی طرف دھکیلا کہ ذرا اُدھر تو جائیں۔

قطار میں بیٹھی چار پانچ لڑکیاں کِھل کِھل کر کے ہنسیں۔

''کیا لینے جارہی ہیں۔وہاں تو کوئی بھی نہیں جاتا۔''

دل تو کیا ایک ایک جھانپڑ دوں۔بے ہودہ لڑکیاں۔بھلا کوئی تک تھی ایسے فضول اور احمقانہ سوالوں کی۔

نیلے یونیفارم میں ملبوس ایک نے آگے بڑھ کر ڈیوٹی پر کھڑے سارجنٹ کے پاس دھکیل دیا۔اُس کے حضور پیشی ہوئی۔اُس نے بغور پاسپورٹ پر لگے ویزا کو دیکھا ہمیں گھورا پھر پوچھا۔

''کس کے پاس جارہی ہیں؟ کیوں جارہی ہیں؟''

کیوں پر ظاہر ہے جی چاہتا تھا کہ پوچھوں۔''کھوپڑے میں عقل نہیں کیوں جاتے ہیں کہیں؟''

کوئی پندرہ منٹ تھولے جیسے سر کو پاسپورٹ کے ورقوں میں گھسیڑنے کے بعد خاصی بے اعتنائی سے آنکھوں کو جانے کے سگنل کے طور پر استعمال کیا۔

ویٹنگ لاؤنج میں کینیڈا میں بزنس کرنے والی کراچی کی ایک خاتون نے جب تیسری بار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہم انتہائی بیوقوف اور گاؤدی عورتیں ہیں۔اُلٹی گنگا بہانے کی

ضرورت کیا تھی۔ پہلے دوبئی اور پھر ماسکو سفر دوگنا۔

میرا جی اُسے اٹھا کر شیشوں کی دیوار سے باہر پھینکنے کو چاہ رہا تھا۔ بکواس کئے چلی جا رہی تھی۔ اسلام آباد سے پرواز کرنے والی ازبک ایئر لائن کا ماسکو کے لئے شارٹ کٹ روٹ ہے۔ اُسے اختیار کرنا تھا۔

ہم بھی اناڑی لوگ ہیں۔ ایجنٹ نے جدھر دھکیل دیا چلے آئے۔ اب لمبا ہے اُلٹا ہے۔ سیدھا ہے۔ جو کچھ بھی ہے۔ گلے پڑا یہ ڈھول بجانا ہے اور خوشی سے بجانا ہے آپ کسی قسم کا ذرا تردد نہ کریں۔ کمال ہے شرمندہ کرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بھاڑ میں جاؤ۔ میں نے بھی رُخ پھیر لیا تھا۔

''دوبئی چلو دوبئی۔'' لاہوریوں کا مرغوب نعرہ لاہور کی عمارتوں پر وال چاکنگ کا یہ دلچسپ فقرہ پی آئی اے کے جہاز میں شد و مدّ سے دیکھا جا سکتا تھا کہ لگتا تھا آدھا پاکستان دوبئی کے سفر پر گامزن ہے۔ بندے پر بندے چڑھا ہوا تھا۔ کھڑے ہو کر میں نے اپنی سمت دیکھا۔ بس یوں محسوس ہوا جیسے میں انسانوں کے سمندر میں ڈولتی پھر رہی ہوں۔

فضائی میزبان خواتین الف سے ے تک سب گوارہ اور گذارہ تھیں۔ مرد بھی ایسے ہی جھانپڑ سے تھے۔ پتہ نہیں پی آئی اے کے ہاں حُسنِ مرد وزن کا قحط کیوں پڑ گیا ہے؟ یا سلیکشن بورڈ حُسن بلائینڈ ہو گیا ہے۔

ٹنل کے بیضوی شیشوں میں سے دوبئی کے حُسن وجوانی کو دیکھنے کی کوشش یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات تھی۔ فلک بوس عمارتوں کے لہراتے اُونچے شملوں کا بس ایک آدھ منظر ہی نظر آ رہا تھا کہ ہر کھڑکی کے ساتھ کوئی نہ کوئی بندہ ٹکا ہوا تھا۔

یہاں چھانٹی ہو رہی تھی۔ ماسکو کے لئے تو ہم دونوں ہی نکلیں۔ گیٹ نمبر آٹھ سے داخلہ اور سکیورٹی کلیرنس کروائیں۔ زور سکیورٹی کلیرنس پر تھا۔

مار دھاڑ ہوئی پڑی تھی۔

گیٹ نمبر آٹھ کو ماروں گولی اور کلیرنس جائے بھاڑ میں۔ سب سے پہلے واش روم۔ پر معلوم ہوا کہ میری مرضی کی کیا وقعت اور میری اوقات کیا؟ کلیرنس ہوئی۔ گیٹ نمبر آٹھ سے داخلہ ہوا اور تب کہیں جا کر میں نے مطلوبہ جگہ کھوج کی۔ وضو کیا اور خوبصورت مسجد میں سجدہ دیا۔

بڑا شاندار ائیر پورٹ تھا۔ نخلستان اور صحرائی تصور ساتھ ساتھ ہم رکاب تھے۔ کھجور کے فائبر گلاس کے درخت اور فرش پر بچھے قالین جن کی بُنت کاری صحرا کے تصور کو اُجاگر کرتی تھی۔ قالین ترچھے بچھے ہوئے تھے۔ درمیان میں تھوڑا تھوڑا راستہ ننگا تھا۔ ایک خلقت اُمنڈی پڑی تھی۔ ہر مُلک، ہر قوم کا بندہ یہاں دیکھا جاسکتا تھا۔

مہرالنساء یقیناً ونڈو شاپنگ میں مصروف ہوگی۔ میں یہاں بیٹھی شیشے کی دیواروں سے پرے بے کراں آسمانی اور زمینی سلسلوں کو دیکھتی تھی۔

چائے کی طلب بے حال کر رہی تھی۔ یہ میرا ٹی ٹائم تھا۔ چائے کافی مل سکتی تھی۔ پر ڈالر کی بھنائی کے لئے کتنی دُور جانا پڑے۔ اس کا کچھ علم نہیں تھا۔

انفرمیشن بورڈ پر فلائٹ ٹائم آ چکا تھا۔ دوبئی کے لئے جہاز جتنا پیک تھا۔ ماسکو کے لئے اتنا ہی کھلا ڈُلا تھا۔ پر میرے ساتھ بیٹھنے والی رُوسی خاتون بڑی ہی چنڈال تھی۔ چھ فٹی چار نٹ کھٹ شیطان لڑکوں کی ماں یا ماسی، اللہ جانے جسے یہ نہیں سمجھ آتی تھی کہ وہ عقبی نشستوں پر جا کر دوستوں کے ساتھ تاش کھیلے یا لڑکوں کو سنبھالے۔ مینڈک کی طرح پھدکتی غڑاپ سے کبھی میرے ساتھ آ کر بیٹھ جاتی۔ کبھی پھڑ کتے ہوئے اُٹھ جاتی۔

میں تو اس پر بھی حیرت زدہ تھی کہ یہ چار لونڈے اُسی کے پیدا کردہ ہیں۔

چلو اس کی بھی خیر صلا کہ یہ سب اُس کے ذاتی فعل تھے۔ پر اُس کا رویّہ اپنی ہمسائی کے ساتھ بڑا ہی روکھا اور کسی حد تک توہین آمیز سا تھا۔ میں نے تو پینگیں بڑھانے کی اپنی سی کوششیں کی۔ لبوں پر بغیر کسی معقول وجہ کے مسکراہٹیں بھی بکھیریں۔ پر رُوسی ختنی نے ذرا لفٹ نہ کروائی۔

شکر تھا کھانے کی ٹرالیوں کی کھڑ کھڑاہٹ شروع ہوئی۔ چلو کچھ کھانے پینے میں دھیان بٹے گا کچھ وقت کٹی ہوگی۔

ہماری فضائی میز بانوں کی حالت یہاں بھی پتلی تھی۔ پر اگر صورت کی نہیں سیرت کی ضرورت ہے جیسے پُرانے خاندانی مدرسۂ فکر کا خیال کروں تو واقعی وہ بے مثال تھیں۔ نوّے کی دہائی میں بار بار رُوس آنے والی ائیر ہوسٹس ثمینہ نے مجھے بتایا کہ سرد جنگ کے اختتام پر رُوس میں غربت کا وہ حال تھا کہ اُترنے سے قبل مسافر ہم سے بچی کچھی ڈبل روٹیاں چاول انڈے سبھی سمیٹ کر لے جاتے تھے۔ خدا گواہ ہے میں تو خوف سے لرز لرز جاتی تھی اور اُن کے تھیلے وہیلے سب بھر دیا کرتی تھی۔ جہاز کے آخری حصے میں بہت سی سیٹیں خالی تھیں۔ وہاں جا کر لیٹنے کا مشورہ بھی ثمینہ نے ہی دیا تھا۔

اور جب میں سونے کے لئے تکیے سیٹ کر رہی تھی میں نے اُسے اور اُس نے مجھے دیکھا تھا۔ پُرکشش خدوخال والا نوجوان جو اپنی نشست سے اُٹھ کر میرے پاس کچھ جاننے کی غرض وغایت سے آیا تھا۔ یہ انجینئر منصور تھا۔ پیٹر زبرگ کے قریب نوگورڈ (Nogorod) یونیورسٹی سے انجینئرنگ کے بعد اس وقت ماسکو میں اپنے فسٹ کزن کے کارخانے میں ملازم تھا۔ بال بیرنگ کا کارخانہ اُس کے کزن نے کسی رُوسی کی پارٹنرشپ کے ساتھ قائم کیا تھا۔ وہ ابھی وہاں کام کرتا تھا۔ پر مستقبل کے لئے ذاتی کاروبار کی جدّ وجہد میں تھا۔

بے تکلف اور کھلا ڈُلا سا لڑکا۔ کوئی آدھ پون گھنٹہ باتوں کے بعد میں لیٹ گئی تھی۔ لیکن مجھ سے لیٹا نہ گیا۔ منصور کی ذاتیات کے بارے میں میرے سوالوں کے جو جواب مجھے ملے تھے۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ اُس کی بیوی کا صحافتی تجربہ انگریزی اور اُردو سے خاصی شناسائی میرے لئے کتنی سودمند ہوسکتی ہے؟

اپنی خودداری اور انا کو ایک طرف رکھتے ہوئے میں کھڑی ہوگئی۔ اُس کے پاس گئی اور ملتجی لہجے جس میں محبت کا رچاؤ تھا بولی۔

''بلا وجہ میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گی۔ پر تمہارا اور تمہاری بیوی کا تعاون مجھے چاہیے۔''

''میرے لئے خوشی کی بات ہو گی اگر میں اور میری بیوی آپ کے کام آ سکیں۔''

لڑکے کے جملے کسی دید یا مروّت کے زیر نہیں تھے۔ اُن میں خلوص کی جھلک تھی۔

''کل رات کا کھانا میرے ہاں کھائیے گا۔ میں خود آپ کو ہوٹل سے پک کروں گا۔'' اپنا رابطہ نمبر اُس نے میری کاپی پر لکھتے ہوئے کہا۔

میرے ہوٹل ریزرویشن کاغذات سے اُس نے کچھ چیزیں نوٹ کیں۔ اور ہوٹل کیسے جانا ہے؟ بندوبست ہے یا نہیں۔ سب کے بارے میں جانا۔ روز مرّہ بول چال کے چند ضروری جملے بھی لکھ دیئے۔ شہر کے بارے میں مختصر سی بریفنگ بھی دی۔

جیسے قدرت کوئی فرشتہ ٹکرا دے۔ منصور کا ملنا بھی مجھے ایسے ہی لگا تھا۔ بس تو لیٹی۔ پیٹ کی سیری اور صُبح سویرے سے بھاگ دوڑ کی مشقت نے پپوٹوں کو بند کرنے میں پل نہیں لگایا تھا۔ گھنٹوں سوئی تھی۔ لینڈنگ سے آدھ گھنٹہ پہلے ثمینہ نے اُٹھا دیا۔ اللہ کس مزے سے سفر کٹ گیا تھا۔

ہم ماسکو اُترنے والے تھے۔ میں کھڑکی کے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ تجسّس شوق اور حیرت کی دُنیا آنکھوں میں سموئے۔

بادلوں کی بھی ایک اپنی دُنیا ہے۔ کتنے رنگ ہیں ان کے۔ نہ انہیں چین نہ قرار ہمہ وقت یوں بھاگے پھرتے ہیں جیسے پولیس تعاقب میں ہے۔

گہرے اور ہلکے سبز رنگ کا ایک دلکش امتزاج دھرتی پر پھیلا نظر آیا تھا۔ شہر کسی خوبصورت منظر کی مانند پل بھر کے لئے اپنی چھب کا لشکارا مارتا اور غائب ہو جاتا۔

جہاز اور نیچے ہوا۔ ثمینہ اُس وقت میرے پاس سے گذر رہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

''کریملن دیکھو۔ کریملن۔''

''ہائے میرے اللہ کریملن۔'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر شیشے سے چپکا دیں۔ سرسبز مخملین بلند قطعے پر سُرخ دیواروں کی ایک ٹیڑھی میڑھی تکون میں جیسے کسی نے یہاں وہاں سنہرے چنبیلی رنگے سُرخ سبز موتیوں کی ڈھیریاں رکھ دی ہوں۔ جہاز ڈولتا، چکر کاٹتا اور نیچے ہوا تو سنہرے گنبدوں اور سُرخ و سبز زردئی رنگوں کی عمارتیں اُن البیلی شہزادیوں کی طرح نظر آئیں جو کسی سُرخ جناتی دیو کی قید میں ہوں۔

پانی کا ایک بڑا سا نالہ شہر کے بیچوں بیچ چکریاں کھاتا پھرتا تھا۔ دریائے ماسکو۔ میرا سانس سینے میں کہیں رُکا ہوا تھا۔ زمینی اور فضائی فاصلوں میں فرق کم ہونے کے ساتھ شہر پستہ قامت پہاڑیوں پر پھیلا نظر آیا تھا۔ بڑے بڑے سبز ٹکڑوں پر بکھرے ہزاروں گھر جیسے رنگارنگ پھولوں کے وسیع و عریض تختے ہوں۔ بلند و بالا عمارتیں بتدریج ڈبکیاں مارتے جہاز سے گلے ملنے کے لئے بے تاب لگتی تھیں۔ اسفالٹ کی کشادہ سڑکوں پر بھاگتی گاڑیاں، پُل، شہر کا پھیلاؤ اور وسعت کس قدر خوبصورت تھے۔

شری متوا (Sheremetyevo) ایئر پورٹ پر سٹیل اور شیشوں کے خودکار دروازوں سے پاسپورٹ کنٹرول عمارت کی طرف جاتے ہوئے ''روسی آہنی لوگ ہیں'' کے مظاہر دیکھنے کو ملے۔ وسیع و عریض ہال کے اٹھارہ چینلوں پر مشتمل شیشے کے کیبنوں میں بیٹھی گوری چٹی لڑکیاں اور عورتیں کھٹا کھٹ لائنوں میں کھڑے لوگوں کو بھگتانے میں جتی ہوئی تھیں۔ جاپانی، ویت نامی، کورین، رُوسی وغیرہ کھٹا کھٹ فارغ ہو رہے تھے۔

ہمارے پاسپورٹ ان کے ہاتھوں میں تھے۔ چہرے ہمیں دیکھتے تھے۔ ظلِ الٰہی کے ہاتھوں کی بجتی تالی کی طرح مخروطی ہاتھوں نے ایک جانب ہو جانے کا اشارہ کیا۔ سامنے کمرے میں سگنل گیا۔ پل جھپکتے میں یونیفارم میں کسے کسائے داڑھی مونچھوں سے بے نیاز دو نوجوان آئے، پاسپورٹ اُٹھائے اور ہمارے پاس آ گئے۔

لیجئے تفتیش کا آغاز ہو گیا۔ بے چارے چیچن مجاہد خواتین کے خودکش حملوں کے زخم خوردہ،

اب ہمیں مائیکروسکوپ کی عینکیں لگا لگا کر کیوں نہ دیکھتے۔ ہم مسلمان تھیں، پاکستانی تھیں۔ جسے دنیا نے دہشت گردی کے حوالے سے نمبر ون مقام دے رکھا ہے۔

ہوٹل کے بکنگ کارڈز سب اندر چلے گئے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد ہمیں بھی بلایا گیا۔

میز کے گرد بیٹھے چار مردوں نے گہری نظروں سے یوں ٹٹولا جیسے کہیں ڈاکہ یا کوئی قتل کر کے آئے ہوں۔ انگریزی سے تو کورے تھے۔

مترجم بھی یونہی بونگی سی بولتا تھا۔

''کتنے دن رہنا ہے؟ آنے کا خاص مقصد؟ پیٹرزبرگ سے واپسی پر ہوٹل کی بکنگ کیوں نہیں ہے؟''

بس مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ سو میں نے فوراً کہا۔

''جس میں اب ٹھہریں گے اُسی میں واپس آ جائیں گے۔ یہ کون سا مسئلہ ہے؟''

پاسپورٹوں پر سر پھر جھک گئے تھے۔ ہمیں باہر جانے کے لئے اشارہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ طلبی ہوئی۔ سوال جواب کا نیا سلسلہ۔ کیا کام کرتی ہیں؟ پل بھر کے لئے خیال آیا کوئی شُرلی چھوڑوں۔ بھڑک اُٹھیں، پھر ڈر گئی۔ ہائے ان کا کیا؟ اُلٹی کھوپڑی، ڈی پورٹ ہی نہ کر دیں۔

اب چپ کھڑے ہیں۔ بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ کتنی دیر گذر گئی۔ مجھے بے چینی کہ ایسا نہ ہو فاروق ہمیں چھوڑ جائے۔ بارے خدا پاسپورٹ ہاتھوں میں تھمائے گئے۔ سوچا ہوگا۔ ان بوڑھی عورتوں نے کون سی توپ چلا لینی ہے۔ جانے دو۔

سامان کے ساتھ باہر آئے۔ خنکی سے لبریز ہواؤں نے وجود میں کپکپی ضرور دوڑائی پر جسم کی ساری حسیات اس وقت اس اجنبی زمین و آسمان کے طواف میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تشکّر سے بھرا ہوا عبودیت کا اظہار رُوم رُوم سے ادا ہو رہا تھا۔

فاروق کو دیکھنا اور خود کو اُسے دکھانا اُس وقت سب سے ضروری تھا۔ ویٹنگ لاؤنج میں آ گئے۔ ویٹنگ لاؤنج بھی فنی جمال سے زیادہ آہنی جمال کی جھلک دیتا تھا۔ سٹیل کلر اور سُرخی مائل

اورنج پنج کے رنگوں کی آمیزش سے سجا جس کی چھت ساری کی ساری سٹیل پر کھڑی تھی۔

ابھی وینٹنگ لاؤنج کا جائزہ لیا جا رہا تھا جب ایک میانی قامت پر کھلتی گندمی رنگت والا لڑکا مسکراتے ہونٹوں سے مخاطب ہوا۔

''آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ فلائٹ کے ٹیک آف کرتے ہی میں آجاؤں گا، یہیں رہیے گا۔''

مجھے اُس کا یہ جُملہ ٹی وی کے کسی اینکر پرسن کی طرح لگا جو کمرشل بریک سے پہلے کہتے ہیں۔ کہیں جائیے گا نہیں۔''

کرنسی بدلوائی۔ خودکار طریقے سے سوڈالر اندر گیا اور 2345 روبل باہر آگئے۔ چھوٹا سا بینک حُسن کی کرنوں سے جگمگ جگمگ کرتا تھا۔ پر کہیں مسکراہٹوں کے پھول نہیں تھے۔ اندر کا ماحول ہمارے ہاں کے دفتروں اور بینکوں میں کام کرنے والی عورتوں اور لڑکیوں کے ہنسی مذاق و چہلیں سٹائل کا نہیں تھا۔ سنجیدگی اور سناٹا تھا وہاں۔

نوٹ ہاتھ میں پکڑ کر پہلا کام اُن سے شناسائی کا تھا۔ اُن کی صُورتیں اُن پر بنی شبیہیں، اُن کے رنگ، سبھوں کو آنکھوں اور دماغ میں بسانے کی ضرورت تھی۔ تو ہزار روبل کے نوٹ کا رنگ نیلگوں سبزی مائل ہے۔ پانچ سو روبل ہلکا بنفشی، سو خاکی مائل سبز اور پچاس نیلے رنگ کا ہے۔ دو تین بار یہ سبق ہم دونوں نے پڑھا۔ استنبول میں ٹھگ (دھوکا) لگوا بیٹھی تھی۔

پیسوں کے معاملے میں پوری بنیا ہوں۔ نہ کبھی لُٹی اور نہ کبھی دھوکا کھایا۔ استنبول والا دل پر لگا داغ دُھلنے اور صاف ہونے میں نہ آتا تھا۔ نگوڑا سو ڈالر جو ابھی تک کلیجے پر سل بٹہ بنا بیٹھا تھا۔ جو ہوتا تو یہ خرید لیتی۔ وہ خرید لیتی۔ ہائے کوئی مارا موٹا ٹیلیفون کے نیچے رکھنے والا قالین کا ٹوٹا ہی لے آتی۔ سوڈالر کا وہ نوٹ نہ ہوا قارون کا خزانہ ہو گیا جس سے میں نے ساری دُنیا خرید لینی تھی۔ سچی بات ہے جان چھٹنی مشکل ہو گئی تھی۔

سارے نوٹ مہرالنساء کے حوالے کرتے ہوئے اکتیس (31) مئی کی تاریخ کے ساتھ

مشترکہ کھاتہ کُھل گیا تھا۔

بک شاپ پر کناروں تک کتابوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ پر مجال ہے جو انگریزی میں کوئی ایک سطر والی کتاب بھی ہو۔ کوئی نقشہ، کوئی گائیڈ بک، کوئی کتابچہ، کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے انگریزی سے جانی دشمنی ہو۔ ویسے حق سچ کی بات تو یہی ہے کہ خاندانی قوموں کا وطیرہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

ہم کیا ہیں آدھے تیتر آدھے بٹیر۔ منہ کے زوایے بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بولتے بولتے ماں بولی سے روٹھے بیٹھے ہیں۔ ایسا مالیخولیا ہوا پڑا ہے پوری قوم کو کہ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ ایلیٹ کلاس کا تو مانو دن رات کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ پروہ جو اُردو بھی ڈھنگ سے بول نہیں پاتے۔ ریڑھیوں پر سبزی، ترکاری اور پھل فروٹ بیچتے ہیں۔ اُن کی بھی انگریزی کے لئے رالیں ٹپکتی ہیں۔ اپنے بچوں کو گٹ مٹ گٹ مٹ بُلوانے کی خواہش میں انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھانے کے لئے مرے جاتے ہیں۔

کافی بار کا تنقیدی جائزہ لیا۔ کافی تو ایک بار اسکندریہ میں پی تھی بس اس کے بعد زندگی بھر کے لئے تائب ہو گئے تھے کہ اب یہ جھوٹی شو آف ہرگز نہیں کرنی۔ بھلے بلی لنڈوری ہی اچھی۔

اب گورمے کی ایک دکان میں 390 روبل کا ایک برگر شین سلاد اور چیری کی گارنش کے ساتھ نظر آیا۔ تین چار منٹ تک ہم دونوں میں بحث مباحثہ ہوا۔ مہرالنساء کو بھوک نہیں تھی۔ اب لمحۂ فکریہ تو میرے لئے تھا کہ وہ اگر کھانا نہیں چاہتی تو مجھے ہی بابڑا (سخت بھوک) پڑا ہوا ہے۔

میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ہمسائی کا چہرہ اگر سُرخ ہے تو اپنا چپیڑوں سے سُرخ کر لیں۔ بس قدرے ڈھیلی پڑی تو صرف یہ سوچتے ہوئے کہ بیچارہ پیٹ جو کئی سالوں سے حمل کے آٹھویں مہینے جیسی کیفیت پر ٹکا ہوا ہے۔ شاید اس قسم کے چھوٹے موٹے فاقوں اور اس سیاحت کی بھاگ دوڑ سے پانچویں چھٹے کی حالت پر آ جائے تو اللہ مولا کا احسان عظیم ہوگا۔

''دفع کرو جی۔ برگر ہرگز نہیں خریدنا۔''

اور جب فاروق کی گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی، مجھے دھوپ ائیر پورٹ کی عمارتوں کے بالائی حصوں پر تھکی ماندی بیٹھی نظر آئی تھی۔ سڑکیں کشادہ اور خوبصورت تھیں۔ اطراف میں سبز قطعے اور صنوبر و برچ کے گھنے جنگل تھے۔ رُوس کا خاص درخت برچ۔ پر اس آسمان سے باتیں کرتے درخت کو دیکھتے ہی مجھے اِس سے شناسائی کا احساس ہوا تھا اور میری یادداشتوں میں وادی نلتر در آئی تھی۔

دریائے ماسکو۔ رِنگ روڈ۔ یہ گرم پانی کا پلانٹ، پورے ماسکو کو پانی کی سپلائی یہاں سے ہوتی ہے۔ فاروق کی کمنٹری جاری تھی۔

لیکن عجیب روکھا پھیکا سا شہر تھا۔

فلک بوس عمارتوں کے لمبے چوڑے سلسلے خودرو پودوں کی طرح اُگے ہوئے تھے اور نہایت کثرت سے تھے۔ یہ کمیونزم دور کی یادگاریں ہیں۔ تو اُس دور نے کمال کا کام کیا۔

اب ہوٹل تو اُسے نہیں مل رہا تھا۔ جس کا ماسکو اب اصلی گھر ہے کہ بیوی رُوسی ہے اور لڑکے کا باپ بھی ہے۔ ہمارا تو وہ حال ہونا تھا کہ جس کے لئے کہتے ہیں سر منڈواتے ہی اولے پڑے۔ دوڈھائی ہزار روبل سیدھے سیدھے ٹیکسی کے کھتے پڑنے تھے۔

چوتھے ٹرائل پر سامان اُتار لیا گیا۔

''دراصل ہوٹلوں کی بکنگ ہماری ایجنسی کے رُوسی ملازم کرتے ہیں اور وہ ان کی لوکیشن کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔''

ہمارے پاس تو اس وقت کلمہ شکر ہی تھا اور وہ ہم نے اپنے دل میں ادا کیا۔

ہوٹل کی انتظار گاہ بڑی بور قسم کی تھی۔ ایک ہوٹل کی انتظار گاہ کیا، اندر باہر کا سارا ماحول بوریت، بے رونقی اور ویرانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ سامان رکھتے ہی باہر نکلیں گے۔ یہاں تو سوال ہی نہیں تھا۔ ایک لڑکا کھڑا ایج ٹھونکتا اور ٹی وی دیکھتا تھا۔ لمبے سے بینچ پر بیٹھی ہم فاروق کی راہ دیکھتی تھیں جو کارروائی کے لئے اندر تھا۔

لڑکے کا انہماک دونوں کاموں میں حد درجہ شدید قسم کا تھا۔ شاید ہم بے چاری پردیسی عورتیں یہ چاہتی تھیں کہ کوئی ہمیں توجہ دے۔ ہم سے پوچھے کہ اے بوڑھی عورتوں تم کس دیس سے یوں مارو مار کرتی وارد ہوئی ہو۔ پر وہاں تو ایک بے نیاز سا لڑکا کھڑا بیج ٹھونکتا اور ٹی وی دیکھتا تھا۔ تو کیا یہ وہی بیج ہیں جو میں نے ترکی اور مصر میں لوگوں کو ٹھونگتے دیکھا تھا۔

اب سچی بات ہے مجھے حقیقت جاننے کے اُچھل پھیڑے (بے چینی) سے لگ گئے تھے۔ مہرالنساء نے کہا بھی

''چپکی بیٹھو۔''

نہیں جی میں اُس کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں حیرت کا سمندر لئے اُس نے مجھے دیکھا۔ میں نے باڈی لینگوئج سے اُسے سمجھایا کہ جو تم ٹھونگ رہے ہو مجھے بھی تھوڑے سے دو۔ اُس نے میری ہتھیلی پر سیاہ بیج رکھ دیئے۔ نمک کے استر میں لپٹے ہوئے۔ بیج تو وہی تھے کدو کے۔ پر کھانے کے انداز میں قوموں کی تہذیب اور چلن بولتا تھا۔

مصر میں لُکسر کے ریلوے اسٹیشن پر میں نے ایک مصری کو انہیں کھاتے دیکھا۔ چھلکوں کا ڈھیر اُس نے اپنے اردگرد پھیلا رکھا تھا۔ استنبول میں ایک چھلکا زمین پر بکھرے نہیں دیکھا اور یہی حال یہاں تھا۔ لڑکا چھلکے دائیں ہاتھ میں اکٹھے کئے جاتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ملحقہ کمرے میں جو یقیناً آفس تھا جھانکا۔ چھوٹے سے کمرے میں چار نئے چوبی کاؤنٹرز کے عقب میں چار عورتیں تھیں۔ تین کام میں مصروف اور چوتھی فاروق سے بات کرتی تھی۔ کمرے میں گفتگو کے ہلکے پھلکے شور کے باوجود اُن اُدھیڑ عمر عورتوں کا اپنے کام میں انہماک اور سنجیدگی مجھے کچھ بتا رہی تھی۔

ہوٹل کے ریسیپشن سے گائیڈ بک نقشے اور میٹرو کا نقشہ ہمارے حوالے کرتے ہوئے فاروق نے مختصر سے وقت میں مجھے تھوڑا بہت سمجھا دیا۔ جب اُس نے رخصت چاہی اور جانے کے لئے کھڑا ہوا۔

میں نے پیٹرز برگ کے لئے ٹکٹوں کا اُسے کہا۔

اپنے بھائی کی طرح اُس نے یہ نہیں پُوچھا کہ آخر آپ کو پیٹرز برگ کے لئے اتنی بے تابی وشتابی کیوں ہے؟ اس کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جانتا ہے ہر فکری وانقلابی تحریک وہاں سے اُٹھی ہے۔ اور پیٹرز برگ تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہے۔ اور یہ کہ میں ایک لکھاری ہوں۔

باب

2

میزبانوں کے ہاتھوں نرالا استقبال

نیگلینیا کے پانیوں میں ہماری کہانیاں • ریڈ سکوائیر

لینن کا مقبرہ • انیتا کور کا ملنا

Отделны Приёмства Хизаина.

Наш Раскази В Нигаленском Води.

Красни Площадь, Музели Аенина,

И Встреча Анита Корка.

سویرے ہی پھڈا پڑ گیا تھا۔ ہم ڈائننگ رُوم میں کیا داخل ہوئے کہ لگا جیسے پاؤں انجانے میں سُولوں کے چھاپوں (کانٹے دار ٹہنیاں) پر جا پڑے ہیں۔ میں تو ابھی اس کے دو سٹار اور تین سٹار ہونے کے اندازوں میں اُلجھی ہوئی تھی کہ دو موٹی تازی عورتیں کولہے سینے مٹکاتیں دگڑ دگڑ چلتیں اور تیز تیز بولتیں ہم پر یوں جھپٹیں جیسے چیل گوشت پر۔

''220 روبل۔'' ایک کی انگشت شہادت لہرائی۔ یعنی صبح کا ناشتہ فی کس 220 روبل میں۔

میں نے اس انوکھی اُفتاد پر بھنویں پلکوں پر اُتاریں۔ سر نفی میں ہلایا اور کہا۔

''ارے علیحدہ سے کیوں دیں۔ بریک فاسٹ ہمارے اس پیکیج میں شامل ہے۔''

پروہ کسی کی سُنیں تب نہ۔ ایک کمبخت زبان اُوپر سے اُن کا جارحانہ انداز۔

چھوٹے سے کوریڈور میں اُن کی آنیاں جانیاں جاری تھیں۔ ساتھ ساتھ بولنا بھی۔

سویرے سویرے ہی دہلا کرر کھ دیا تھا۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کریں۔

''باندریاں جھیاں'' (بندریوں جیسی) میں نے خود سے کہتے ہوئے بے چارے پریشان دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''کرتی رہو بکواس۔'' تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق اٹھارویں صدی کے انگریزی ناولوں کی سرائے جیسے ماحول میں سانس لیتے ہوئے میں نے بریک فاسٹ بوفے کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''گولی مارو انہیں۔ ناشتہ کرو ڈھنگ سواد سے۔'' مہرالنساء سے میں نے کہا جو بھونچکی سی کھڑی تھی۔

پلیٹ اُٹھا کر میں نے سائڈ ٹیبل پر دھری چیزوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

چقندر جیسے گالوں والی پینتیس (35) چالیس (40) کے ہیر پھیر میں ایک عورت عین ہمارے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اللہ جانے اب ہمارے نوالے گننے تھے۔ یا ویسے ہی دو گھڑی کے لئے نیکی لینی مطلوب تھی۔

یہ بڑا عجیب سا تجربہ تھا۔ رات بھر کے بھوکے تھے۔ خیال تھا ڈٹ کر ناشتہ ہوگا۔ پر جیسے مزے کے منہ میں روڑ آ گئے تھے۔

میری تو ہنسی چھوٹ گئی جب وہ سامنے بیٹھی بھتنی کہیں اِدھر اُدھر ہوئی۔ مہرالنساء نے فریش جوس کے تین گلاس چڑھائے اور واپس میز پر آکر اپنے اِس معرکے سے مطلع کرتے ہوئے مجھے بھی اُکسایا۔

''اری اللہ کی بندی پیٹ تو اپنا ہے۔ یہ اتنا خالص جوس کہیں اور سیاپا نہ ڈال دے۔''

کمرے میں بستر پر بکھرے میٹرو کے نقشے اور گائیڈ بکیں سمیٹیں۔ ماسکو کی پہلی رات ہی

بڑی بھاگوان تھی۔ بستر پر ابھی لیٹے تھے کہ دستک ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ریسپشن پر ہمارے لئے کال ہے۔ ''ارے'' حیرت سے سوچا۔ کون اتنا مہربان؟ کسے اتنا خیال؟ گھر سے۔ سوچ آئی۔ ساتھ ہی طنزیہ کاٹ بھی۔ لو اتنے ہیجلے (خیال کرنے والے)۔ یہ منصور تھا۔ خوشبو جیسے لطیف احساس سے مہکاتا۔ اجنبی ماحول میں اُمید بھرا پیغام دیتا اور خوش آمدید جیسے لفظوں سے نہال کرتا۔

انتونینا آپ لوگوں کے بارے میں جان کر بہت خوش ہوئی ہے۔ میرا اور میری بیوی کا ہر قسم کا تعاون آپ کے لئے حاضر ہوگا۔ کل شام میں سات بجے آپ کو لینے آؤں گا۔

انسانی روّیوں کا تضاد کیسے سامنے آیا تھا؟ قدرت مُسَبِّبُ الاسباب ہوتی ہے۔

کھڑکی کے سفید پردوں کو ہٹایا۔ دائیں بائیں اور سامنے فلک بوس عمارتوں کے تاحدِ نظر پھیلے سلسلوں کو دیکھتے ہوئے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں عمارتوں کو اوڑھے کھڑی ہوں۔ گیارہ ہزار سکوائر میٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے شہر کی ہیبت نے تو پہلے ہی خوف زدہ سا کر رکھا تھا۔

بیگ میں ڈائری، پن، کیمرہ، ہوٹل کے کارڈ سبھوں کو چیک کرنے کے بعد میں نے میٹرو کے نقشے کو ہاتھ میں پکڑا۔ ولادی کنو وسہڈ (Valadykino Voshod) سے ہمیں پہلے بورووتسکایا (Borovit Skaya)) تک جانا تھا۔ وہاں سے میٹرو تبدیل کر کے بلو تکا لینا (Biblioteka Lenina) پر اُترنا تھا۔ یہیں تھوڑے سے فاصلے پر ہماری منزل ریڈ سکوائر یا کرسنایا پلوشد تھی۔

اپنی ماں کی طرح میں بڑی حوصلے اور ہمت والی عورت ہوں۔ گھبراہٹ نے مجھ پر سوار ہونے کی کوشش ضرور کی پر میں نے بھی سچی بات ہے دھتکار کر رکھ دیا۔

''چلو ہنوز زیادہ لاڈو بننے کی ضرورت نہیں۔''

رُوس کے صدیوں پرانے تاریخی و ثقافتی مرکز اُس کی عظمتوں کے لینڈ مارک اُس تعمیراتی حُسن کے نمائندہ ریڈ سکوائر کو دیکھنے کا اضطراب میری ہر حرکت سے عیاں تھا۔

''میٹرو''۔

بس یہی لفظ کافی تھا۔ ایک دو تین راہگیروں سے یوں پوچھا گیا جیسے پوچھنا تو ہمارا پہلا حق ہے۔

سٹیشن کی عمارت میں داخلے سے پہلے اور بعد کی ساری اہم نشانیوں کو ذہن نشین کیا۔ چھوٹی سی بلڈنگ میں کرسی پر بیٹھا جھریوں سے اٹا پڑا چہرہ اور اُس کا سفید کُتا دونوں یاد رہنے والی چیزیں تھیں۔ پر یہ خیال بھی آیا کہ ہم نے ریڈ سکوائر کو کوئی ہاتھ لگا کر تھوڑا واپس آنا ہے۔ شام گئے لوٹنا ہوگا تو یہ نشانی بیکار ہے۔ ستر (70)، اسی (80) سالہ خاتون تو ڈیوٹی ختم ہونے پر جا چکی ہوگی۔

میٹرو کے نقشے پر ایک جانب انگریزی اور دوسری جانب رُوسی تھی۔ سیفٹی پن کی نوک سے انگریزی میں لکھے گئے سٹاپ کو سوراخ کے ذریعے دوسری جانب رُوسی میں نمایاں کر کے اُنگلی اُسی پر رکھتے ہوئے نقشہ ٹکٹ کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون کے سامنے کیا گیا۔ پچاس روبل کا نوٹ بھی شیشے کے چھوٹے سے سوراخ سے اندر کر دیا گیا۔

جتنے پیسے باہر آئے انہیں سکون سے گنا۔ اڑتیس روبل میں دو کارڈ ملے۔ کارڈوں کو خودکار گذرگاہ کی مشینوں سے مَس کرنا ٹک ٹھک کی گونج دار دل دہلانے والی آوازوں کے جلو میں آگے بڑھنا جہاں زمین کی پاتال تک عمودی انداز میں اُترتی ایسکیلیٹرز انتہائی تیز رفتاری سے مصرُوف کار تھی۔ یوں مجھے ان پر چڑھنے اُترنے کا خاصا تجربہ تھا پر مہرالنساء کے انداز بچوں سے بھی گئے گزرے تھے۔ بہرحال یہ پُل صراط بھی پار ہوا۔ پر اس انڈرگراؤنڈ ورلڈ نے اپنی خوبصورتی اور کشادگی سے ہکا بکا کر دیا تھا۔

دائیں اور بائیں بکھری ریل کی پٹڑیاں اُس پر بکھرا آسمان جسے حیرت سے دیکھتے ہوئے میں نے یکدم خود سے کہا۔

''یہ آسمان کہاں سے ٹپک پڑا۔''

کیا یہ تعمیر کا کوئی طلسم تھا یا رنگ و روغن کا کمال، جیسے صحرا میں چمکتی ریت دریا کا گمان دے۔ بعینہٖ یہاں بھی آسمان کا منظر اُسی انداز میں سامنے آیا تھا۔

میں تو ابھی راہداری کے حُسن میں ہی گم تھی کہ جب غار کے ایک دہانے سے شور مچاتی ساز بجاتی ہوائیں اُڑاتی ٹرین آ کر رُک گئی۔ ٹرین مجھے ہمیشہ سے ہی بہت فیسی نیٹ کرتی ہے۔ پر یہاں تھوڑا سا خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔ اُس وقت یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ہمیں دائیں طرف جانا ہے یا بائیں طرف۔ اس جانکاری کی کوشش نے بھی بڑا کھپایا۔ کوئی بات سننے کے لئے ایک پل بھی رُکنے کو تیار نہ تھا، جیسے رُکے تو قیامت آ جائے گی۔

''بیٹھو اور اس زیرِ زمین دُنیا کے رنگ تماشے تو دیکھو۔'' دل نے کہا۔

دل کی بات تھی تو ٹھیک۔ یوں بھی جلدی کاہے کی تھی۔ کوئی دفتر حاضری دینی تھی ہمیں۔ پلیٹ فارم پر دھرے بینچ چوڑے بھی تھے اور لمبے بھی۔ سو مزے سے بیٹھ کر مخلوق خدا کی سرگرمیاں دیکھنے لگے۔ گورے چٹے کہیں کہیں گیہواں رنگے کہیں کوئی سانولا دانہ۔ ہر وضع کے خدوخال والے۔ پر تیزی سبھوں پر ختم تھی، کیا بوڑھے اور کیا جوان، بس بھاگے جاتے تھے۔ یقیناً یہ بھاگنا بھی ایک متحرک اور زندہ قوم کی علامت ہے۔

اب اتنا ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ کس سمت سے آنے والی ٹرین ہمیں لینی ہے۔ پر نقشے کے حساب سے اُس کا رنگ گرے ہونا چاہیے تھا۔ رات جو سبق پڑھا تھا اُس کے مطابق میٹرو کے مختلف روٹس کے مختلف رنگ تھے۔ سارا ماسکو مکڑی کے جال کی طرح میٹرو کی سُرخ سبز نیوی بلیو اور پرپل رنگوں کی لائنوں میں اُلجھا ہوا ہے۔

چھک چھک کرتی ایک دو نہیں تین چار نیوی بلیو اور نیلے کے بین بین عجیب سے رنگ کی گاڑیاں گزر گئیں۔ گو وقفہ تو صرف پلکیں جھپکنے تک کا ہی ہوتا تھا۔ پر پھر بھی یوں کب تک بیٹھے اردگرد کو ہی تکتے چلے جانا تھا۔ اب اُٹھے اور پوچھ گچھ کے تعاقب میں بھاگے۔

''رنگ کبھی کبھی بدل جاتے ہیں۔ بوروونکایا اسی لائن پر نواں سٹیشن ہے۔ یاد رکھیئے۔''

دلکش لڑکا تھا۔ مروّت بھی دیدوں میں چھلکتی تھی۔ جب روکا تو فوراً رُک گیا تھا۔ معلومات کی یہ خیرات چھٹے بندے سے جا کر ملی تھی۔ اب سٹاپ گننے کی ڈیوٹی مہر النساء کے ذمّے لگی۔

کمپارٹمنٹ کی کشادگی، اس میں بکھری روشنی، اُس کی آرام دہ نشستوں کے جائزے، اُن پر بیٹھے پیر و جوان، مرد و زن جن میں سے بیشتر کی بند آنکھیں دیکھ کر بے اختیاری میں ہونٹوں سے پھسلتا یہ جُملہ۔

''اے ہے رات کیا سمندر کی آگ بجھاتے رہے تھے؟ کیسے پوستیوں کی طرح جھوم رہے ہیں۔''

سب کا نہیں پر چند عورتوں اور لڑکیوں کا بانکپن بھی لاجواب تھا۔ دو چہرے تو حافظے میں سدا محفوظ ہونے والے کہ وقار کی پھوار میں بھیگے ہوئے، اوپر سے ہاتھ میں کتاب اور رسالہ بھی کہ بندے کو تو ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا والی کہاوت یاد آئے۔

خود کلامی والے تبصروں کے ساتھ ساتھ انگشت شہادت کا بے اختیار ہی کمپارٹمنٹ کے مرکز میں آویزاں میٹرو کے بڑے سے نقشے پر اپنے مطلوبہ مقام پر آ جانا اور اردگرد کے بندوں سے جاننے کی کوشش کرنا سب میری سیماب فطرت کے عکاس تھے۔

پاس کھڑے اُدھیڑ عمر کے مرد نے سب سمجھا اور بے اعتنائی کی بجائے توجہ دی۔ اشاروں سے سمجھایا کہ میں بتاؤں گا۔

اب اطمینان ہی اطمینان تھا۔ پر وہ بندہ تو دو سٹیشن بعد ہی اُتر گیا۔ مہر النساء تسبیح کے دانوں کی طرح انگلیوں کی پوروں پر گنتی گراتی رہی۔ میں نے خود کو تسلی دی۔

''بھئی کاہے کو ہلکان ہوتی ہو، لطف اُٹھاؤ، لوگوں کو دیکھو۔ بھول بھٹک گئیں تو اُس کا بھی اپنا مزہ۔''

پر مہر النساء حساب کی پکی نکلی۔ ٹھیک جگہ اُترے۔ سٹیشن پر لٹکتے بورڈ پر لکھے بورووٹسکایا کے اندازِ تحریر اور ہمارے پاس نقشے پر چھپے رُوسی حروف کی مماثلت ایک جیسی تھی۔

لوگوں کا جمِ غفیر رواں دواں تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے سے قبل سُرخ اینٹوں کی دیوار میں بنی پینٹنگ کے باغ باغیچے اور عمارت کو نشانی کے طور پر دماغ میں بٹھاتے چلے گئے، اُترے اور سُرخ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ صرف ایک اسٹیشن۔ بلو تکا (Biblioteka)۔

ایسکلیٹرز تیز رفتار ہی نہ تھیں۔ کسی افغانی یونانی کے ناک کی طرح خطرناک حد تک عمودی بھی تھیں۔ خون چند لمحوں کے لئے رگوں میں منجمند ہوتا تھا۔ ایک جگہ جوان اور جوشیلا خون چُوماچاٹی میں بھی مصروف تھا۔ تو ایسے میں مجھ جیسی بھلا بڑبڑائے بغیر کہیں رہ سکتی تھی۔

"کم بختو دم تو لے لو۔ کہیں زندگی کی گاڑی چھوٹنے والی ہے تمہاری۔ لڑھک گئے تو ہم جیسوں کو بھی ساتھ میں لپیٹتے جاؤ گے۔ تمہاری ہڈی پسلیاں تو شاید بچ جائیں پر ہمارا تو بُھرمہ ہو جائے گا۔"

اس زیرِ زمین دُنیا سے باہر آسمان نکھرا ہوا تھا۔ دھوپ روشن تھی۔ سڑکوں کی کشادگی، پختگی، سیاہی اور اطراف میں کھڑی بلند و بالا عمارتوں کا رُعب و دبدبہ متاثر کرتا تھا۔ اُن فٹ پاتھوں پر جہاں کتابیں بکتی تھیں اور درختوں کے پتے ہواؤں کے زور سے اُڑتے پھرتے تھے انہیں دیکھنا اور اُن سے ملنا بہت لُطف دے رہا تھا۔

زیرِ زمین ایک اور راستے سے ہم الیگزینڈر گارڈن کے وسطی حصے میں جا پہنچے۔ آگے کوئی پون فرلانگ پر باغ کا اولین حصہ اور ریڈ سکوائر تھا۔ یہاں زیرِ زمین فائیو سٹار فری باتھ روم تھے۔ باغ کی ہریالی اور اُس کی تازگی آنکھوں میں کھبی جاتی تھی۔ سامنے کریملن کی دندانے دار سُرخ دیوار دُور تک جاتی نظر آئی تھی۔ ڈھلان سے نیچے خوبصورت سڑک سے پرے چھوٹی سی ایک عمارت تھی۔

گھاس کی خوبصورت ڈھلانی بیلٹ سے آگے کریملن کی دیوار نے جیسے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ میں سڑک کے کنارے دھرے بینچوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی تھی۔

صدیوں کی تاریخ کا لبادہ اوڑھے میں جس ماحول میں داخل ہونے والی تھی وہ کسی

فرحت آگیں مشروب کی مانند تھا۔

میرے لئے ایک بہترین کتاب کے ہر صفحے کو محبت و چاہت سے پڑھنا یا عمدہ چائے کے کپ اور میرے پسندیدہ مشروب پینا کلاڈا کے لبالب بھرے گلاس کو ہمیشہ چھوٹے چھوٹے گھونٹوں میں چسکے لے کر پینے کی کوشش ایسی ہے کہ جس کے لئے میں ہمیشہ خواہش مند رہتی ہوں کہ یہ کبھی ختم نہ ہوں۔

''مجھے کریملن کے اس جام کو لُطف و شادمانی سے دھیرے دھیرے پینا ہے کوئی جلدی نہیں۔''

ماسکو کے تاریخی ورثوں، اُس کی خوبصورتیوں اور دنیا کے بڑے شہروں میں اس کا شمار ہونے کی وجہ سے اسے بالعموم تیسرا روم کہا جاتا ہے۔ روم، استنبول، لزبن اور ٹوکیو کی طرح یہ بھی پہاڑیوں پر آباد ہے اور وہ بھی سات پر۔ اتنے خوبصورت شہر کی ابتداء کیسے ہوئی۔ بہت سی آرائیں ہیں۔ کچھ کا تعلق تو اُس مشہور زمانہ روایتی داستان سے ہے جس کا سرا عظیم شہزادے دانی اِل آئیوانووچ (Daniil Ivanovich) سے جا جڑتا ہے جسے شکار کرتے ہوئے ایک دو سُروالا جانور نظر آیا تھا جس کے تعاقب نے اُسے ہرمت بکال کی پہاڑ پر بنی جھونپڑی تک پہنچا دیا۔ ماسکو کی بنیادی اینٹ بکال کی اسی جھونپڑی پر رکھی گئی۔

ایک اور بڑی دلچسپ رائے اس کی ظاہری صورت اور نام کے بارے میں سترھویں صدی کے پرانے یوکرینین یہودی قانون دانوں کی سامنے آئی ہے جنہوں نے اپنے جدّ امجد موسوچ (Mosoch) جیپت (Japheth) کے بیٹے جو بلیک سی کے شمال مغرب کے ایک پرانے ملک سنتھینا (Scythians) سے ہجرت کر کے یہاں آیا، آباد ہوا اور ماسکو کا نام اس کے اپنے، بیوی، بیٹے اور بیٹی کے ناموں کے حروف پر پڑا۔

مشہور تاریخ دان ہیرلڈیم کا کہنا ہے کہ تیرھویں صدی کے آغاز سے اہل رُوس تاتاریوں کے محکوم تھے۔ پرانا دارالحکومت کیف (موجودہ یوکرائن کا دارالخلافہ) تاتاریوں کے

ہاتھوں تباہ ہو چکا تھا۔ ٹکڑوں میں بٹے علاقوں کے مختلف رُوسی شہزادے تا تاری خان کے نوکر چاکر کہلاتے۔ انہی شہزادوں میں سے ایک نے دلیری اور اطاعت میں بڑا نام پیدا کیا جسے اُس کی قوم نے الیگزینڈر رنیوسکی کا خطاب دیا۔ الیگزینڈر رنیوسکی کے ایک بیٹے کو یہ علاقہ جاگیر میں ملا۔

''موسکوا'' کے معنی ''متلاطم پانی'' کے ہیں۔ تو جہاں یہ کریملن ہے، یہاں گھنے جنگل تھے اور اس پہاڑی پر فن لینڈ کے باشندوں کی کچھ جھونپڑیاں تھیں جو تا تاریوں نے پہلے حملے میں ہی جلا ڈالی تھیں۔

تو بس یہاں کلیسا کی بنیاد رکھی گئی اور شہر تعمیر ہونا شروع ہوا۔

اور چوتھی روایت بتاتی ہے کہ ماسکو کی ابتدائی تاریخ تو گم ہے۔ صرف قرائن اور شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں صدی میں شہزادے اولیگ (Oleg) نے دریائے سمورودنکا (Smorodinka) (موجودہ دریائے ماسکو) کے کنارے شہر کی بنیاد رکھی۔ شاید والی بات ہے یقیناً نہیں کہ 1147ء سے پہلے کسی معاہدے کی رُو سے تاریخ میں ماسکو کا ذکر ہو تو ہو۔ ہاں البتہ سزڈل (Suzdal) کا شہزادہ یوری ڈولگورکی (YuryDolgoruky) اور چیرنیگوو (Chernigov) کے شہزادے Sviatoslav کے درمیان لڑائی ہوئی اور پرنس یوری نے انہیں شکست اور قتل کرنے کے بعد شہر کی بنیاد عین اُس جگہ رکھی جہاں اس وقت کریملن ہے۔ یہ روایت زیادہ مستند ہے کیونکہ رُوس کی موجودہ تاریخ یوری ڈولگورکی کو ہی ماسکو کا بانی مانتی ہے۔

تو زمانوں کی تاریخ کو اپنے سینے میں کسی خزانے کی طرح سمیٹنے اور محفوظ رکھنے والا موسکوا آغاز ہی سے بہت بربادیوں، تباہیوں اور خون ریزیوں کا شکار رہا۔ کون سا اُس کا ہمسایہ ملک تھا جس نے اُس پر چڑھائیاں نہ کیں۔ فرانس، سویڈن، جرمنی، منگولیا، پولینڈ اور تُرکستان کی فوجوں نے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کیا تا تاری اور کیا فرانسیسی شہر اُن کی جنگوں کی قربان گاہ پر چڑھتا اور اپنے آپ کو جلا تا تباہ کرتا اور پھر ہر بار ایک نئی آن اور شان سے اُبھرتا رہا۔

اور پھر یہ بھی ہوا کہ رومانوف کے پیٹر دی گریٹ نے ماسکو کو اُس کے کیپٹل سٹیٹس سے بھی محروم کردیا۔ تاہم اُس کی اہمیت اس کے دبدبے اور اس کی شان میں کوئی کمی نہ آئی۔ شاہوں کی تاج پوشیاں اُس کے گرجاؤں میں ہوتیں۔ فتح کے جشن یہیں منائے جاتے اور رُوسی فاتح افواج کو اسی کے میدان خوش آمدید کہتے۔

گرینڈ کریملن گارڈن کے اس وسطی حصے کے دوسری طرف سڑک پار کرکے میں اُس چھوٹی سی عمارت کے اندر داخل ہوئی جہاں کتابوں کی ایک شاپ تھی۔ جہاں تھیٹر کے ٹکٹ بکتے تھے اور جہاں ٹیلیفون سروس تھی۔

کاپی کھول کر سب سے پہلے ڈاکٹر پرویز کے جگری یار شاہ نواز قیصرانی کو فون کیا۔ فون پر جو آواز سننے کو ملی وہ ایک بچے کی تھی جس نے بغیر کسی توقف کے بتایا کہ اُس کے والد پاکستان گئے ہوئے ہیں۔

''لیجیے قصہ ختم۔''

میں نے کاپی بند کردی۔ اور ڈاکٹر پرویز کے دوسرے دوست ظہیر اللہ خان کو فون کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے خود سے کہا۔

''میاں بیساکھیاں مت ڈھونڈو۔ شہر اجنبی ضرور ہے پر تمہارے جذبے بھی جوانوں جیسی اُمنگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ راستے خود بخود کھلیں گے۔''

ہواؤں کی تیزی نے دُھوپ کو کس قدر میٹھا بنا دیا تھا۔ جی چاہتا تھا بینچ پر بیٹھ کر اُس سے لطف اُٹھائیں۔

''بھئی اب جگہ جگہ بیٹھتے ہی رہنا ہے کیا۔''

اپنی اس ہر خواہش پر دم نکلے والی عادت کو ذرا ڈپٹا۔

اُوپر جانے کے لئے کشادہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ آخری زینے سے خاکروب خواتین صفائیاں کرتی نیچے آرہی تھیں۔ میں اک ذرا رُکی صرف یہ جاننے کے لئے کہ یہ کونوں

کھدروں میں پھنسا ہوا گرد وغبار نکالتی ہیں یا ہماری عورتوں اور مردوں کی طرح ٹرخاؤ کام کرتی ہیں۔ پرنہیں جی کیا بات تھی، ایک ایک پوڈا گمن سے صاف ہو رہا تھا۔ ایک زندہ اور باشعور قوم کی جمعدارنیاں احساس ذمہ داری سے لدی پھندی تھیں۔

اُوپر کشادہ میدان میں لوگوں کا جم غفیر کھڑا تھا۔ میرے سامنے سُرخ رنگ کا ٹاور ٹروئٹسکایا (Troitskaya) اطالوی فنکار Antonio Friazin کا شاہکار چوکور زیریں حصوں پر محرابی چھوٹی بڑی بُرجیوں اور سبز میزائل جیسی صورت والے سرے اور ڈھلانی گزرگاہ کے ساتھ کوٹافہ (Kutafa Tower) کی یونانی سٹائل کی ڈیوڑھی میں اُترتا نظر آیا تھا۔ کریملن میں داخلہ اسی ٹاور سے ہوتا ہے۔ رُوس کی ریاستی شان کا مظہر۔ دنیا کے بہترین تعمیراتی حُسن کا نمونہ، تاریخی اور ثقافتی یادگاروں کا ایک جہان کریملن کی صورت میں اس کے اندر آباد تھا۔ کریملن جسے دیکھنے کی خواہش مجھے زمانوں سے تھی۔

سامنے شیشوں کی دیواروں والے بیضوی صورت کمرے میں مشینوں پر کھٹا کھٹ ٹکٹوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک جانب ریلنگ کے ساتھ اضافی چبوترے پر بیٹھتے ہوئے میں نے خود سے کہا۔

''ابھی اندر نہیں جانا اور ٹکٹ نہیں لینا۔ باہر بھی تاریخ سے لدا پھندا پڑا ہے۔ اِس سے تو ذرا آشنائی ہو جائے۔''

تو پھر چلیے۔

اوکھوتنی (Okhotny) انڈر گراؤنڈ مارکیٹ کی چھت پر خوبصورت ریلنگ کے ساتھ خود کو ٹکا کر مینز سکوائر کے اردگرد بلند و بالا عمارات کے ستاروں جیسے جھرمٹ پر نظریں ڈالنا، گاہے گھاس کے قطعوں کی پختہ حد بندیوں اور شیشے کے گُنبدوں کے گرد کھنچی باؤنڈریوں پر بیٹھے چلتے پھرتے باتیں کرتے رنگا رنگ لوگوں کو دیکھنا، گاہے عین وسط میں بنے بڑے گنبد کی چوٹی کے مجسموں اور گاہے آسمان کی وسعتوں کی طرف مائل پرواز عمارتوں کی عظمتوں کو سراہنا اور اکثر

دریائے نیگلینیا (Neglinnaya) میں رُوسی کہانیوں کے کرداروں کو مجسموں کی صورت نظارہ کرنا بڑا دلچسپ شغل تھا۔ بہت دیر تک اِن منظروں سے دل لگی کی۔

پھر اوپر سے نیچے آ گئے۔ چھوٹی سی مُنی سی ندیا کی صورت دریائے نیگلینیا خوبصورت سنگی کناؤ دار ڈیزائنوں میں مقید، الیگزینڈر باغات کے ہمسائے میں ست روی سے بہتا گیا، سچی بات ہے مستیاں اور چہلیں کرتا پھرتا تھا۔ پتہ نہیں دریا کا نام اسے کیوں دیا۔ یہ تو ایک مُنا سا نالہ تھا۔

نیگلینیا کے ان نیلے پانیوں میں فواروں سے نہاتے مجسمے تھے۔ مجسمے جو کہانیاں سُناتے تھے اور کہانیاں جو بالکل اپنے ہاں جیسی ہی تھیں۔ سارس اور لومڑی اور اُن کا مرتبان، شہزادہ اور مینڈک۔ زار کا بیٹا آیوان (Ivan) اور اُس کی دلہن مینڈک جو دراصل شہزادی یلینا ہے۔ وہی زار کا حکم میرے لئے تینوں بہوئیں فلاں چیز پکائیں، فلاں چیز سیئیں۔ مینڈک کی کارکردگی سب سے اعلیٰ اور آخر میں شہزادے کا راز پا لینا۔ جادو کا ختم ہونا اور شہزادی کی اپنی اصلی صورت میں واپسی۔

مچھیرا اور سونے کی مچھلی۔ مچھیرا کا مچھلی پکڑنا۔ مچھلی کی جان بخشی کی درخواست، بدلے میں اُن کی خواہشات کو پورا کرنا۔ بیوی کی بڑھتی ہوئی ہوس اور آخر میں سب کچھ گنوا دینا۔

مجھے انتظار حسین کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

کہانیاں سفر کرتی ہیں، تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ ایک جیسی ہی ہوتی ہیں اور اجنبی جگہوں پر حیرت کے ساتھ اپنائیت کا احساس بھی دیتی ہیں۔

اور جیسے میں یہاں کھڑی کچھ ایسے ہی جذبات و احساسات کا شکار تھی اور بے اختیار ہی خود سے کہے چلی جا رہی تھی۔

''ارے یہ تو میرے دیس کی کہانی ہے، یہ یہاں کیسے؟''

آگے بڑھنے سے قبل ہم نے میکڈونلڈ تاک لیا تھا۔ یہیں آنا ہے، اور پیٹ میں کھانا

ہے۔ میں گنگنائی، اُس وقت ترنگ میں تھی۔ موسم حسین اور فضاء سازگار تھی۔ آخر خود کو تھوڑی سی دیر کے لئے نوعمر سمجھنے میں بُرائی ہی کیا تھی۔

الیگزینڈر گارڈن کا سیاہ آہنی گیٹ شاندار اور اندر کے نظارے شاندار ترین تھے۔ گیٹ کھُلا تھا اور اندر جانے کی اجازت تھی۔ کنگورے دار سُرخ فصیل آرسینلینیا (Arsenalnaya) ٹاور کے ساتھ ریڈ سکوائر کی طرف مڑتی چلی گئی تھی۔

میں نے پس منظر میں جھانکتی ایک کلاسیکل طرز کی زردئی عمارت کو غور سے دیکھا۔ اس کی سفید کھڑکیوں اور سفید ستونوں نے اِسے بڑی دلکشی اور انفرادیت دے رکھی تھی۔ یہ عمارت منیز کہلاتی ہے۔ منیز کے معنی گھڑ سواری کے ہیں ماضی میں گھڑ سواری کا اسکول تھی۔ آج کل نمائش ہال ہے۔

اِس عمارت کا کمال فن اُس کی چھت ہے جو پینتالیس (45) میٹر چوڑی ہونے کے باوجود لکڑی کے شہتیروں پر کسی ستون اور سہارے کے بغیر کھڑی ہے۔

اُس کی اندر سے زیارت ضرور کرنی ہے۔ یہ میں نے رات منظور سے اس کے بارے میں سُنتے ہوئے طے کیا تھا۔

الیگزینڈر گارڈن میں کریملن کی دیوار کے سائے میں نامعلوم سپاہی کے مقبرے پر ستارہ صورت والے برنز میں کبھی نہ بجھنے والی آگ کا شعلہ روشن تھا۔ پھولوں کی ٹوکریاں، میز پر دھرا اُس کا آہنی کنٹوپ اور بندوق ایک لمحے کے لئے اُس خوبصورت صبح کو اُداس کرتی تھی اور کہیں یہ خواہش دل میں اُٹھتی تھی کہ کاش دنیا امن کا گہوارہ ہو جائے اور زندگی اتنی خوبصورت اور پُرامن ہو جیسی اُس صبح میں محسوس کرتی تھی۔

شیشے کے نیم قوسی شیڈ کے سامنے خاکی وردی میں ملبوس دو جوان سپاہی ساکت کھڑے زندہ انسانوں کی بجائے مجسمے دکھائی دیتے تھے۔

بلاشبہ یہ ایک دل موہ لینے والا منظر تھا۔ کسی تہذیبی، ثقافتی یا فوجی روایت کا امین۔ مگر سچی

بات ہے۔ ایک زندہ انسان گھنٹوں بے حس وحرکت کسی مُردے کی طرح کھڑا رہے میرے حسابوں میں بڑے ظلم کی بات تھی۔

تھوڑے تھوڑے وقفے بعد تین سپاہیوں کا مارچ پاسٹ کرتے ہوئے آنا، رُکنا اور اسی انداز میں واپس چلے جانا بھی مزے کا عمل تھا۔ ہم نے حد بندی کرتی آہنی چمکدار زنجیروں کی جھالروں کے پاس بیٹھ کر تصویریں بنوائیں۔

دیوار کریملن ریڈ سکوائر کی طرف مڑ گئی تھی۔ ڈھلانی چڑھائی سے آگے وہ جگہ تھی کہ جو میری یادداشتوں میں کسی تحیّر آمیز اسرار کی طرح زمانوں سے چھپی بیٹھی تھی۔

ریڈ سکوائیر۔ بوجھل جذبات کے زیر اثر میری آنکھیں بند ہوئیں۔ پھر کھلیں۔

میں تو ابھی باہر کھڑی تھی۔ میز سکوائیر میں۔

سینٹ باسل کیتھڈرل اپنے گنبدوں میناروں اور اپنی عمارت پر لپٹے رنگوں کی بوقلمونیوں سے دُور سے آنکھوں میں کھُبا جاتا تھا۔ ہرا پیلا گہرا گاجری سُرخ سفید جیسے بہار کھلی پڑی تھی۔ بہت دُور سے نگاہوں کو گرفت میں لیتا اور بار بار تکنے پر مجبور کرتا تھا۔

''ماسکو میں آنے والے سیاح سب سے پہلے یہیں آتے ہیں۔''

کس کا سفرنامہ غالباً بیگم اختر ریاض الدین احمد کا زمانوں پہلے کا پڑھا ہوا۔ تفصیلات وقت کی دھول کے غبار میں گم ہو چکی تھیں۔ پر اُس کا سحر اور فسوں ابھی بھی قائم تھا۔

بڑی دیر کی مہربان آتے آتے۔

الیگزینڈر باغ کے آخری کونے تک پہنچی ہوئی لمبی لائن جُوں کی طرح رینگتی تھی لنین کے مقبرے کو دیکھنے کے لئے اس لائن میں لگنا تو ضروری تھا۔ مگر ہم دونوں نے یہی طے کیا کہ اس مشقت کو باری باری جھیلیں۔

میں باغ کی سیاہ آہنی ریلنگ کے آگے بنے سیمنٹ کے بڑھاوے پر جا کر مزے سے بیٹھ گئی۔

پرانی رُوسی زبان میں کراسنی لال اور خوبصورت دونوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ پلوشد بمعنی چوک کے ہیں۔

کرسنایاپلوشد (ریڈ سکوائیر)۔

کوئلے کو ہیرا، سونے کو کندن اور شہروں کی بعض اہم اور ابتدائی چیزوں کو تاریخی ورثہ بننے میں زمانے لگتے ہیں۔ اس کا آغاز کا نام تُورگ (Torg) (معنی تجارت) اور تعمیر کا سال 1493ء تھا۔

اس کے عروج وزوال کی بھی ایک اپنی داستان ہے۔ گئے وقتوں میں صورت کیسی تھی۔ میں نے لمحہ بھر کے لئے صدیوں پہلے کے وقت میں چھلانگ لگائی۔

سترھویں صدی کا ریڈ سکوائر جس کے دوروپ میں نے آج صبح اپنے ہوٹل کے کاریڈور میں دیوار پر آویزاں دو بڑی پینٹنگز کی صورت دیکھی تھیں۔ اور سچی بات ہے خوشی سے نہال ہوئی تھی۔

گدھوں، خچروں میں جُتی ہمارے جیسی چوبی گاڑیاں جنہیں ہم گڈّے کہتے ہیں اب تو خیر سے وہ بھی غائب ہوتے جارہے ہیں مٹی دُھول اُڑاتے گھڑ سوار، گدھا گاڑیاں، لکڑی کے مکانوں سے جھانکتے بچے عورتیں، سمور کی ٹوپیاں اوڑھے لمبے لمبے فرغل اور رینڈر کی کھال کے بھدے جوتے پہنے بوڑھے، ہمارے ہاں کے جُمعہ اور اتوار بازاروں کی طرح اجناسِ خوردونوش کی منڈی لگی ہوئی تھی۔ دھوپ یا بارش سے بچاؤ کے لئے سودوں کے اُوپر خیمہ نما شیڈ جیسے ہمارے ہاں ٹپری واس یا ریڑھیوں والے لگاتے ہیں۔ شاہی بگھیاں بھی تھیں جہاں اس وقت لنین کا مقبرہ ہے وہاں لکڑیوں کے گٹھے پڑے تھے۔ یہ تو بڑا اپنا اپنا تھا۔ مانوسیت میں گندھا فینٹسی کی خوشبو میں مہکتا ہوا۔

چوبی مکانات تو حکما بنانے بند ہو گئے تھے کہ بڑی خوفناک آگ بھڑکی تھی یہاں۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ یہ زمانہ آیوان سوم کا تھا۔ کریملن کی سُرخ اینٹوں والی دیواریں اور

ان میں بنے مینارے تب بھی تھے بس فرق ذرا قد وقامت اور نفاست کا تھا جسے وقت دھیرے دھیرے خوبصورتی اور رعنائی دیتا چلا گیا تھا۔

میرے اردگرد مشرقی اور مغربی طرز تعمیر کا حُسن بکھرا پڑا تھا۔ اگر سامنے قدرے سیاہی مائل سُرخ سہ منزلہ سٹیٹ ہسٹری میوزیم کی عمارت کی چھوٹی بڑی محرابی کھڑکیاں، چھوٹی اینٹ سے بنایا ہوا ڈیزائن اور اُس کے بُرج سب مشرقی طرز کے عکاس تھے۔ تو میری بائیں جانب دُور تک مغربی طرز اپنی جلوہ آرائیاں کرواتا تھا۔

بڑی لمبی قطار تھی۔ لوگوں کے ملبوسات سے لے کر صورتوں میں بھی بڑا تنوع تھا۔ میں عمارتوں سے ہٹ کر اب انسانوں کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

بھانت بھانت کے سیاحوں کے ساتھ ساتھ ملک کے طول وعرض سے آئے ہوئے مختلف لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ روسی معاشرہ رنگا رنگ قبائل یوکرینئن، آرمینیائی، مالداویائی، گاتھ، منگول، تاتاری روسی اور بہت سی دیگر قوموں کا ملغوبہ ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق ایک سو پچپن نسلوں پر مشتمل یہ رُوسی قوم سو سے زیادہ زبانیں بولتی ہے۔

کبھی تو یہ بات بھی اَز راہ تفنن زبانِ زد عام تھی کہ اگر کِسی رُوسی کو رندے کے ایک دو رندے لگا کر اُس کی دو تین پرتیں اُتار دی جائیں تو نیچے سے ایک منگول نکلے گا۔

دفعتاً میری اِدھر اُدھر بھٹکتی نظریں سامنے سے آتے ایک مانوس چہرے سے ٹکرائیں۔ سفید شلوار گبرے اور ہلکے نیلے پھولوں والی قمیض پر ململ کا سفید دوپٹہ اوڑھے، رنگ سانولا اور نقش موٹے موٹے تھے۔ ہندوستانی دِکھتی ہے۔ میرا خود سے کہنا تھا۔ عمر یہی کوئی پینتیس (35) چالیس (40) کے چکر میں ہوگی۔ ساتھ دو نوعمر بچے لڑکا لڑکی۔

اب میرا تجسس عروج پر کہ دیکھوں ہے کہاں کی؟

ابھی میں اٹھنے کا ارادہ کرتی تھی کہ جب وہ بچوں کو کیو میں لگا کر میری طرف آئی۔ یقیناً اُسے بھی میرے لباس اور چہرے مہرے نے اپنایت کا تاثر دیا ہوگا۔

پُرخلوص سی مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ میرا قیافہ اُس کے ہندوستانی ہونے کے امکانات پر درُست تھا۔

پنجابی تھی۔ دلّی یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتی تھی۔ شوہر نے یہاں بزنس شروع کر رکھا تھا۔ بزنس خاصا کامیاب تھا۔ ماسکو دوسرا گھر بن گیا تھا۔ ابھی تک بہت سارے چکروں کے باوجود لینن کا مقبرہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ آج بچوں کے ساتھ خود بھی دیکھنے اور انہیں دکھانے لائی تھی۔ نام انیتا کور تھا۔

مجھ سے تعارف کے بعد اُس نے جُوں کی طرح رینگتی لائن کو دیکھا اور بولی۔

ماضی کے سوئیت رُوس کی یہ نشانی اب بڑی متنازع ہوتی جارہی ہے۔ ان کے اخبارات میں لینن کو دفنانے کے موضوع پر آئے دن بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ اگر اُسے دفنانے کا حامی ہے تو دوسرا اسے اسی طرح رکھنے پر مُصر ہے۔

میرے یہ پوچھنے پر کہ وہ روسی پڑھ سکتی ہے۔ اُس نے بڑے فخر سے کہا تھا۔

''ارے پڑھنا کیا؟ مجھے تو لکھنی بھی آتی ہے۔''

''آپ کی اس تناظر میں کیا رائے ہے؟''

اُس کی علمیت تو مجھ پر آشکارا ہوگئی تھی۔ سوچا چلو دیکھوں تو سہی کہتی کیا ہے؟

میرا سوال ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ مہرالنساء کی مجھے آواز سُنائی دی۔ میں اُٹھ کر بھاگی تھی۔ پتہ نہیں اُس نے کون سا چھو منتر پھونکا تھا کہ آخری سرے پر کھڑی تھی۔

میں فوراً پلٹی۔ انیتا کا ہاتھ پکڑا اُس کے بچوں کو لائن سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور بھاگتے ہوئے مہرالنساء کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔

آہنی رُکاوٹوں کے ساتھ کھڑے سپاہیوں نے آگے دھکیلا۔ چیکنگ یہاں زیادہ سخت تھی۔ بیگ میں موجود کیمرے کو کلوک روم میں رکھنے کے لئے کہا گیا۔ اشارہ کردہ جگہ کی طرف بھاگی۔

ساتھ روبل کیمرے کی حفاظت کا معاوضہ۔ دو ننگی سی عورتیں۔ ایک تو برازیل کی نوعمر لڑکی سے اُلجھ رہی تھی۔ لڑکی کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اُس کا کہنا تھا۔

''والٹ اُس کی ساتھی کے پاس ہے۔ کوئی میں بھاگ جاؤں گی واپسی پر کلیرنس ہو جائے گی۔''

دونوں آگ بگولا تھیں۔ لڑکی نے مجھے دیکھتے ہی چلا کر انگریزی میں کہا۔

''کس قدر بیہودہ عورتیں ہیں یہ۔ نری جنگلی۔ ابھی سیاحت کے آداب سے شناسا نہیں، ان کے ملک آئے ہیں، پیسہ خرچ کرتے ہیں اور انہیں دیکھو۔''

میرے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ میں بھاگتی ہوئی کیمرہ رکھنے تو آ گئی تھی پر پیسے تو مہرالنساء کے پاس تھے۔

میں برازیلی نہیں پاکستانی تھی۔ میری آنکھوں میں التجا تھی۔ چلئے جناب التجا کو پذیرائی مل گئی۔

کسی کسائی وردیوں میں چیکنگ کے آلات پکڑے لونڈوں کے پاس جانے کی بجائے میں اک ذرا ٹھہر گئی تھی۔

بھاگتی دوڑتی نظروں کو لگام ڈالتے ہوئے میں نے کہا۔

''رکو۔ چند لمحے مجھے سکون سے اس میدان کو تو دیکھنے دو۔ اور جب میں نے نگاہیں اُٹھا کر انہیں بہت دُور تک پھینکا تھا۔ میری نظروں کے احاطے میں پورا ریڈ سکوائر سمٹ گیا تھا۔ میں ہنس پڑی تھی کہ وقت کی ٹنل سے نکل کر ایک بڑا خوش کن منظر سامنے آ گیا تھا۔ پام سنڈے کو رُوس کا زار (بادشاہ) بڑا پادری گدھوں پر سوار یہاں داخل ہوتے۔ اُن کے تعاقب میں گدھوں پر سوار ایک بڑا جلوس ہوتا۔ گدھے یقیناً ہمارے ہاں کے گدھوں جیسے مریل سے تو نہ ہوتے ہوں گے پر ڈھینچوں ڈھینچوں تو ضرور کرتے ہوں گے۔ تو پھر ایسی سُریلی آوازوں سے بھرا یہ سکوائر کیسا لگتا ہوگا۔ میں نے تصور میں اس منظر سے لطف اُٹھایا۔ سارے لوگ سینٹ باسل کے

گرجے میں عبادت کرتے۔

میری نظریں لمبے چوڑے گم (Gum) سٹور میں اُلجھیں۔ ماسکو کا سب سے بڑا سٹیٹ جنرل سٹور۔

اور اب میرے سامنے وہ جگہ تھی جسے میں دیکھنے جا رہی تھی۔ جہاں لینن جیسا انقلابی انسان مجسم ہوا پڑا تھا۔

ریڈ سکوائیر کریملن کی جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ وسیع میدان کے سینے پر لمبی لکیریں یوں کھینچی ہوئی ہیں جیسے ابھی یہاں کوئی ریس شروع ہونے والی ہے۔

ہر قومی تہوار پر فوجیوں کی پریڈیں، آتش بازیوں سے آسمان کا سینہ رنگین ہونا اس کی ثقافتی اور تاریخی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے۔

ہم ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے تھے۔

صنوبر کے خوبصورت درخت کریملن کی کنگری دار سُرخ دیوار کے ساتھ ساتھ خاموش سنتریوں کی طرح کھڑے تھے۔ یہاں اکتوبر انقلاب کے شہداء، کمیونسٹ لیڈروں، جنگ عظیم دوم کے شہیدوں، کچھ اہم ملکی شخصیتوں اور کچھ غیر ملکی انقلابیوں کی قبریں ہیں۔ اسی لئے یہ سیاستدانوں، فوجیوں، خلابازوں اور قومی شخصیات کا نیکروپولس بھی ہے۔ قبروں پر پھولوں کی ٹوکریاں اور گلدستے سجے ہوئے تھے۔

تیز ہواؤں کے زور نے کچھ پھولوں کو اُڑا کر گذرگاہ کے ساتھ زمینی حصے پر بکھیرا ہوا تھا۔ میں پھول تو نہ لائی تھی۔ انہیں ہی غنیمت سمجھتے ہوئے فی الفور اٹھانے پر لپکی، بڑی محبت اور عقیدت سے چند پھولوں کو ایستادہ مجسموں کے قدموں اور قبروں پر رکھتے ہوئے کچھ ایسی ہی طمانیت محسوس کی جیسے چھوٹے ناکارے لوگ اُنگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے پر خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔

دفعتاً اونچی سی ایک آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''جان ریڈ کی قبر بھی یہیں کہیں ہے۔''

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ لینن پر امریکی مصنف اور جرنلسٹ جان ریڈ کے بہت سارے آرٹیکلز میں نے پڑھے تھے۔

''تو کہاں ہے اُس کی قبر۔'' میں نے خود سے پوچھا اور چاہا کہ جس نے یہ کہا ہے اُسے دیکھوں پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور قطاریں تھیں اور رُکنا محال تھا۔

زنگاری اور سیاہ گرینائٹ سے تعمیر شدہ ایک چھوٹی سی عمارت جس کی تعمیر مصری مستطیے (چبوترے پر دھرا چبوترا اسٹائل) جیسی ہے جو ریڈ سکوائر کے کلاسیکل ماحول میں بڑی منفرد سی لگتی ہے۔

1924ء میں تعمیر ہونے والے اِس موسولم (Mausoleum) کا نام قاہرہ کے عظیم فرعون Mausolus کے مقبرے کے نام پر ہے جو چوتھی صدی قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا۔

خواہشوں کا دل میں اٹھنا کوئی عجیب بات ہے۔ میرا بھی کیسے جی چاہا تھا کہ میں بھورے رنگے زینہ بہ زینہ سیڑھیوں کے دونوں اسٹینڈوں جن پر اہم دنوں اور تہواروں پر ملکی وغیر ملکی شخصیات بیٹھتی ہیں، ٹانگیں پسار کر بیٹھ جاؤں اور درمیان میں سینڈوچ کی طرح دھری رسٹ اور سیاہی مائل گرینائٹ کی بنی ایک چھوٹی سی عمارت میں آرام کرتے انقلابی لیڈر کے بارے میں وہ ساری باتیں یاد کروں جنہیں میں نے وقتاً فوقتاً بہت پڑھا تھا۔

پر میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ تعاقب میں ایک ریلا تھا اور سکوائیر میں گھومتے پھرتے سیٹیاں بجاتے پولیس کے سپاہی تھے جو میری اس حرکت پر مجھے سکوائیر کی حدود سے باہر کر سکتے تھے۔

کشادہ سیاہی مائل گرینائٹ کے زینوں پُر اسراریت بکھری ہوئی تھی۔ پہلے پڑاؤ پر سبز وردیوں اور ٹوپیوں میں کھڑے تین انتہائی خوبصورت رعنا جوان لڑکے ہو بہو مجسمے نظر آئے تھے۔ اُس نیم تاریک ماحول میں اُن کے سفید رنگ اور اُن کا بے حس و حرکت کھڑے ہونا ماحول کو

بے حد سنسنی خیز بنا رہا تھا۔ ایک ٹک انہیں دیکھتے ہوئے میں احمقوں اور بدحواسوں کی طرح اُتر رہی تھی اور بس گرتے گرتے بچی تھی کہ ایک مجسمے نے مجھے ہاتھوں سے تھام لیا تھا۔

میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ میرا گٹہ گوڈا نکل سکتا تھا۔ لڑھک کر آخری سرے پر جا سکتی تھی۔ مونہہ کے بل گر سکتی تھی۔

بہرحال ممنونیت اور تشکر میں ڈوبے ہوئے ڈھیروں ڈھیر الفاظ نے اوپر والے کو نہال کر دیا ہوگا اور یقیناً اُس نے کسی فرشتے کو حکم دیا ہوگا۔

''جاؤ میاں ذرا اُس اللّی بللّی خاتون کا خیال رکھو۔''

آگے پھر ایسا ہی ایک مرحلہ تھا۔ ویسی ہی حسین صورتوں والے لونڈے چمکتے تھے میں حد درجہ محتاط تھی۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے محاورے پر عمل پیرا تھی۔ کمرے کی کشادگی مناسب تھی۔ یہاں خوف سناٹا تاریکی اور ٹھنڈک تھی۔ قبر میں اور کیا ہوتا ہے۔

فضا میں ادب و احترام کا رچاؤ تھا۔ قطار بندی میں نظم و ضبط تھا۔ کہیں کہیں کوئی بہت سوگوار چہرہ دِکھتا تھا۔

سفید سنگِ مرمر کا چبوترہ جس پر شیشے سے ڈھنپے تابوت میں سیاہ سوٹ میں ملبوس لینن دونوں ہاتھ سینے پر باندھے دراز تھا۔ یوں جیسے طویل سفر کے بعد بندہ گہری نیند سو جائے۔ زرد روشنی میں اُس کے چہرے کے نقوش نمایاں تھے۔

یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔ میں نے متجسس نگاہوں سے پورے کمرے کو دیکھا۔ کہیں کوئی منبع نظر نہیں آیا۔ یقیناً یہ کوئی خاص روشنی ہوگی۔ 10 نومبر سے مقبرہ بند کر دیا جاتا ہے۔ ماہرین کا پینل باڈی کا تفصیلی اور تکنیکی معائنہ کرتا ہے۔

میں اور انیتا کور پاس پاس کھڑے تھے۔ چند لمحوں کا ٹھہراؤ اور آگے بڑھنے کا عمل جاری تھا۔ خروج دوسری جانب سے تھا۔

جب ہم باہر نکلے میں نے انیتا کی طرف دیکھا۔

''میں نے ایک سوال پوچھا تھا۔ شاید تمہیں یاد ہو۔''

''میرا نہیں خیال کہ لینن کو کبھی دفنایا جائے گا۔ آرتھوڈوکس عیسائیت کا کیا نظریہ ہے؟ اسے چھوڑیں۔ اس فکری اور عملی تحریک کے قائد کی کل بھی پرستش ہوتی تھی آج بھی ہوتی ہے اور کل بھی ہوتی رہے گی۔ آخر انسانوں اور قوموں کو پوجنے کے لئے بھی تو کچھ کرداروں کی ضرورت ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ اُس کی شریک زندگی کروپسکایا اُس کی فکر کی پوجا چاہتی تھی۔ اُس کی ذات کی نہیں۔ پر سٹالن اور اُس کے ساتھیوں نے اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لئے اُسے دیوتا بنا کر چھوڑا۔ بہر حال اس عمل نے رُوس کو ایک انفرادیت دی ہے۔ میں سمجھتی ہوں وہ اس سے محروم ہونا پسند نہیں کرے گا۔ نظام فیل ہو گیا ہے۔ یا استعماری طاقتوں نے اُسے ناکام بنا دیا ہے۔ یا خود نافذ کرنے والوں میں خامیاں تھیں اور وہ اسے سنبھال نہیں سکے۔ یہ لمبی بحثیں ہیں۔ انہیں چھوڑو۔ صرف سیاحتی نقطہ نظر سے ہی دیکھو۔ ریڈ سکوائیر اس موسولم کے بغیر کتنا اُدھورا ہے۔ ارے ہاں دیکھو یہ میری رائے ہے اور یہ غلط بھی ہو سکتی ہے۔''

باب

3

دوستووسکی نے موت ریڈ سکوائیر میں ''لوبنویا میسٹو'' پر نہیں دیکھی تھی

لوبونایا میسٹا • میسنن اور پوزر سکائے • سینٹ باسل کیتھڈرل

Смерчь Достоевски В Красном Полощаде
Не Видель Лбовная Места.
Позерска Цент Басел Церквеь.

سینٹ باسل کے گرجے سے پہلے ہمیں لوبنویا میسٹو (Lobnoye mesto) دیکھنا پڑا کہ زیبرا کراسنگ پر چلتے ہوئے جونہی مڑے، ایک جانب ذرا فاصلے پر لوگوں کا ایک ٹولہ چہلوں میں مصروف نظر آیا تھا۔ قدرے دور سے اسے دیکھتے ہی پتہ نہیں کیوں مجھے اچانک میلے ٹھیلوں میں سرکس کا خوفناک آیٹم موت کا کنواں یاد آ گیا۔ گولائی کے علاوہ اب کوئی ایسی مماثلت بھی نہ تھی۔

نقشے کو کھولا۔ ایک زوردار لمبا سا ہنکارہ بھرتے ہوئے میں نے کہا۔

''اچھا تو یہ ہے Place of skulls یا Execution Block۔ شاہوں کی انتقامی تسکین طبع، اُن کی بربریت اور فرعونیت کا ایک مظہر۔

میں نے انیتا کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہنس پڑی۔

''انیتا اِس سکوائیر میں رُوسی ادب کا ایک بہت بڑا لکھاری دوستووسکی بھی تو زار کے خلاف ستمبر یا دسمبر کی کسی شازش میں ملوث اپنی گردن کٹوانے کے لئے بیڑیاں پہنے آیا تھا۔''

''کیا؟'' اُس نے عجیب مضحکہ خیز انداز میں مجھے دیکھا۔

''کیسی بونگیاں مار رہی ہو۔کہیں پڑھا یا کسی سے سُنا؟''

''پڑھا۔کسی بڑے لکھنے والے کی تحریر تھی۔''

پہلی بات وہ کسی ستمبر یا دسمبر سازش میں ملوث نہیں تھا۔ یہ پیٹرا شوسکائے (Petrashevsky) سوسائٹی تھی جو پیٹرز برگ کے نوجوان ماہر قانون مکھیل پیٹرا شوسکائے نے سوشلسٹ نظریات اور انقلاب فرانس سے متاثر ہو کر بنائی تھی۔ جہاں دوستووسکی اور اُس جیسے بہت سے نوجوان اس کے ہفتہ وار اجلاسوں میں نہ صرف رُوسی بلکہ یُورپی لکھاریوں پر بحث مباحثے کے ساتھ چارلس فوریئر (Fourier) کی انسانیت کے سنہری دور کی تھیوری، ملکی اور غیر ملکی حالات پر اظہار خیال کرتے۔

یورپ میں 1848ء کی انقلابی لہر نے زار نکولس اول کو ہراساں کر دیا تھا، اِس لپیٹ میں بس تو یہ سارے پکڑے گئے۔

تو ہاتھ پاؤں میں وزنی بیڑیاں پہنے 22 دسمبر 1948ء کی سرد ترین صبح کو موت کا اُس نے جس جگہ سامنا کیا تھا وہ سائبیریا کے شہر اومسک (Omsk) کا سمینوسکائے (Semyonovsky) سکوائیر تھا۔

یہ ریڈ سکوائیر نہیں۔آیا سمجھ میں۔

اُف انیتا تم تو پوری تاریخ دان ہو۔

''اُستاد ہوں تاریخ کی۔'' گردن اکڑی ہوئی تھی اُس کی۔

اگر مجھے کراسنا کے مطلب کی رُوسی زبان میں سمجھ اور اس کے پس منظر سے آگہی نہ ہوتی تو یقیناً ریڈ سکوائر کا نام میں نے اسی خونی حوالے سے سمجھنا تھا۔

ریڈ سکوائر، سینٹ باسل کیتھڈرل، انتہائی بائیں جانب لوبنویا میسٹو، دائیں جانب دیوارِ کریملن، اسپاسکی ٹاور اور لینن کا مقبرہ

رُوس کی ایک جھلک

مصنف اور مہر النساء الیگزینڈر گارڈن میں نامعلوم سپاہی
کی یاد میں ہمیشہ جلتے رہنے والے شعلے کے پاس

آئی کونک پینٹنگ میں مدر آف گاڈ

مینن اور پوزرسکائے

سٹیٹ ہسٹری میوزیم

پشکن سکوائر میں پشکن کا مجسمہ ◄

اس کی گول منڈیر لکڑی کی نہیں لوہے کی تھی۔ مجھے اور انیتا کے بچوں کو اُس کے اندر جھانکنے کا اشتیاق مارے ڈال رہا تھا۔ سیڑھیوں کے سامنے ڈھیر سارے لوگ تھے اور کوئی لائن اور ڈسپلن نہیں تھا۔ گو دھکم پیل ہرگز نہیں تھی۔

پہلے میں چڑھی اور اندر جھانکا۔ سوائے ایک اونچے سے دیوار نما تھڑے اور لوہے کے ایک دروازے کے وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ جس کے بارے میں انیتا نے بتایا تھا کہ اس تھڑے کی عین درمیانی جگہ کو یروشلم کی پہاڑی گولگوتھا (Golgotha) جہاں حضرت عیسیٰ کو پھانسی دی گئی سے مماثلت کرتے قاتل کا سر اُس جگہ رکھا جاتا۔ فردِ جرم پڑھی جاتی۔ جلاّد کلہاڑا اُٹھاتا۔ اُسے فضاء میں بلند کرتا اور پل بھر میں سر جسم سے جدا ہو کر نیچے گرتا۔

کس قدر رُوح فرسا منظر۔ میں نے جھرجھری لی اور بچوں نے آنکھیں پھاڑیں اور بولے۔

''اتنے ظالم بادشاہ تھے؟''

''ویسے یہاں گاٹے اُترنے کے علاوہ کچھ اچھے کام بھی ہوتے تھے۔''

''انیتا اب اگر آپ اس کی کچھ خوبیاں بھی ہمیں بتا دیں تو چلو جاتے جاتے نفرت اور تاسف بھری نگاہوں سے اِسے افسردہ نہ کریں۔ ایک دو تعریفی جملے بھی بول دیں۔''

''بھئی اگر اِس پتھریلے پلیٹ فارم کا دامن خون سے نہاتا رہا تو اکثر اس پر مقدس تبرکات کی نمائش بھی ہوئی جسے ماسکو والے محبت اور عقیدت واحترام سے دیکھتے۔ یہاں زار کے فرمان سنائے جاتے، قومی و مذہبی تقریبات کا اعلان ہوتا۔ اسی چبوترے پر تاج شاہی کے مستقبل کے اکثر نئے وارثوں کا دیدار کروایا جاتا تاکہ سادہ لوح عوام اپنے مستقبل کے حقیقی زار کے رُخ روشن کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کرلیں اور جھوٹے فریبی تخت کے وارثوں سے خبردار رہیں۔

جب ماسکو خوفناک آتش زدگی سے جلا۔ آرتھوڈوکس چرچ کے سربراہ نے زار کے وحشیانہ اقدامات پر خدا کی جانب سے اس حادثے کو ایک سزا قرار دیا۔ تب آئیوان ٹیریبل

(Ivan Terrible) کو اپنے گناہوں پر افسوس اور پچھتاوا ہوا۔ وہ اس کے اُوپر چڑھا اور خدا سے معافی کا طلب گار رہا۔

کتنے متضاد رُخ ہیں جگہوں کے اور انسانوں کے۔

اب میں انیتا سے کیا کہتی۔ وہ تو اپنے حکمرانوں کے بارے میں بہت خوش قسمت تھی کہ وہاں اعتراف معافی اور کرسی چھوڑنا بھی کچھ ہے۔ بدقسمت تو ہم ہیں کہ ہمارے ہاں انتہائی بے غیرتی اور ڈھٹائی کے نمونے ہیں۔ چور، ڈاکو، لٹیرے اور قاتل ہیں اُوپر سے سینہ زور بھی ہیں۔

یہ آئیوان ٹیریبل بہت متکبر، ظالم اور عجیب وغریب فطرت کا مالک تھا۔ اُس کی خواب گاہ میں کوئی کھڑکی، کوئی روشن دان نہیں تھا۔ خوابگاہ کا ایک دروازہ اُس عقوبت خانے کی طرف کھلتا جہاں وہ انسانوں کے جسموں سے بوٹیاں کٹنے کا نظارہ کرنے جایا کرتا۔

البتہ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ڈھائی صدیوں کی غلامی کے بعد تاتاریوں کو والگا کے دہانے پر شکست دینے کے باوجود وہ تُرکی کے سُلطان اور چنگیز خان کی نسل کے تاتاری اُمراء کو اپنے ہم پلہ سمجھتا، جبکہ مغرب میں پولینڈ کے بادشاہ اور انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ اول کو توہین آمیز خط لکھتا۔ اُس کی حکومت کے رُوساء اُمراء تاتاری خانوں کی لڑکیوں سے بیاہ کرتے، مسلمانوں کی طرح اپنی دُلہنوں کو پردہ کرواتے اور ان ہی کی طرح اپنے گھوڑوں کو ہتھیاروں سے سجاتے۔

دفعتاً انیتا نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''تم نے تاتاریوں پر کچھ پڑا ہے؟''

''پڑھا تو ہے لیکن اس وقت میرے ذہن میں کچھ خاص نہیں۔''

میں نے جھوٹی علمیت بگھارنے کی قطعی کوشش نہ کی۔

''دُنیا کی کسی قوم کی تاریخ اتنی دلچسپ اور تحیّر سے لبریز نہیں جتنی اُن کی ہے۔''

اب انیتا کسی اور طرف نکلنا چاہتی تھی۔ میں نے اُس کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو جو ایک طرح رُخصتی کا اظہار تھے اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

''انیتا بچوں کو کچھ کھلاتے ہیں اور خود بھی چائے کافی لیتے ہیں۔ بس ذرا گائیڈ کرو۔''

اُس نے نہ نہ کی بہتیری کوشش کی۔ پر ہم نے بھی ایک نہ سنی۔

منیز سکوائیر سے آئس کریم خریدی گئی۔ تھڑے پر بیٹھ کر اُسے کھاتے ہوئے انیتا نے ڈھیر ساری باتیں بتائیں۔ نقشوں سے راہنمائی بھی کی۔ اپنے گھر کا پتہ میری کاپی پر لکھا۔ میٹرو کے نقشے پر سٹیشن کو سرکل کیا جو اُس کے گھر سے قریب ترین تھا۔ پیٹرز برگ سے واپسی پر اپنے گھر آنے کا وعدہ لیا۔

اور اندھے کو کیا چاہیے تھا، دو آنکھیں اور وہ اُسے مل رہی تھیں۔

آہنی گرل بڑی خوبصورت تھی اور سینٹ باسل کے آنگن کی گھاس پھولوں اور درختوں کی ہمسائیگی میں وہ یادگار بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میٹھے سے بادامی رنگے پیڈ اور ہلکے براؤن گرینائٹ کے چبوترے نے کانسی کے دو متحرک مجسموں کو نہیں بلکہ رُوس کے فخر اور رُوسی قوم کے اعزاز کو اٹھایا ہوا ہے۔

کوزما مینن (Kuzma Minin) اور دیمتری پوزرسکائے (Dmitry Pozharsky) آرٹسٹ کی کلاسیکل فنکاری کا نمونہ۔ ایک کردار کھڑا ہاتھ فضاء میں لہراتا ہے اور دوسرا نیم ایستادہ ایک میں صلیب اور دوسرے میں منبت کاری سے سجی سپر (پلیٹ) تھامے ہوئے ہے۔

تو یہ دونوں وہ ہیرو تھے جنہوں نے اس فوج کو کمان کیا جو سارے روس کے اُن مخلص رضا کاروں پر مشتمل تھی جس نے پولستانی حملہ آوروں کو مار بھگایا۔

ماسکو اور کریملن کو بچانے والے ان جیالوں کو آنے والے وقتوں میں امر کرنے والا مجسمہ ساز آئیوان مارتوز (Ivan Martos) ہے۔ یادگار کا اگلا حصہ فنکاری کا اچھوتا نمونہ ہے۔ آرٹسٹ نے قومی جذبوں کو، وقت کو اور تاریخ کو محفوظ کر دیا ہے۔

عام رُوسی مرد و خواتین کو لڑائی کے لئے اپنے زیورات دان کرتے خود کو جنگ کے لئے پیش کرتے دکھایا ہے۔ عورتیں اور مرد اپنا سب کچھ لٹانے پر تُلے نظر آتے ہیں چیزوں کا ڈھیر لگا

پڑا تھا۔ چہروں پر بکھرے تاثرات کوفن کی صورت میں دیکھنا خوبصورت تھا۔

بے مثال جذبوں کے کتنے روپ۔

1965ء کی لڑائی کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔

یادگار کے ماتھے پر چمکتی سنہری تحریر کو ہم نے خاک پڑھنا تھا وہ تو بھلا ہوا اُن یوکرینئین لڑکوں کا۔ جو اونچے لمبے چوڑے چکلے تھے گہری سانولی رنگت پر قدرے سرخی مائل آنکھیں جو کچھ خوف زدہ بھی کرتی تھیں۔ جنہوں نے خود ہی دست تعاون اپنے تعارفوں کے ساتھ بڑھایا تھا۔ ان کے ہاں انگریزی کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ پھر بھلا ہم اُن سے کیوں نہ پوچھتے کہ یہ لکھا کیا ہے؟

''روسی شہری مینن اور پوزرسکائے کا بے حد شکر گزار ہے۔''

دفعتاً فضاء گھنٹیوں کی مترنم آوازوں سے گنگنا اُٹھی۔ نگاہوں کو اِدھر اُدھر دوڑایا۔ عین سامنے اسپاسکی ٹاور (Spasskaya Tower) اپنی خوبصورتی اور بلندی کے ساتھ نظر آیا تھا۔ راکٹ نما خوش رنگ کلس اپنے ستارے کے ساتھ چمکتا تھا۔ مینار کا پہلا حصہ اپنی چہار سمت کلاکوں سے سجا ہے جن کے سنہری ہندسے اور سوئیاں اپنے سیاہ پس منظر کے ساتھ چمکتی ہیں۔ اُس سے اُوپر محرابی روشندانوں والے حصے میں لٹکی گھنٹیاں نظر آتی تھیں۔ جو تیں (30) ہیں اور ہتھوڑوں سے بجتی ہیں۔

زاروں کے زمانے میں ہر پندرہ منٹ بعد ''خدا زار کو سلامت رکھے'' کی صدائیں گونجتی تھیں۔ انقلابیوں نے اپنے انقلابی گیت ''انٹرنیشنل'' کو ٹیون کر دیا۔

"T is the final conflict".

مغرب کے یورپی صنعتی مزدور اور عام آدمی تو ابھی تک گاتے ہیں۔

"T will be the final conflict".

اور اب ڈن ڈن ہوتی ہے اور آدھی رات کو اس کا گجر ریڈیو کے ذریعے پوری دنیا

میں سُنا جاتا ہے۔

سینٹ باسل کیتھڈرل اپنے رنگوں اور ڈیزائنوں کی بھرمار سے سجا اپنے ہونے کا پتہ بہت دور سے دیتا تھا۔ رنگوں کی شوخی اتنی تیز تھی کہ بے اختیار نگاہوں کو قابو کرتی تھی۔ اُس کے ظاہری وجود، اس کے میناروں اور بُرجوں کے جتنے حصے نظر آتے تھے سب قدیم روسی طرز تعمیر کے عکاس تھے۔

ٹکٹ سو روبل کا تھا۔ فوراً لیا اور بے حد جوش و خروش سے لیا۔

اندر کیا پہنچے بے اختیار ہی ایک دوسرے سے کہنا پڑا۔

''ارے بیرونی بناؤ سنگھار کا تو وہ حال ہے کہ جیسے ایک چھیل چھبیلا دُولہا شوخ رنگوں کا جوڑا پہنے، چہرے پر سہرا سجائے، سر پر کلاّ ٹکائے، سجا سنورا گھوڑے پر چڑھا بیٹھا ہے۔ جونہی ذرا سہرہ ہٹا کر چہرے کی رُونمائی ہو تو معلوم ہو بڑھاپے کی خستگی بے چارے کی پور پور میں اُتری ہوئی ہے۔''

مہرالنساء کو تو جیسے پان چڑھ گئی تھی۔ فوراً ہی میرے لتے لینے پر تُل گئی۔

''میں تو عاجز آ گئی ہوں تمہارے ان لچھنوں سے۔ کہیں جالے لگی مسجدیں تمہیں مسحور کرتی ہیں اور کہیں یہ کرم خوردہ گرجے بانٹ کرتے ہیں۔ آتے ہی نوح کے زمانے کی چیزوں میں گھس جایا کرو۔ بندہ تھوڑا سا دم تو لے لے۔ خوبصورت اور حسین چیزوں سے ذرا آنکھیں تو سینک لے۔''

میں نے چپ بچے کی طرح اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ لی تھی۔ مجھے یاد آیا تھا مصر میں ہر چھوٹی بڑی مسجد میں میرا گھسنا اور اُس کی تاریخی کھوج میں پڑنا اُس پر کس قدر گراں گذرتا تھا۔

اندر نمی تھی۔ ٹھنڈک، سلین اور عجیب سی باس ماحول میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اب جو دیواروں کی تصویر کشی تھی اُن کے پس منظر سے ہمیں کیا آگاہی تھی۔ سوائے قیافوں کے کہ یہ بائبل مقدس کے اہم واقعات کی عکاس ہوں گی۔

گرجا تو کسی پزل، کسی معمے، کسی اُلجھے ہوئے دھاگوں کے گچھے کی طرح لگتا تھا۔ کوئی ایک ہوتا تو شاید اُس کا سر پیر بھی واضح ہوتا۔ جہاں یک نہ شد تیم و دہم شُد والا معاملہ ہو وہاں بات کیا بنے۔ ایک میں ایک پھنسا ہوا۔ ایک کی سیڑھیاں دوسری میں اُلجھی ہوئیں۔

اب سچی بات ہے اس میں قصور تو کسی کا بھی نہ تھا۔ واقعہ ہی اتنا اہم اور تاریخی تھا۔ زمانہ 1552ء کا تھا۔ رُوسی تاریخ کے مطابق بڑا بھاگوں والا کہ تاتاروں اور منگولوں کی غلامی کا طوق گلے سے اُتر گیا تھا۔

رُوسی افواج نے زار آئیوان ٹیریبل (Terrible) کی زیر کمان اپنے علاقوں پر قابض کازان اور استراخان کے تاتاریوں کو اُن کی حدوں میں دھکیل دیا تھا۔ رُوس کی سرزمین آزاد ہو کر اپنے مرکز ماسکو کے گرد اکٹھی ہوگئی تھی۔

آئیوان ٹیریبل کی شکرگزاری کیتھڈرل بنانے کی خواہش میں ظاہر ہوئی۔ اس خواہش کو پیرہن اور صورت دینے والے پوسٹنک (Postnik) اور بارما (Barma) تھے۔ نو گرجاؤں کی تعمیر بلند پیڈسٹل پر ہوئی جن میں آٹھ گرجاؤں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے بڑے گرجے سے جوڑ دیا گیا۔

گرجاؤں کے گنبد ان کے کنگر سجائے گئے۔ دیواروں پر آئل پینٹنگ سے بہترین آئی کونک تصویر کشی ہوئی۔ اُن کی چھب اور حُسن ایسا سحر انگیز تھا کہ کہا جاتا ہے آئیوان ٹیریبل جب اسے دیکھنے آیا تو حیرت زدہ اپنی پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ گُنگ کتنی دیر تک اِس کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا رہا۔ ہمراہ چلنے والے وزیر مشیر چاہتے تھے کہ زار اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ فنکاروں کی محنت کو خراج پیش کرے مگر زار کے ہونٹ بند تھے۔ چہرے پر سناٹا تھا۔ آنکھوں میں تحیر تھا۔

اور اگلے روز جب وہ دربار میں رونق افروز ہوا اُس نے معماروں فنکاروں کو طلب کیا۔ اُن کے فن کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف کیا۔ انعامات اور نوازشات کا اعلان ہوا۔

پھر ایک دلدوز اعلان کیا گیا۔

زار اِس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ فنکار اپنے فن کے اظہار سے کبھی باز نہیں رہ سکتا۔ اُس کے اندر کی تڑپ اور اپنے ہنر کو نمایاں کرنے کا احساس اُسے نچلا بیٹھنے نہیں دیتا اور زار شاہی نہیں چاہتی کہ کبھی اور کہیں ایسا کوئی شاہکار پھر وجود میں آئے۔

اس لئے اُن کی آنکھیں نکالنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

طاقت اور اقتدار کا نشہ اور خمار بھی کیا چیز ہے۔ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتا۔ کہیں ہاتھ کاٹتا ہے، کہیں آنکھیں پھوڑتا ہے۔ کہیں سالم کا سالم غائب کرتا ہے۔ یہ خود نمائی اور تکبر کے نفسیاتی مریض۔ خدا بننے کے خواہش مند۔

گرجے کے میوزم کی سب سے اہم چیز میرے حساب سے کئی ادوار میں لکھا جانے والا بائبل مقدس کا نسخہ تھا۔ سچی بات ہے تبرکات کی زیارت کرتے ہوئے میرے اندر وہ شوق وجذبہ تو نہیں پیدا ہو سکا تھا جو استنبول کے توپ کپی سرائے میوزیم میں زیارتوں کے چیمبر میں محسوس ہوا تھا۔ تاہم وجود میں عقیدت واحترام کا عنصر ضرور موجود تھا۔

باب

4

ڈالرز کی آبروریزی • کریملن کا گردونواح • زرفشاں کا ملنا

پوشکن سکوائیر • تاورسکایا(Tverskaya)سٹریٹ کی سیر

Насилования Долоров.

Округ Кремлен.

Вистреча Зарфошан

Плошадь Пушкина

Гульяния На Твёрскае Улдьуе

ادھر اُدھر کی تانکا جھانکیوں میں کیتھڈرل کی پشت پر بہتا دریائے ماسکو بھی نظروں میں آ گیا تھا۔ آیا گیا۔ اپنی دلفریبیوں سے آنکھوں میں کھب سا گیا تھا۔ قدرے ڈھلانی سڑک پر چرچ کے اردگرد چکر لگاتے، اُس کے رنگ برنگے چھوٹے بڑے میناروں کو دیکھتے گنتے اور بے حد خوبصورت نجات دہندہ ٹاور (Saviour Clock Tower) پر نصب گھڑیوں، اُس کے اوپری حصے میں گھنٹیوں اور چوٹی پر چمکتے ستارے کو گردن اٹھا اٹھا کر تکتے تکتے میں دریا کی جانب جانے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔

مہرالنساء مچل گئی کہ نہیں وہ گم (Gum) مارکیٹ جائے گی۔

ماسکو جیسے دیو شہر میں اس پہلے دن میں اُس سے الگ ہو کر کسی سیاپے میں نہیں پڑنا چاہتی

تھی۔ دُم ہلاتے اُس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

اس خوبصورت عظیم الشان مارکیٹ کے ایک حصے میں دو کانوں کے آگے بنے تھڑے پر رُکتے ہوئے میں نے اُس کی بناوٹ اور رنگ کو سراہتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

''کسی قیمتی کپڑے میں سیلف پرنٹ جیسے وقار و حُسن والا معاملہ ہے یہاں۔''

ان آف وائٹ رنگ کی عمارتوں کا دُور تک جاتا پھیلاؤ اور کلاسیکل تعمیری سٹائل کتنا متاثر کُن ہے۔ سائن بورڈ بھی کسی رچے بچے گھر گھرانے سے تعلق کا پتہ دیتے تھے۔ کسی ترقی پذیر ملک کی طرح نہیں کہ خودنمائی اور اپنے ہونے کے اظہار کا سارا زور چیختے چنگھاڑتے رنگوں اور تصویروں سے ہو۔

''میرا خیال ہے ہم مزید کرنسی بدلوالیں۔''

مہرالنساء نے چلتے چلتے رُخ بدلا۔ میں تو اُس وقت گم سٹور کی عظیم الشان عمارت کے مطالعہ میں گُم تھی۔

کُشادہ دُکانوں کے دروازے سامنے اور بیک سے کوریڈورز میں کھلتے تھے۔ تیسری رو میں جا کر بینک ملا۔ سوڈالر دیا۔

سیاہ پینٹ کوٹ میں ملبوس لڑکی کا رنگ بلاشبہ سیندور ملے میدے جیسا تھا پر ناک تو پکوڑا سا تھا۔ ماتھا ایسا بڑا میدان کہ چاہو تو گھر بنالو، چاہو تو ٹریکٹر چلالو۔ کس بے اعتنائی سے ہمیں دیکھا اور کس بے رُخی سے ہمارا نوٹ اٹھایا۔ یوں جیسے کمی کمین ہوں۔

نوٹ مشین کے اندر گیا اور پھڑک کر باہر آ گیا۔

نوٹ اُس نے شیشے کی دیوار میں بنے چھوٹے سے قوسی سوراخ سے باہر نکال دیا۔ میں اب حیرت زدہ کھڑی ہوں کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ خرابی کہاں ہے؟

اسی عالم گومگو میں تھی کہ ایک گوری نے آ کر نوٹ اندر کئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ طرز سلوک میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا۔ گورے اور کالے مشرق اور مغرب دونوں دھتکارے کھڑے

تھے۔ اب اُن کے جعلی ہونے کا بھی کوئی چکر نہیں تھا کہ نوٹوں کی صحت وتندرستی کی اچھی طرح جانچ پڑتال ہوئی تھی۔

عُقدہ کھلا کہ میکسیکو کی اُس لڑکی کے ڈالر بہت پرانے تھے۔ میرا اگرچہ نیا تھا پراُس پر منی چینجرز کی چھوٹی سی مہر تھی اور پن کے نشان بھی تھے۔ بیچارہ دو طرح سے داغدار تھا۔

میکسیکن لڑکی نے پاؤں زمین پر مارے اور غصّے سے انگریزی میں بولی۔

''سٹوپڈ۔ کرنسی تو کرنسی ہے۔ اسے نئے پرانے سے کیا؟''

میرے تو اندر ٹھنڈ پڑی تھی۔ کھڑی تماشہ دیکھتی تھی۔ لڑکی نیم ایستادہ چھوٹے سے سوراخ میں منہ گھسائے کھپ رہی تھی اور وہ اندر سکون سے بیٹھی جیسے کہتی ہو۔

''تو آ رہا ہے نا مزہ۔ دنیا بھر میں یہ ہم رُوسی ہی ہیں جو اس ذرا سی بات پر لوگوں کو تگنی کا ناچ نچادیں۔''

میں نے اُس میکسیکن کے ساتھ مل کر خوب پھپھولے پھوڑے۔ پر سچی بات ہے اندر سے میری پھوک نکلی ہوئی تھی کہ اس نئی اُفتاد کا تو سان وگمان بھی نہ تھا۔ اب اگر نوٹ ایسے ہی بیل بوٹوں سے سجے ہوں گے تو بنے گا کیا؟

یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں بیٹھ کر ہم اپنے خفیہ خزانوں سے نوٹ نکال سکتے۔ سوچا شام کو ہوٹل جا کر تفصیلی جائزہ لیا جائے گا، پھر منصور سے بات ہوگی۔

اب یہ میری خواہش تھی کہ ایک بار ہم کریملن کے گرداگرد پورا چکر تو لگائیں۔ دریائے ماسکو کے کنارے کچھ دیر بیٹھیں۔

صد شکر کہ مہرالنساء کا شوق خریداری ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اپنی دلجوئی کرتے ہوئے وہ خود ہی بولی۔

''چلو ابھی تو بسم اللہ ہی ہوئی ہے، دو ہفتے رہنا ہے۔''

ماسکو دریا کے کنارے بیٹھنا، اطراف کی شاندار عمارتوں اور اپنی پشت پر کھڑے عظیم

الشان ''روسیا'' ہوٹل کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے خود سے کہا کہ۔

''کاش ہم کہیں اِس ہوٹل میں ہوتے تو گویا ماسکو کے دل میں ہوتے۔ہمیں تو کہیں اللہ میاں کے پچھواڑے لا پٹخا ہے۔

پھر ہول بھی کھایا کہ اللہ مارا جانے مہنگا کتنا ہوتا۔

چند لمحوں بعد اپنی دلداری بھی کر لی۔

''دفع کرو۔ان کی میٹرو نے تو فاصلوں کی برا چھیں چیر کر نتھ ڈالی ہوئی ہے۔دُوری تو رہی نہیں۔ہوائیں خنک ہیں۔دھوپ کتنی پیاری ہے اور سی سی کرنا کتنا مزہ دے رہا ہے؟غمِ امروز اور فکرِ فردا سے آزاد ہو کر یہاں بیٹھنا بڑا دلچسپ شغل ہے۔''

ہواؤں کے چلنے کا انداز تو ہو بہو شاعر کے اُس شعر

تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے
پائل میں گیت ہیں چھن چھن کے

کا جیسے ترجمان تھا۔

سورج کی کرنیں دریا کے پانیوں کے ہلکے ہلکے مدّ و جزر پر روپہلی کہکشاں جیسا چمکتا ترچھا راستہ کسی دلبر سے عروسی جوڑے کو خوش آمدید کہنے کے لئے بنا رہی تھیں۔پھر چلنا شروع کیا تو صنوبر کے گہرے سبز پیڑ اور طوطے رنگی گھاس کی تازگی نے آنکھوں کو طراوت دی۔کریملن کی سُرخ کنگری دار دیوار اور گہری زہر مہرہ ٹائلوں سے سجے اُونچے نوکیلے بڑے چھوٹے مینار کہیں ستاروں اور کہیں جھنڈوں سے سجے اپنے پس منظر میں فلک بوس عمارتوں کے ساتھ خوبصورت لگتے تھے۔دورویہ سڑک پر دوڑتی گاڑیوں اور Pavement پر چلتے لوگوں پر لطیف سی رائے زنی کرتے ہوئے ساتھ ساتھ آگے آگے بڑھتے جانا بھی مزے کا کام تھا۔ستارے بھی ایک عجوبہ تھے۔ایک ٹن وزنی۔دن کی روشنی میں سنہری اور رات کو یاقوتی چمک والے۔

کریملن اپنی صورت میں کسی حد تک ایک ٹیڑھی میڑھی مثلث کی مانند ہے۔ آغاز کے بُرج اپنے تعمیری رنگ میں کچھ سان واسی لی کے جھروکوں، بُرجوں اور کچھ قبلائی خان کے فصیلوں والے شہر ثائی ٹو کا رنگ لئے ہوئے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئے رُوپ ملتے گئے۔ اب اُس کی دو سمتوں میں سات سات اور ایک سمت میں پانچ منفرد میناروں کو دیکھ کر مجھے امیتابھ بچن پر فلمایا ہوا مشہور زمانہ گیت یاد آ گیا تھا۔

جس کی بیوی لمبی ہو اس کی بھی بڑی شان ہے، موٹی ہو، چھوٹی ہو، دُبلی ہو۔ بس تو یہ مینارے بھی کچھ ایسی ہی خصوصیات کے حامل ہیں ایک اگر نوکیلا ہے تو دوسرا اپھینا، ایک گول مٹول ہے تو دوسرا مستطیل صورت میں پھیلا ہوا۔ بڑی ورائٹی تھی۔ کسی بچے کو جیومیٹری کی اشکال سمجھانی ہوں تو اس کے گرد اگرد ایک چکر لگوا دیا جائے۔ کبھی نہ بھولنے والا سبق یاد ہو گا۔

ہم دونوں نے سڑک پر چلتے چلتے چھوٹے بچوں کی طرح لہک لہک کر ''بیوی والا'' گیت گایا اور لُطف اُٹھایا۔

ماسکو دریا پر ماسکو رٹسکائے (Moskvuret sky) اور کمینی (Kamenny) پُل تعمیراتی انجینئرنگ کا ایک شاہکار نمونہ تھے۔ نیچے سے محراب کی شکل میں اُٹھتے ہوئے اور اُوپر سے کشادہ سڑکوں کی صورت چوراہوں کے دامنوں میں اُترتے تھے۔ اُن کی ریلنگ بھی کیا غضب کی تھی۔ برووِٹسکایا چوک میں تھوڑی دیر بیٹھے، چائے پی۔

بورووِٹسکایا (Borovitskaya) ٹاور سے مڑتے ہوئے ہم بالآخر الیگزینڈر گارڈن پہنچ گئے۔

بھوک اور تھکن نے مت ماردی تھی۔

میکڈونلڈ کے باتھ روم کے سامنے بڑی لمبی قطار تھی۔ دو حرف لعنت کے بھیجتے ہوئے میں کُرسی پر ڈھے گئی۔ جب آدھا برگر کھا لیا تب سوچا کہ گوشت حلال بھی تھا؟

''میرے مولا مردار کھانے کا کب حُکم ہے؟ یقیناً اس سے بدتر صورت تو نہیں ہوگی۔

اس لئے معافی کی طلبگار ہوں۔ معافی کی میرے مولا، معافی کی۔''

تو چلو ایک بار پھر مینز سکوائیر کی خوبصورتیوں میں۔ وہیں کہیں چائے بھی پئیں گے اور ہاں سٹیٹ ہسٹری میوزیم بھی دیکھتے ہیں۔ میں نے تجویز دی۔

مینز سکوائیر کے ماربل کے وسیع و عریض میدان میں گھوڑوں کے سُموں سے بجتا ساز فوراً متوجہ کرتا تھا۔ گرے یونیفارم میں ملبوس ایک خوبصورت جوڑا گھوڑوں کی پشت پر سوار سکوائر کا چکر کاٹتا اور پھر کھڑا ہو جاتا۔ اس عمل کے پس منظر میں بھی یقیناً کوئی روایت ہوگی۔ یقیناً ہوگی۔ ایسے ہی تو ماروماری نہیں ہو رہی تھی۔

قرونِ وسطیٰ کے تعمیری انداز کی یاد تازہ کرتی سٹیٹ میوزیم کی ارغوانی عمارت کے سامنے گرینائٹ کے چبوترے پر کھڑے مارشل جارج زکوو (Zhukov) کے پہلو میں تصویریں بنواتے ہوئے تھوڑی دیر بعد ان آوازوں کو سنتے ہوئے، دیکھتے ہوئے، لُطف اُٹھایا۔

ہسٹری میوزیم کی سیاحت پھر کسی اور وقت پر اُٹھائی۔ جہاں عمارت کا اختتام ہوتا تھا اُس کے ساتھ ہی محرابی صورت دیواروں میں بلند و بالا چوبی دروازوں نے مغل طرز کی یاد دلائی۔ یہاں کتابیں بکتی تھیں۔ گڑیاں بجی تھیں۔ دستکاری کی چیزیں اور سینٹ باسل چرچ کے سونیئرز قطار در قطار سجے تھے اور قیمت پوچھنے پر کانوں کو ہاتھ لگواتے تھے۔

کونے پر دوسری جنگِ عظیم کے کسی جرنیل کا روپ دھارے تمغوں اور میڈلز سے سجا سرخ و سفید رُوسی 100 سو روبل کے عوض اپنے ساتھ تصویر اُتروانے کی دعوت دیتا تھا۔ پچاس روبل پر منانے کی کوشش کی۔ مانا ہی نہیں۔

اپنا مخصوص جملہ۔ ''چلو لعنت بھیجو، گولی مارو'' کہتے ہوئے آگے بڑھی۔ ہم تو جرنیلوں کے ویسے ہی زخم خوردہ ہیں۔

یہ دونوں محرابی دروازوں کے عین درمیان اُس چھوٹے سے سبز حجرہ نما گرجا کے سامنے ایک چوکور حلقے میں مقید ایک دائرہ تھا جس میں دو عورتیں کھڑی تصویریں اُترواتی اور خود پر سے

کو پک پھینکتی تھیں۔اب حیرت زدہ سے کھڑے سوچتے تھے کہ کس کو پکڑیں جو اِس راز سے پردہ اُٹھائے۔ بہتیرا چاہا کہ کوئی تو گھاس ڈال دے پر جو موجود تھے اُن کے تلوں میں تیل نہ تھا۔ سو آگے بڑھ گئے۔

ہم ایک بار پھر ریڈ سکوائر میں تھے۔

یہاں دو حیرتوں سے واسطہ پڑا۔ چوڑے چکلے چہروں والی تین عورتوں نے ہمیں دیکھتے ہی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیری۔ اس مسکراہٹ کے ہم جیسے بھوکے پلک جھپکتے میں اُن پر پل پڑے۔ تینوں مسلمان تھیں۔ تینوں قازق تھیں۔ دو تو پکی پکی تھیں اور ماسکو سیر کے لئے آئی تھیں۔تیسری زرفشاں رُوسی شہری تھی۔اُس کے والدین کوئی چالیس سال پہلے ''الماتا'' سے نقل مکانی کر کے ماسکو آ بسے تھے۔اُس کی پیدائش بھی ماسکو کی تھی۔ بیاہ بھی یہیں مقیم کرغیزی فیملی میں ہوا تھا۔ دوسری دونوں میں سے ایک نرگس اور دوسری نگار تھی۔ بڑی ہی کھلی ڈلی، بے تکلف اور فوراً گھل مل جانے والی لڑکیاں تھیں۔ انگریزی بولتی تھیں۔ ہائے میرے مولا قربان ہونے کو جی چاہتا تھا۔ پہلے تو محبت بھری تصاویر بنوائیں پھر باتیں شروع کیں۔ میں نے میز سکوائیر والے راز کے متعلق پوچھا۔ بے چینی لگی ہوئی تھی۔

لیجیے پردے اُٹھ گئے تھے۔ پتہ چلا تھا کہ ماسکو شہر کی اطراف میں نکلنے والے راستوں کے فاصلوں کا تعین اس جگہ سے ہوتا ہے۔

ماسکو کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔شہر کا مرکزی حصہ مِن وعَن سورج کی طرح گول ہے۔اس کے سارے مضافاتی راستے سورج کی کرنوں کی طرح پھوٹتے ہیں۔ ماسکو کسی منصوبے کے تحت نہیں بنا۔لوگ اسے پھیلاتے گئے۔اور یہ پھیلتا گیا۔ جنگل کٹتے گئے اور آبادیاں بنتی گئیں۔

میں نے زرفشاں سے کہا کہ میرے خیال میں اس کے نیچے میٹرو کا مرکزی سٹیشن ہے۔تو اس پر اُس کا لاعلمی والا جواب تھا۔

اب اللہ جانے میرا یہ قیاس درست تھا یا نہیں۔

میری نظروں کے عین سامنے ایک نوان نکور لشکتا مشکتا گرجا تھا۔ جس کے پاس ہی ایک موٹی سی عورت مائیک ہاتھ میں پکڑے خطابت کے جوہر دکھاتی تھی۔ یہ کانوں کے پردے پھاڑتی آواز تھی۔ خواتین سے پوچھا کہ بیچاری ہلکان ہوئے جاتی ہے، کسی امداد کی طالب ہے کیا؟

''ارے نہیں ماسکو کی سیاحت کے لئے ترغیب دے رہی ہے کہ آؤ ٹکٹ خریدو اور چلو میرے ساتھ۔'' زرفشاں نے بتایا تھا۔

تو سوچا کہ پھر چلتے ہیں۔ بس میں بیٹھ کر شہر کا نظارہ کرنے کا بھی ایک اپنا مزہ ہے۔ استنبول میں پہلے دن میں ٹرام سے نہیں اُترتی تھی۔ مسلسل پانچ چکروں میں اچھی خاصی شناسائی ہوگئی تھی۔ سیما پیروز کلستی تھی۔

''کمبخت نہ اتنی آپ پھدری بن۔ اجنبی ملک ہے کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑجائیں۔''

میں اُس کی ایک نہ سنتی تھی۔

''گھبراؤ نہیں سیما دیکھتی جاؤ۔ شہر سے آشنائی کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے۔''

اور اب ماسکو میں بھی میرا یہی کرنے کا پروگرام تھا۔

دفعتاً میں نے سوچا کہ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے کہ اگر میں اُن سے پوچھ لوں۔

کہ کیا وہ شہر کی سیر کے لئے ہمیں بھی اپنے ساتھ نتھی کرسکتی ہیں۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو کہ چلو کچھ پلّے ہی پڑ جائے گا۔

تو بڑی عاجزی اور بڑے منّت بھرے لہجے میں درخواست گوش گذار کی۔

''آپ کا یقیناً یہ احسان عظیم ہوگا اور یہ خیال تو ہرگز ہرگز دل میں نہ لائیے گا کہ کہیں ہم اپنے حکمرانوں کی طرح دوسروں کے پیسوں پر موجیں اُڑانے والے لوگ ہیں۔ ہمیں تو بس آپ کا ساتھ چاہیے۔ روٹی پانی اور کرایہ بھاڑا سب اپنا اپنا۔''

لیجئے بڑی ہنسی خوشی درخواست کو پذیرائی مل گئی۔

ہمارے تو من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ یوں اُچھلتے کودتے اُن کے ساتھ چل رہے تھے کہ جیسے خزانہ مل گیا ہو۔ ریڈ سکوائیر سے ہم سیدھے اخوتنی ریاد (Okhotny Ryad) میں آئے۔

کسی چھل چھبیلی بانکی نار جیسی بس آ کر ہمارے پاس رُک گئی۔ سوار ہوئے۔ اُن تینوں کے پاس میگنٹ لائن والے کارڈ تھے۔ اُنہوں نے باری باری کارڈوں کو سپیشل ٹرنسٹائلز (Turnstiles) کے ساتھ مَس کیا۔ کھل جا سم سم والی صورت ہوئی۔ ٹھک سے آہنی راستہ کھلا اور وہ اندر۔ ہم نے ٹکٹ خریدے پھر کہیں جا کر نشستوں پر بیٹھنا نصیب ہوا۔ سیٹیں اتنی آرام دہ کہ مزا آ گیا۔

یہ ماسکو کی سب سے بڑی اور سب سے اہم شاہراہ تاورسکایا (Tverskaya Street) ہے۔

میں بھی کیسی احمق اور فضول عورت ہوں۔ مقابلوں اور تقابلوں میں فوراً اُلجھ جاتی ہوں ہر اچھی چیز کو بھوکوں کی طرح اپنے ملک کے لئے چاہنے لگتی ہوں۔ وقت کے درمیانی فاصلوں اور لوگوں کی جدوجہد کو بھول جاتی ہوں۔

تو یہ ویسی ہی ہے جیسی لاہور کی مال روڈ۔ پر دونوں میں کیسا زمین آسمان کا فرق تھا۔ سوویت زمانوں میں یہ گورکی سٹریٹ کہلاتی تھی۔ تارکول لشکارے مارتا تھا اور فٹ پاتھ قابل رشک حد تک چوڑے تھے اور کناروں پر لائم کے درختوں کی بہار تھی۔

سچی بات ہے عمارتوں کی اُٹھان، اُن کا جوبن، اُن کا رنگ وروپ، اُن کی قامت وبناوٹ سبھی عناصر ایسے تھے کہ جنہوں نے اگر تاورسکایا سٹریٹ کو ماسکو کی شان بنا رکھا تھا تو وہیں سیاحوں کی بھی آنکھیں پھٹتی تھیں۔ ایوان پارلیمنٹ، میئر آفس، مرکزی تار گھر، سفید ستونوں پر کھڑی سُرخ رنگی سٹی کونسل کی عمارت جس کے عین سامنے ماسکو کے خالق یوری

ڈولگورکی (Yury Dolgoruky) کا گھوڑے پر سوار مجسمہ اور موتی اُچھالتے فوارے اور تالاب کیسی کمال کی چیزیں تھیں کہ جنہوں نے شاہراہ کو حُسن و جمال کا پیرہن پہنا دیا تھا۔

زرفشاں کی رننگ کمنٹری جاری تھی۔ اور جب یوری ڈولگورکی کی بات ہوتی تھی مہرالنساء نے کہا۔

''صدیوں پہلے کے اِس بندے کو سترھویں اٹھارویں صدی کا جنگی لباس پہنانے کی ضرورت کیا تھی۔ آخر بارھویں صدی میں لوگ ننگے تو پھرتے نہیں ہوں گے۔ کچھ پہنتے ہی ہوں گے نا۔ اسے بھی وہ ہی پہنانا چاہیے تھا۔''

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

''مہرالنساء، ماسکو سٹی کونسل کو تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہیے تھیں۔''

بیشتر عمارتوں کے اوپر رہائشی فلیٹ تھے۔ نیچے لمبی کھڑکیوں والی خوبصورت دُکانیں تھیں۔ کتابوں کی، گارمنٹس کی، کھانے پینے کی۔

چڑھائی شروع ہوگئی تھی۔ پر بس کی سبک خرامی میں ذرہ بھر فرق نہ تھا۔ مجال تھا جو کہیں خفیف سا بھی احساس ہو۔

زرفشاں نے بتایا تھا یہ ماسکو کی Tverskaya hill ہے۔

پُشکن سکوائیر پر وہ اُتریں تو ہم بھی اُن کے ساتھ ہی اُتر گئے۔ اگر وہ نہ اُترتیں تو پھر کسی اور دن یا واپسی پر ہمیں یہاں ضرور اُترنا تھا۔

گرینائٹ کے چبوترے پر میرا شاعر کھڑا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ کو کوٹ سٹائل کی شارٹ جیکٹ میں گھسیڑے۔ اپنے قدموں میں کسی عاشق کے دھرے پھولوں کو تکتے، سائکش پر والے قلم اور دوات کو دیکھتے۔

اور اُس کی نظم کا وہ مصرعہ یادگار پر لکھا ہوا اُس کے اعتماد کی گواہی دیتا تھا۔

''کہ مجھ تک آنے والے راستے پر کبھی گھاس نہیں اُگے گی۔''

یہ مصرع اُس کی کس نظم کا تھا۔ سوفی صدیقین سے تونہیں پر "The Poet" گمان تلے آتا تھا۔

وہ تینوں اور اُن کے ساتھ مہر النساء بھی خریداری کے موڈ میں تھیں اور میں پُشکن کے ساتھ تھوڑی سی قربت کے موڈ میں۔ طے یہی پایا کہ دو گھنٹے بعد یہیں اکٹھے ہونا ہے۔

سرِ چراغاں کے گول چبوترے پر بیٹھ کر میں نے ذرا ٹیک لگائی اور اپنے آپ سے کہا۔

تو چند لمحوں کے لئے وہاں چلو نا۔ وقت کی اُس ٹنل میں جب اِس چوک میں لوگوں کا ایک سیلاب تھا۔ اُس سے محبت کرنے والوں، اُسے چاہنے والوں کا۔ جنہوں نے پیسہ اکٹھا کیا۔ یادگار بنائی۔ اور نقاب کشائی کے لئے پورے رُوس کے ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کیا۔

''بھلا ٹالسٹائی نے کیوں انکار کیا تھا آنے سے؟''

اب اگر یہاں پُشکن نہ ہوتا تو میں نے کب اُترنا تھا اور اگر اُترتی بھی تو یہاں زمین پر کیوں بیٹھتی؟ اُس کے قدموں میں۔ مجھے بھی تو دامن بھرنا ہے کچھ چشم دید موتیوں سے کہ دُور دیسوں میں رہنے والے علم دوست لوگوں کو جو اُس سے محبت کرتے ہیں جا کر کچھ بتا تو سکوں کہ میں نے اُسے کہاں کہاں دیکھا؟

اُٹھنے سے قبل میں نے اُسے دیکھتے ہوئے یہ بھی کہا۔

''اپنی شاعری کو پڑھنے کی خواہش ''تونگوس'' اور ''ایوینک'' کے لئے ہی کیوں رکھی۔ جہان دیوانہ ہے تمہارا۔''

چاروں جب واپس آئیں، چاروں کے ہاتھ خالی تھے۔ مہر النساء تو ناک بھوں چڑھاتی تھی۔

''ہمارا ملک تو بہت سستا ہے۔ یہاں تو آگ لگی ہوئی ہے اور دفع کرو چیز بھی تو کوئی کام کی نہیں۔''

بیچاری کو مصر یاد آ رہا تھا۔ کتنے ڈھیروں ڈھیر سوئیرز اور دیگر چیزوں کی خریداری کی تھی۔

درختوں اور رنگین چھتریوں تلے خوردونوش کا سلسلہ ہمیں بھی ترغیب دیتا تھا۔

مجھے نہیں پتہ کہ کافی کے گلاس ہاتھ میں پکڑے اُن کے کیا جذبات تھے پر میں جو چائے پیتی تھی اور جس ماحول میں سانس لیتی تھی اور اپنے اردگرد کی چیزوں کو بچوں جیسے اشتیاق بھرے تجسس سے دیکھتی اور محظوظ ہوتی تھی۔

اس چوک کا میکڈونلڈ بھی بڑا اہم تھا کہ گینز بک آف ریکارڈ میں درج تھا کہ اپنے افتتاحی دن اس کے سامنے لگنے والی قطار میکڈونلڈ کی تاریخ کی لمبی ترین لائن تھی اور گویا کیمونسٹ کے سیدھے سادے لوگوں کو فاسٹ فوڈ کے مزے چکھانے امریکہ میکڈونلڈ کے گھوڑے پر سوار کیپٹلزم کی بنیادیں رکھنے آ موجود ہوا۔ کیا بات تھی۔ امریکیوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

وہ اب رُخصت ہونا چاہتی تھیں۔ میں نے بھی سوچا اتنا ہی غنیمت ہے۔ اب لسوڑے کی لیس نہیں بنتا کہ بیچاریاں سوچیں پاکستانی کمبل تو انہیں چمٹ ہی گیا ہے۔ بہرحال میں نے اُن سے مزید جانکاری لی۔ زرفشاں کی یہ بات بھی غور سے سُنی کہ یہاں پاس ہی بائیں طرف انقلابی تاریخ کا میوزیم جس کا نام Museum of Contemporary History of Russia ہے۔ اُسے دیکھنا نہ بھولنا۔ بس تو راستے جدا ہوئے۔

میں کتابیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مہر النساء سے پوچھا کہ اگر وہ کچھ دیر ستانا چاہتی ہے تو یہیں بیٹھے، میں ذرا اردگرد کو دیکھ لوں۔

بک شاپ تھی یا کتاب محل تھا۔ اس قدر بڑی اور خوبصورت۔ کتابوں کی خوب پھولا پھرولی کی۔ دو خریدیں۔ عمارتوں کے حُسن کی انفرادیت کو باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔

جب واپس آئی اور مہر النساء سے میوزیم کے لئے کہا تو وہ بولی۔

میرا خیال ہے کچھ کھانا چاہیے۔

واپس آ کر۔

میوزیم پاس ہی تھا۔ عمارت کی شاہانہ عظمت اور ارسٹوکریسی کا پَرتو اُس کے چہرے

مہرے پر کندہ ہوا پڑا تھا۔ لوہے کا جنگلہ پھاٹک پر شیر اور بے حد خوبصورت گول ستون سب کا دیکھنے سے تعلق تھا۔

یہ اوران جیسے اور بہت سارے ماسکو کے امراء شرفاء کے گھر تھے۔ جب انقلاب آیا اُن کے مکین یا باہر بھاگ گئے، یا قتل ہوگئے۔ اس گھر پر تو فوری طور پر سُرخ جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ انقلابی حکومت نے ایسی عمارتوں جو تعمیر اور تاریخ کے حوالے سے اہم تھیں ان کی حفاظت کی۔ ان کی بیرونی وضع قطع کو اُسی انداز میں محفوظ رکھتے ہوئے اندر حسب حال تبدیلیاں کیں۔ تو یہ گھر جو کبھی ماسکو کی ایلیٹ کلاس کا انگلش کلب تھا۔ اب تین تہذیبوں کی نمائندگی کا بار امانت اٹھائے کھڑا ہے۔ پر اندر داخل ہونے سے قبل مہر النساء نے کہا۔

''میں کچھ بولی نہیں تھی۔ چُپ چپاتے تمہارے ساتھ چلی آئی۔ پر پلیز مجھے بھوک ستا رہی ہے۔ تم نے یہاں تاریخ میں گُم نہیں ہو جانا۔''

اور جب میں نے اُس کے وسیع وعریض کمروں میں گھومنا شروع کیا اور بڑے بڑے ہالوں کی دیواروں پر انقلاب کی تاریخ پڑھنے میں مصروف ہونے کی کوشش کی مجھے احساس ہوا کہ ان پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا ہے۔

''مجھے بھوک ستا رہی ہے۔ پلیز تاریخ میں نہ اُلجھ جانا۔''

''انشاء اللہ دوبارہ یہاں آؤں گی۔'' کہتے ہوئے میں نے اپنی نوٹ بک بند کی واپسی کے لئے قدم اٹھائے۔ مرکزی ہال کے ایک جانب دھرے صوفے پر مہر النساء اسی جگہ بیٹھی تھی جہاں اُس سے ملنے کا طے ہوا تھا۔

نہ اُس نے کوئی بات کی اور نہ میں نے یہ جتانے کی کہ جب وہ اتنی بھوکی تھی تو پشکن سکوائیر سے چلی ہی کیوں۔ بھلا ٹکٹوں پر پیسے ضائع کرنے کی کوئی ضرورت تھی۔

پشکن سکوائیر میں ہم نے سمورگیس بورڈ (Smorgasbord) کھانے کا سوچا۔ یہ ہمیں زرفشاں بتا گئی تھی کہ یہ سستا ترین بزنس لنچ ہے۔

بہرحال فاسٹ اینڈ چیپ پر اُس کے ملنے کی خوش خبری ملی۔ آرڈر دیا۔

ویٹر نے کچھ پوچھا "Set meal" جیسے لفظ بولے۔ کچھ پلّے نہیں پڑا۔

''اب جو ہم نے بولا ہے یہ دے دو۔ کھے ہے سواہ ہے۔ من وسلویٰ ہے۔ جو کچھ بھی ہے۔'' اب ٹرے میں جو آیا۔ وہ سلاد تھا۔ ہاٹ سنیکس تھے۔

بہرحال کولڈ ڈرنکو کے ساتھ کھایا۔ جو کچھ بھی تھا شکر ادا کیا۔

سڑک پر جہاں ہم اُترے تھے وہیں جا کھڑے ہوئے اور جو بس ملی اُس میں چڑھ گئے۔ جاہلوں اور اندھوں کی طرح کہ یہ کہاں جا رہی ہے؟ اب بس میں پوچھا جا رہا ہے کہ جانا کہاں ہے؟ رُوسی زبان میں استفسار قطعی پلّے نہیں پڑ رہا ہے۔ ہمیں تو بس سیر کرنی تھی اور واپس آنا تھا کوئی گھر گھاٹ تھا ہمارا جو بتاتے۔ آخری حصہ نقشہ پر بھی نہیں تھا۔ نقشے پر کیا دکھاتے سارا معاملہ اللہ توکل ہی تو تھا۔ لاسٹ سٹیشن کی تکرار کی۔ ڈرائیور نے پاگل جان کر ٹکٹ دیئے کہ خود ہی بھگتیں گی۔

مایاکوفسکی چوک پر اُترنا چاہا۔ پر میں رُک گئی۔ اتنی بڑی سڑکیں کہ بندے کی تو آنکھیں پھٹ پھٹ جائیں۔ دائیں بائیں راستوں کو کاٹتی ہوئیں، درختوں کے ہجوم، فلک بوس عمارتوں کی یلغار اور گاڑیوں کا طوفان۔

لاکھ میں نے زرفشاں سے راستے کا سبق پڑھا تھا۔ بے شک اُس نے بتایا تھا کہ بس نے سیدھے جانا ہے۔ بیلوروسکایا اسٹیشن سے پھر سیدھی جہاں اس کا نام لیننن گراڈ سکایا ہو جاتا ہے۔ ائیر پورٹ اُس کی آخری منزل ہے۔ وہاں سے واپسی۔

لیکن اس اتنی رنگارنگی اور وسعت نے گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔

لوگ چڑھتے اُترتے۔ کسی کو ہم دو اجنبی عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک نظر ہم پر ضرور ڈالتے اور پھر بے اعتنائی سے دوسری طرف دیکھنے لگ جاتے۔ پتہ نہیں ہونٹوں پر اتنا سناٹا کیوں تھا اور آنکھوں میں اتنی بے گانگی کا ہے کو تھی۔ آخر کو انسان تھے ہم۔ ایک چھوٹی سی مسکراہٹ کے تو حق دار تھے نا۔

اب لاکھ دل کو تسلی دیتی کہ حوصلہ رکھ۔ پر گھبراہٹ تھی کہ راستوں کے غیر معمولی پھیلاؤ، درختوں، عمارتوں اور جنگلوں پر سے تیرتی ہوئی پاس آ کر بلا وجہ ہی سارے وجود پر طاری ہوئی جاتی تھی۔

پھر ایک سٹاپ سے ایک بوڑھا آدمی سوار ہوا۔ عجیب قسم کا ٹوپ پہنے ہوئے۔ پر اس قحط المسکراہٹ والے ماحول میں وہ سراپا مسکراہٹ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نرمی اور شفقت کا عکس تھا۔ چہرے کی جھریوں میں ہنسی تھی۔ اور ٹوٹے پھوٹے دانتوں میں تین سونے کے دانت چمکتے تھے۔ وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھا تھا۔

اُس کی مسکراہٹ نے مجھے شہ دی تھی۔ میں نے اُس کے سر پر اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ استفہامیہ انداز میں لہرایا۔

استراخان ہیٹ۔

اُس کے ہونٹوں کے کنارے اُس کے کانوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

اسٹیڈیم بھی دیکھنے کو ملا۔

بس یارڈ میں رُکی۔ خاتون ڈرائیور نے ہم سے پھر پوچھا۔ کیا پوچھا؟ مجھے معلوم نہیں۔ اب میں نے نقشہ نکال کر اخوتنی ریاد (Okhotny Ryad) پر اُنگلی رکھ دی۔

اُس نے دیکھا۔ میں نے کریملن کہا۔ کرسنایا پلوشد کہا۔ اُس نے سر ہلایا اور چُپ چاپ نیچے اُتر گئی۔

اور جب واپسی ہوئی جیسے جیسے مانوس راستے آتے گئے۔ ہماری چونچالی اور سرشاری بڑھتی گئی اور جب مقررہ جگہ پر اُترے۔ خدایا ہمارا مُو مُو مسرت و شادمانی کی لہروں میں ہچکولے کھا رہا تھا۔

ایسا سستا اور معلوماتی ٹرپ۔

گویا ہم نے اشرفیاں کوئلوں کے بھاؤ لوٹی تھیں۔ اور گویا ہم نے جہاں سر کیا تھا۔

باب

5

ایک خون آلود سہ پہر

Один Кровны Вечарь

سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہوئی تھی۔ تین گھنٹوں میں قیامت ہی تو گزر گئی۔ شام کو منصور کے ہاں جانا تھا۔ سوچا چلتے ہیں۔ تھوڑا آرام بھی کر لیں گے اور تیار بھی ہو جائیں گے۔ میٹرو سٹیشن سے باہر آئے۔ چلتے چلتے دفعتاً مہر النساء نے کہا۔

''میرے دانتوں سے خون آ رہا ہے۔''

میں ذرا دو قدم آگے تھی۔ اس کی بات پر فوراً پلٹی، تشویش بھرے لہجے میں میرا پہلا جملہ تھا۔

''کہیں تھوکو ذرا۔ دیکھوں تو۔''

اُس نے وسیع و عریض میدان کے ایک ایسے کونے کی طرف بڑھتے ہوئے جہاں تھوکنا معیوب نہیں لگتا تھا۔ جا کر تھوکا، اور میں نے اُسے دیکھا۔ یہ پانی اور لہو کا ملا جلا آمیزہ سا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ ابھی ہوٹل چل کر غرارے کرنا۔ میں نے تسلی دی۔''

کمرے میں آ کر وہ واش روم میں گئی اور میں بیڈ پر لیٹ گئی۔

تھکے ہوئے ہونے کے باعث یونہی میں غنودگی میں چلی گئی۔ تبھی جیسے اُس کی پریشان کُن آواز نے مجھے اٹھا کر بٹھادیا۔

''دیکھونا یہ کیا ہے؟''اُس نے کوٹن کا سرخ تازہ خون میں لتھڑا ہوا ٹکڑا مجھے دکھایا۔

گھبرا کر میں اُٹھی اور اُسے واش روم لے گئی اور وہاں جو منظر میں نے دیکھا وہ میرے حواس اڑانے کو کافی تھا۔ جیتا جاگتا سرخ خون اور منہ بھر کر۔

کمرے میں آ کر میں نے جوتی پہنی۔ اُسے پہننے کو کہا۔ لاک لگایا۔ آفس میں آئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھی تین عورتوں نے یہ سب دیکھا۔ کہیں کوئی گھبراہٹ، کوئی پریشانی، کسی امر کی کوئی تشویش، ہر تاثر سے عاری سپاٹ چہرے۔ آگے بڑھ کر دیکھنے، کچھ پوچھنے، زبان سے تو خیر کیا کہنا تھا۔ باڈی جسچر سے ہی تسلی دینے کی کوئی کوشش۔ کچھ بھی نہیں۔ یوں نارمل پُرسکون جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

میں ذرا غصے سے کہتی ہوں کہ وہ ہمیں ڈینٹسٹ کا پتہ دیں۔

ایک نے بڑی کوفت اور بیزارگی سے ادھر اُدھر ہاتھ مارا۔ پھر فون پر مصروف ہوئی۔ پھر ساتھیوں سے کچھ بات چیت کی۔

بارے خدا ایک کارڈ ہمیں پکڑایا گیا۔ مہرالنساء کا ہاتھ تھام کر میں اُسے باہر سڑک پر لے آئی۔

راہ گیر دیکھتے ہیں۔ ایک نظر ڈالتے ہیں اور اپنا راستہ لیتے ہیں۔

''پروردگار اتنی بے اعتنائی۔'' ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ شُوں کر کے پاس سے گزر گئی۔ دوسری کو روکا۔ نہیں رُکی۔ تو اب کون سا حربہ اپناؤں۔ میرا خود سے سوال تھا۔ بس تو اسفالٹ کی کشادہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہوگئی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ اور اونچے اونچے چلائی۔

''پوموگائٹ۔ پوموگائٹ (مدد۔ مدد)۔''

ٹیکسی رُک گئی۔ کنارے پر آئی۔ میں نے کارڈ دکھایا۔ مہرالنساء کی طرف اشارہ کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور لڑکا سا تھا۔ ملگجے کپڑوں، اُلجھے ہوئے بالوں اور چہرے پر نرمی اور ملائمت کے احساس کی پھوار سی بکھیرے ہوئے۔

باہر آسمان کس قدر نیلا کچور تھا۔ دھوپ کیسی سہانی تھی۔ ہواؤں میں خنکی تھی۔ داہنے ہاتھ عمارتوں کا جنگل تھا۔ بائیں ہاتھ ہریالی کا جنگل تھا۔ پر منظروں کا سارا حُسن افسردگی اور پریشانی میں ڈوب گیا تھا۔ بہت سارے موڑ کٹے پھر ایک چھوٹے سے سرسبز میدان کی ایک سمت ایک بلند و بالا عمارت کے زمینی فلور پر ایک ڈینٹسٹ کلینک میں داخلہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے تین کمروں والا کلینک۔

ڈاکٹر ندارد۔ دُبلی پتلی چھوٹے سے قد کی نرس نما لڑکی نے مہر النساء کا خون آلودہ منہ دیکھ کر پتہ نہیں ٹیکسی ڈرائیور سے کیا کہا۔

اُس نے ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔

گاڑی میں بیٹھے، ایک بار پھر اونچی اونچی عمارتیں تھی اور سڑکیں تھیں۔ کاٹن کا آدھا رول خون میں لتھڑ چکا تھا۔

''کیا کوئی گلے میں پھوڑا تھا جو پھٹ گیا ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''پروردگار رحم۔ پردیس میں ہیں۔''

کسی کی مدد نہیں چاہیے بجز تیرے۔ فاروق کو بھی اطلاع نہیں کرنا چاہتی۔ اس کے باپ نے اسی لئے تو پلہ نہیں پکڑایا تھا کہ میرے بیٹوں کو یہ عورت کہیں پریشان نہ کرے۔ منصور سے بھی کچھ نہیں کہنا۔ کیا سوچے گا؟

مہر النساء پتھر کی طرح خاموش تھی۔ پھر اس میں حرکت ہوئی۔ اُس نے بیگ کی اندرونی جیب کو کھولا۔ ڈالروں والا لفافہ نکالا۔ اُسے میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔

''شاید یہ میرا وقتِ آخر ہے۔ اسے سنبھال لو۔''

آنسوؤں کا ایک طوفان تھا جو میری آنکھوں سے پھوٹ نکلا۔

''حوصلہ رکھو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

دس جگہ ٹیکسی ڈرائیور نے رُک رُک کر پوچھا۔ میں تو یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ان کے ہسپتال کہاں ہیں؟ اور ٹیکسی ڈرائیور کو کیوں نہیں پتہ؟ آخر ایک بڑی سی عمارت کے سامنے رُکے۔

یہ اسپتال ہے؟ میں نے خود سے پوچھا۔ پھر ٹیکسی ڈرائیور سے سوال ہوا۔ کس قدر سناٹا؟ کتنی خاموشی؟ کیا اسپتال ایسے ہوتے ہیں؟ سنسان سے لمبے چوڑے ہال کے آخری سرے پر تین عورتیں اور دو مرد بیٹھے باتیں کرتے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا۔ بھرائی ہوئی آواز میں میں نے بھی کچھ کہنے کی کوشش کی۔

اور آل میں ملبوس ایک دراز قامت بے حد خوبصورت خاتون فوراً اُٹھی۔ اُس نے کہیں فون کیا۔ اور پھر ہمیں ساتھ لے کر عمارت سے باہر نکل آئی۔ کوئی سوگز پر مین سڑک سے ملحقہ سب لین پر وہ ہمارے ساتھ کھڑی پھر کسی سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔

میں مہر النساء کو تسلی آمیز لفظوں سے بہلا رہی تھی۔ آنکھوں سے حوصلہ دیتی تھی۔ پر خود میرے اندر کی کیا حالت تھی یہ میرا خدا جانتا تھا۔

کوئی دس منٹ بعد ایک بڑی سی ایمبولینس آئی۔ دراز قد نوجوان خوبصورت سی ڈاکٹر اور دو اس کی اسسٹنٹ اُتریں۔ مہر النساء کو دیکھا۔ سڑک پار سٹور سے کھارے پانی کی بوتل منگوائی۔ سڑک سے ملحقہ گرین بیلٹ کے آخری کونے پر مہر النساء کو لے کر جا کر غرارے کروانے شروع کیے۔

اُس ڈاکٹر کے پاس کوئی جادو تھا۔ پانی میں کوئی ایسی خاصیت تھی یا پھر ہماری بے بسی پر قدرت کو رحم آ گیا تھا۔ ان تینوں امکانات میں سے جس پر میرا دل ٹُھکتا اور گواہی دیتا تھا۔ وہ خدا کی مہربانی تھی کہ خون آلودہ ٹکڑوں سے بھرا ہوا شاپر جو میں نے چپکے سے جھاڑیوں کے پیچھے پھینکا

تھا کہ مجھے کوئی ڈسٹ بن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُسے اگر نچوڑ دیتی تو چائے کے بڑے مگ کا بھر جانا لازمی تھا۔

پندرہ منٹ میں دو بوتلوں کا پانی غراروں کی صورت زمین پر بہنے کے بعد خون بند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر بمعہ اپنی نرسوں کے جا چکی تھی۔ اُس مہربان عورت یا ڈاکٹر جو بھی وہ تھی کا شکریہ ادا کیا۔ واپسی سے قبل مہرالنساء نے اُس پانی کی مزید بوتلیں خریدنے کے لئے کہا۔

سڑک پار ہی تو شاپ تھی۔ میں خود ہی بھاگ کر چلی گئی تھی۔ اندر داخل ہوئی تو سامنے جس سے ٹکراؤ ہوا وہ پونے چھ فٹی قامت کا ایک خوش شکل لڑکا تھا جس نے دروازے میں سے داخل ہوتی عورت کو جس انداز میں دیکھا اس میں کچھ تھا۔ اپنایت کا احساس یا مانوسیت کی چمک۔

بوتلیں خرید کر جب میں مڑنے لگی۔ اُس نے یکدم اپنی ساتھی لڑکی سے باتیں بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھا کہ جیسے وہ مجھ سے کچھ جاننے کا خواہش مند تھا۔

میں نے اپنے بارے میں بتایا۔ خود وہ محسن تھا۔ سری نگر کا محسن۔ جس نے دکان کے شیشوں میں سے سڑک کے پار کی ساری کارروائی کو دیکھا تھا اور مجھ سے جاننا چاہتا تھا۔ ساری تفصیل سن چکنے پر اُس نے فوراً کہا۔

03 پر فون کر دیتیں۔ جگہ بتاتیں۔ فسٹ ایڈ موبائل سروس فوراً ہوٹل کے دروازے پر پہنچ جاتی۔

یہ تو ہوٹل والوں کا اخلاقی اور پیشہ ورانہ فرض تھا۔ اُن کے طرزِ عمل پر تو مجھے افسوس کیا دُکھ ہے۔

محسن نے تسلی آمیز انداز میں کہ جیسے ایسی باتیں روٹین کا حصہ ہوں۔ کہا۔

"مسلسل بندشوں میں جکڑے رہنے کے بعد یہ ابھی تو اپنے ڈربوں سے نکل رہے ہیں۔ سیاحت کے طور طریقوں، اُس کے پروفیشنل بین الاقوامی ضابطوں، اس کے تقاضوں اور اُس کی سائنسی اپروچ سے ان کی ابھی اتنی آگاہی کہاں ہے؟ بہرحال تبدیلی کا عمل سرعت سے

جاری ہے۔ جبر کے مارے ہوئے ٹھنڈے ٹھار لوگ گرم ہوتے ہوتے وقت لیں گے۔''

اُس نے اپنا موبائل نمبر دیا۔ کوئی مسئلہ ہو بتائیے گا۔ ہاں ڈینٹسٹ کا نمبر 2519839 لکھ لیجئے۔ راؤنڈ دی کلاک ان کی خدمات ہیں۔

شکریہ ادا کر کے جب باہر نکلی تو مانو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ یعنی اِن ہوٹل والوں کی اتنی بے نیازی اور بے حسی۔ اور جب میں ٹیکسی میں بیٹھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے واپس جا کر اُن عورتوں سے بات کرنی ہے۔ صبح برازیلی عورت کے طرزِ عمل نے بھی سوچ کو تقویت دی تھی۔ اُس کا لال بھبھوکا چہرہ اور بوڑھیوں پر برسنا سب مجھے حوصلہ دے رہے تھے۔

اور ٹیکسی سے اُتر کر مہر النساء کو وہیں انٹرنس میں دھرے بینچ پر بٹھا کر میں آفس میں جانے لگی۔ مہر النساء نے مجھے روکا۔

''دفع کرو۔ کیا اُلجھنا؟ خدا کا شکر ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔''

''ہرگز نہیں۔ اُنہیں معلوم ہونا چاہیے۔ جانے کون سے خول چڑھائے بیٹھی ہیں۔''

''سنیں۔''

میں نے آواز کو قصداً اُونچا کیا تھا۔

اور وہ میری طرف متوجہ ہوئیں۔

''مانا ہم رُوسی نہیں ہیں۔ پر انسان تو ہیں۔ آپ کے ملک آئے ہیں۔ اِسے دیکھنے اور آپ لوگوں سے ملنے۔ یہ شرم کا مقام ہے کہ تین گھنٹوں کی شدید ذہنی اذیت اور ڈھائی ہزار روبل کے خرچے سے جس مفت علاج نے پانچ منٹ میں مریضہ کو ٹھیک کر دیا وہ آپ کی ذرا سی توجہ سے ہمیں یہیں حاصل ہو سکتا تھا۔

افسوس صد افسوس۔''

باب
6

انتونینا کا گھر • پاکستانی بہو کے ساتھ ایک نشست

ہتھوڑا اور درانتی کا صفایا • سائبیریا کے شہر کیمیروا کی دلکش یادیں

بارہویں صدی کے شہزادے ولادی میر کا اسلام کی طرف جھکاؤ

Дом Антоненко.

гостиная с Пакистанскы Невесткои

Разрушёние Серл И Молом̅

Прикрасны ВсПоминания Сиберски Места Камеровки.

Наклененеие сынь шаха владимира строну ислама в 12 ВЕКЕ.

بلند و بالا عمارتوں کے جیسے خودرو جنگل میں اسفالٹ کی کشادہ سڑکوں پر گاڑی بھاگی جاتی تھی ششوسکایا (Sushchyovsky) مرکزی شاہراہ سے گاڑی ایک چھوٹی بغلی سڑک پر مڑی اوریم سکایا سڑک پر تھوڑا سا چلنے کے بعد ایک وسیع و عریض میدان کے گرداگرد فلیٹوں میں سے ایک کے سامنے رُک گئی۔

رُوسیوں کی اکثریت آؤٹ سکرٹز (Skirts) علاقوں کی مکین ہے۔ مرکزی حصوں میں

رہائش رکھنا ممکن ہی نہیں کہ وہ سب کاروباری اور دفتری جگہیں ہیں جن کے کرائے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔

لفٹ میں سوار ہونے، راہداری میں آنے اور دروازے تک پہنچنے کے وقفے میں منصور نے ہمیں معلومات دیں۔ دروازہ جس نے کھولا وہ بدرنگے سے سنہری بالوں اور نتھری ہوئی آنکھوں والا اُدھیڑ عمر آدمی تھا۔ جس کے پتلے ہونٹوں میں سے اُس کی ہلکی سی مسکراہٹ کے باوجود اُوپر کے پیلے دانت نمایاں ہوئے تھے۔ چہرہ کسی سُوکھے گلاب کی طرح تھا۔

''ڈوبرائے ویچر (Dobry vecher) ''شام بخیر۔

اُس نے ہنستے ہوئے کہا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُسے چومنے کے لئے جھکا۔ میں نے شرمندگی کے زیر اثر ہاتھ کھینچنا چاہا جب منصور نے کہا۔

''ارے جو یہ کر رہے ہیں کرنے دیجیے۔ ان کی زندگی میں شیولرس آداب ورسوم کی بہت اہمیت ہے۔ میرے سسر ہیں۔''

منصور جوتے اُتار رہا تھا۔ یقیناً گھروں کے اندر جوتے لے جانے کا رواج نہیں تھا۔ کہ دروازے کے ساتھ رکھا ریک جوتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور جب میں اپنے جوتے ریک میں رکھ کر سیدھی ہوئی۔ میں نے اُسے دیکھا تھا۔ ہاتھوں میں پکڑے سلیپر جو اُس نے میرے آگے رکھ دیئے تھے۔ اُس کی باچھوں میں ناچتی مسکراہٹ، اُس کی آنکھوں میں کھلکھلاتی اپنایت اور اُس کی بانہوں میں مچلتی گرمجوشی کا والہانہ انداز ایسا تھا کہ جس نے چہرے مہرے کو تنقید کی کسوٹی پر چڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بانہوں کے دائروں میں سمیٹے یوں سہولت سے چھوٹے سے ڈرائنگ رُوم میں لے آئی کہ مجھے بے اختیار ہی منصور کی طرف دیکھنا اور پُوچھنا پڑا۔

''تمہاری بیوی تو رُوسی مزاج کا بالکل اُلٹ ہے۔''

''دراصل اس پر پاکستانیت کا کوٹ چڑھ گیا ہے۔ یہ وہاں کافی مہینے رہی ہے نا۔''

''ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لڑکی سسرالیوں کے رنگ میں رنگی گئی ہے۔''

سائبیریا کے نینتسی (Nentsy) نسل کے بچے

والرس (Walrus) بچہ جمی ہوئی برف ہٹا کر نیچے کے پانی میں تیراکی
فادر فروسٹ (Frost) بچے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے

سائبیریا کی یاقوتی نسل کی عورتیں اور بچے

1991 کی ناکام فوجی بغاوت کے بعد روسی جھنڈے میں سے درانتی اور ہتھوڑا کمیونسٹ پارٹی کا علامتی نشان کاٹ دیا گیا

روسی ڈاچا مضافات میں (چوبی گھر)

پس منظر میں گم ، مارگیت ، زرافشاں ، زرنگار ، مہر النساء اور مصنف

ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے جھانکتا برآمدہ جس میں لٹکتی بیلوں اور پھولوں نے یکدم جیسے مجھے احساس دلایا کہ یہ گھر کتنا خوش قسمت ہے ہنستے مسکراتے انسانوں اور پھولوں پودوں والا۔

چھوٹی سی ٹرے میں دو گلاس نارنجی رنگے مشروب سے بھرے آئے۔ پہلے گھونٹ نے ہی اُس کے ذائقے اور فرحت افزا ہونے کا احساس دلایا۔ نگاہوں سے چھلکتی تعریف پر انتونینا نے بتایا کہ خالص گھریلو مشروب کمپوت ہے۔ جنگلی بیروں، جنگلی سیبوں، آلو بخارے اور اسی نوع کے دوسرے پھلوں سے بنایا جاتا ہے۔ ہر گھر اپنے ڈاچا میں جب بھی جاتا ہے۔ ڈھیروں ڈھیر کمپوت کے جار بنا کر لاتا ہے۔ ڈاچا کی تفصیل کچھ یوں تھی کہ ہر رُوسی خاندان کا شہر کے مضافات کے جنگلوں میں حسب حیثیت لکڑی کے گھر کا ہونا ضروری ہے۔ جس کے اگلے پچھلے حصوں میں وہ پھل دار درخت اور سبزیاں اُگاتا ہے۔

کمرے میں واجبی سا سامان تھا۔ دیواری سجاوٹ میں پاکستانی دستی پنکھے پنّی سے سجے ٹنگے تھے۔ پنجاب کے ثقافتی نمائندہ۔ بیٹھنے سے قبل پاس پاس لٹکتی دو تصویریں مجھے جبراً اپنے پاس گھسیٹ کر لے گئیں۔ جہاں دریا کے خوبصورت پس منظر میں نیلے چمکتے آسمان کے نیچے صنوبر کی گچھاؤں میں ایک عظیم الشان عمارت مہین نقاب میں ملبوس کسی شوخ حسینہ کی مانند" صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں " کی عکاس تھی۔

انتونینا نے میری دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے بتایا کہ سائبیریا کے شہر نوواسی برسک کے دریا "اوب ساگر" کے پاس یہ سائنسی مرکز "اکیڈمی سٹی" ہے۔ میرا چچا اور چچی یہاں کام کرتے ہیں۔ دوسری تصویر کے بارے میں پتہ چلا کہ اہرام مصر کی طرح نظر آنے والے دراصل کوئلے کے فضلاتی ڈھیر ہیں۔

انتونینا کی رنگت بہت گوری تھی۔ وجود دُبلا پتلا تھا۔ اب نقش ونگار کا کیا کہوں کہ بنانے والے کی مرضی کہ اپنے پاؤں سے پاتیاں تھاپ دے یا اپنے خاص الخاص ہاتھوں سے شاہکار

وجود میں لائے۔ میں ناچیز کون اُس کی عملداری میں دخل دینے اور رائے زنی کرنے والی۔

سائبیریا کے ضلع نوواسی برسک کے سب سے بڑے شہر کیمیر واسے تعلق رکھنے والی کے ہونٹ جب کھلتے تو نقش کہیں دُور جا کر گُم ہو جاتے۔ بہت اچھی انگریزی بولتی تھی۔ اُردو بھی بول لیتی تھی۔ سسرال میں ایک بار چھ ماہ اور دوسری بار پانچ ماہ رہ کر آئی تھی۔ ماں بے شک ایک بچے کی تھی۔ پر لگتی نہیں تھی۔

کمال کی صاحب علم، معلومات سے بھری ہوئی، ذہنی اُفق کی وسعتوں میں بے کنار۔ مجھے ہرگز اُمید نہیں تھی کہ منصور جیسے لونڈے کی بیوی اتنی غیر معمولی ہو سکتی ہے۔

رُوسی مزاج کا جو تجربہ اس مختصر سے وقت میں ہمیں ہوا تھا وہ اُس کی مکمل نفی کرتی تھی۔ بے تکلف، گھلنے ملنے اور محبت سے بھری ہوئی سلیف میڈ عورت جس نے آدھ گھنٹہ ہم سے کھلی ڈُلی گپ شپ کے بعد کمپیوٹر پر سی ڈی چلا کر باورچی خانے میں یہ کہتے ہوئے چلی گئی کہ

''آپ لوگ ریڈ سکوائیر کی سیر کرتی آ رہی ہیں وہاں 4 نومبر کو منایا جانے والا انقلاب اکتوبر جو اب یونٹی ڈے (Unity Day) کہلاتا ہے کا جیتا جاگتا احوال دیکھیں۔ گو اب یہ سوویت کے زمانوں والا بہت بڑا دن نہیں رہا۔ تاہم ابھی بھی بڑا ہنگامہ خیز شمار ہوتا ہے۔''

شوق و اشتیاق سے بھری ہوئی نظریں سکرین پر مرکوز ہو گئیں۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ایک سمندر تھا۔ ریڈ سکوائیر کا میدان، بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور لڑکیوں کی رنگین ٹوپیوں سے سجا پڑا تھا۔ فضاؤں میں اُڑتے غبارے جنہیں تکتے چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے بچے رنگین ٹوپیاں اوڑھے لونگ بوٹ اور کوٹ پہنے کیسے باوے سے نظر آتے تھے۔

فوج کا مارچ پاسٹ کیا شان تھی، کیا آن بان تھی فوجی دستوں کی۔ لشکارے مارتا یونیفارم، تمغوں سے بوجھل اُن کے سینے، چمکدار بوٹ، فرش کا سینہ کوٹتی اُن کے بوٹوں کی دھمک اور فضا میں گونجتی نہ سمجھ آنے کے باوجود خون گرماتی موسیقی سب بہت شاندار اور محظوظ کرنے والی تھی۔ ٹینک، توپیں سب ایک ترتیب سے گذر رہی تھیں۔ کھڑے ٹینکوں پر بچے ہی نہیں بڑے

بڑے موٹے تازے لوگ بھی موجیں مارتے پھرتے تھے۔ فوج کے بعد صنعت کار، تاجر، کسان، طلبہ اور اساتذہ سبھوں کے قافلے گزرے۔ خلقت کے اژدہام کے باوجود نظم وضبط اپنے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہاں نظر آتا تھا۔

منظر بدلتے گئے۔ کچھ سرسری سے۔ کچھ تجسس والے۔ چند ایک نے ذہن کو گرفت میں لیا۔

سوویت ملٹری طاقت کے نمائندہ سین ریڈ سکوائر کا دامن میزائلوں سے بھرا ہوا یوں نظر آ رہا تھا جیسے یہ میزائل ابھی اُڑ کر دنیا کا کلیجہ چھلنی کر دیں گے۔

ایک اور سین۔ جگہ ریڈ سکوائر نہیں لگتی تھی، شاید ہو بھی۔ تاحدِ نظر لوگوں کا ہجوم کہ کھوے سے کھوا چلنے والا محاورہ عملی طور پر سمجھ آئے۔ تیکھے خدوخال والا سپاہی بڑا سا سُرخ جھنڈا گول سوراخ کے ساتھ لہراتا ہوا سامنے تھا اس سوال کے ساتھ کہ جھنڈے میں سوراخ کی وجہ کیا ہے؟

جواب بھی فوراً ہی مل گیا تھا کہ انتونینا کسی کام سے اندر آئی تھی۔ پوچھنے پر بتا گئی کہ 1991ء کی فوجی بغاوت کے نتیجے میں لوگوں کا شدید ردِّعمل کمیونسٹ پارٹی کے جھنڈے میں سے ہتھوڑا اور درانتی کو کاٹ پھینکنے کی صورت میں سامنے آیا تھا۔

تو یہ سب کمیونسٹ راج ختم ہونے پر خوش ہیں۔ میں نے خود سے پوچھا تھا۔ آنکھوں پر کچھ بے اعتباری سی محسوس ہوئی۔ میں کھڑی ہوئی۔ کمپیوٹر کے پاس جا کر میں نے ماؤس کو سکرین پر دی گئی بیک آپشن پر کلک کیا۔ منظر دوبارہ میرے سامنے تھا۔ بندے پر بندہ چڑھا ہوا تھا۔ اگلا سین اس واقعے کا زیادہ نمائندہ تھا۔ نیلی سُرخ اور سفید پٹیوں والے رُوس کے بہت بڑے جھنڈے کے دونوں اطراف پر لوگوں کے جتھے پر وکٹری کا نشان بناتے تھے۔ ایک اور منظر میں کریملن کے گرجا گھر میں لوگوں اور ٹی وی کیمروں کا ہجوم کمیونزم کے خاتمے اور مذہب کے احیاء کا ایک اعلان تھا۔

میرے اندر کُھد بُھد تھی۔ ایک عہدے کے ختم ہونے اور دنیا کی دوسری سپر پاور کے

ٹوٹنے کی وجوہات جاننے کی تڑپ تھی۔ میں نے دل کو ذرا ڈپٹا۔ سکون سے چلو۔ سب کچھ جان جاؤں گی۔

بیل بجی تھی۔ برآمدے میں ہم نے ایک اُدھیڑ عمر عورت، نوعمر لڑکی اور لڑکے کو دیکھا جو ہم پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا تھا یہ انتونینا کی ماں، بہن اور بھائی تھے۔ سب اسی گھر میں مل جل کر رہتے ہیں۔ بھائی ماسکو یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ، بہن کسی بیرونی فرم میں ملازم اور ماں ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور پر سپروائزر تھی۔

سی ڈی ختم ہو جانے کے بعد میں انتونینا کے پاس کچن میں آ گئی۔ وہاں کُرسی پر خاتون بیٹھی باتیں کرتی تھی۔ جس نے فوراً مجھے اپنی نشست پیش کرتے ہوئے باہر جانا چاہا۔ میں نے شانوں سے پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کی جب انتونینا نے کہا۔

''انہیں جانے دیں۔ یہ تھکی ہوئی ہیں۔ آپ بیٹھیں مجھ سے باتیں کریں۔''

''انتونینا باتیں تو تم نے کرنی ہیں اور میں نے سُننی ہیں۔''

''مجھے آپ نینا کہیں۔ رُوس میں نِک نیم اور فیملی نیم بہت چلتا ہے۔''

میں اُسے دیکھتی تھی۔ وہ ایپرن پہنے، سر کو پلاسٹک کے ہڈ سے ڈھانپے کس مستعدی سے رُوسی بچوں اور بڑوں کی پسندیدہ سویٹ چک چک (chuk chuk) بنانے کے لئے میدہ، دودھ، مکھن، شہد اور نمک کا پٹارہ کھولے کھڑی تھی۔ اُس نے انڈے پھینٹے، چینی نمک اور مکھن کو مکس کر کے پھر پھینٹائی کی۔ میدہ ملایا۔ گوندھا اور ڈیڑھ انچ لمبی پٹیاں کاٹ لیں۔ انہیں تلا۔ شہد اور چینی کے آمیزے کو آگ پر خوب گاڑھا کیا۔ پٹیوں کو اُٹھا کر ان میں ڈبو دیا۔ پھر انہیں پلیٹ میں پہاڑی کی صورت دی۔ بادام کشمش کاجو اور پستہ کی گارنش سے سجا کر فریج میں رکھ دیا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''انتونینا بس ایسے ہی میٹھے پاکستان کے شہروں میں بننے لگے ہیں۔''

میرے سامنے میز پر تین لمبوترے جار دھرے تھے۔ ایک میں کٹا پیاز اور لہسن تیرتا تھا۔

دوسرے میں کھیرے تیر رہے تھے۔ تیسرے میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میرے پوچھنے پر انتونینا نے بتایا کہ سلاد کی چیزوں کو اُن کے موسموں میں سرکے میں محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ اسی طرح عام لوگ سبزیوں اور پھلوں کو اپارٹمنٹ کی بیسمنٹ میں بنے اپنے سٹوروں میں ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ ڈبوں میں بند سبزیاں اور پھل اُن کی طاقت خرید سے بہت اُونچے ہوتے ہیں۔

اور جب وہ مچھلی کے کٹلس بناتی تھی اُس نے کیمیروا کے اُس گاؤں کا ذکر بہت عقیدت و محبت سے کیا جہاں اُس نے آنکھ کھولی تھی۔ لکڑی کا دومنزلہ گھر جس کی دیواریں، چھتیں، ستون، فرش سب لکڑی کے تھے۔ وہ سائبیریا کی سردی کی شدت کی بات کرتی تھی اُس نے وہاں کی مشکلات سے بھری ہوئی زندگی کا ذکر کیا اور جب وہ یہ کہتی تھی کہ ماسکو اور پیٹرزبرگ رُوس نہیں ہیں اُس کی آواز میں خفیف سی بھراہٹ تھی۔

ہم اپنے گھروں کو گرم رکھنے کے لئے کوئلہ جلاتے ہیں۔ کیمیروا پتھر کے کوئلے کے بہت بڑے ذخیروں کا مالک ہے۔ بہترین کوئلا جس میں گندھک اور کنگھر بہت کم ہوتا ہے۔ جوانی میں اُس کا باپ انہی کوئلوں کی کانوں میں کام کرتا تھا۔

دریائے توم سے پانی بھر کر لانا بھی اُسے یاد تھا اور وہ سُرخ شعلوں کے خوفناک لپکے جو کانوں سے اُٹھتے تھے اور دُور سے نظر آتے تھے اور جنہیں دیکھتے ہوئے اُسے بہت سی خوفناک چڑیلوں کی کہانیاں یاد آتی تھیں۔

گاؤں کی گلیاں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ذرا سی بارش ہوتی یا ہلکی سی برف باری۔ یہ کیچڑ سے فوراً لت پت ہو جاتیں۔ اور ان گلیوں میں کدکڑے لگانا اُسے آج بھی یاد تھا۔ ماں کی ڈانٹ پھٹکار پر موٹی لکڑی کی کھڑاویں پہن لیتی۔

ہمارے گھر بہت چھوٹے چھوٹے سے ہوتے تھے۔ درمیانی کمرے میں چوبی چوڑے چوڑے کارنسوں کی لٹکتی جھالریں اپنی ڈیزائن داری اور نفاست سے بنی ہوئی آج انٹیک میں شمار ہوتی ہیں۔ ہم اُن پر برتن سجاتے تھے۔ اور جھلمی دار کھڑکیوں میں بیٹھ کر دور صنوبر اور برچ کے

جنگل دیکھا کرتے تھے۔

مجھے یکدم بچپن میں اپنے گاؤں میں دیکھے گئے وہ بے شمار گھریاد آ گئے تھے جن کی کچی دیواروں پر گھر کی سوانی گاؤں کے ترکھان سے بنی چوبی جھالردار کارنس بڑے اہتمام سے ٹانگوا کر پیتل کے گلاس کٹوریوں کو طاق یا جفت کی صورت سجا کر خوش ہوتی تھی۔

اپنے چھٹپنے کی ایک اور خوبصورت یاد اُس نے مجھ سے شیئر کی۔ اُسے تھیٹر جانا بہت پسند تھا اور جب وہ رُوسی کلچر کی بات کرتی تھی مجھے اُس کے لہجے میں چھلکتا تفاخر بخوبی محسوس ہوا تھا۔ موسیقی، تھیٹر آرٹ اور کتاب سے محبت بچے کی گُھٹی میں ڈالی جاتی ہے۔ شہر امیر ہوں یا غریب۔ وہاں خوبصورت تھیٹروں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مختلف حصوں میں منقسم شہر کے کلچرل ایجنٹ ٹکٹوں کی فراہمی کے لئے اپنے اپنے حصوں کے ذمہ دار ٹھہرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تو ہمیں ٹکٹ سکول سے ملتے تھے۔ ہم چھلانگیں مارتے تھے۔

سہیلیوں سے پروگرام بناتے، کون سے کپڑے پہننے ہیں؟ جیبوں میں کونسی کھانے کی چیز ڈال کر لے جانی ہے۔ ایک گھنٹے بعد پہلے انٹرول پر باہر نکل کر ہم کس قدر قہقہے لگاتیں۔ اندر کھانے پینے کی سخت ممانعت تھی۔ مگر ہم چیزوں کو ٹھونگنے سے باز نہیں آتی تھیں۔ مپٹ (Muppet) تھیٹر سے یوتھ ڈرامہ پھر ڈرامہ سے میوزیکل اور اوپیرا تک ہماری ذہنی تربیت ہو جاتی۔

سوویت کے زمانوں میں کمیونٹی ورک سسٹم بہت اچھا اور منظم تھا۔ اب تو خیر آپ دھاپ پڑی ہوئی ہے۔

''انڈوں کا کھیل بھی میری زندگی کی بہت خوبصورت یادوں میں سے ایک ہے۔''

''انڈوں کا کھیل۔'' میں نے تعجب سے اُسے دیکھا۔

''ہاں ہاں ہم لوگ انڈوں کو اُبال کر انہیں رنگا کرتے۔ اُن پر رنگوں سے تصویریں بناتے، اور انہیں زمین پر لڑھکا کر ایک دوسرے سے مقابلے کرتے کہ کس کا انڈہ زیادہ مضبوط

ہے کس کا رنگ اور اس پر نقاشی بہترین ہے۔''

''اللہ!'' میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

میں اُس وقت ماسکو میں بیٹھی سائبیریا کے گاؤں میں کھیلنے والی انڈوں کی گیم کے بارے میں سنتی تھی۔ کہاں سائبیریا کا ایک گاؤں اور کہاں میرے بلتستان کی وادیاں خپلو اور شگر جہاں اسی طرح انڈے رنگنے، اُس پر نقش ونگاری اور اسی طرح انڈوں کو لڑھکانے کا مقابلہ ہوتا۔ سبزیاں اور پھل اسی طرح تہہ خانوں میں سٹور کیے جاتے ہیں۔ تو آلیٹیچیوڈ اور موسموں کی یکسانیت تہذیبی کلچر کے بہت سارے رنگوں کو ایک جیسا کر دیتی ہے۔ میں نے سوچا۔

ہائی اسکول کے بعد اُس نے ضد پکڑی تھی کہ وہ یا ماسکو جائے گی یا پیٹرز برگ۔ ماسکو میں بہت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ پڑھتی رہی۔ گائیڈ کا کام بھی کرتی رہی۔ پھر جرنلسٹ کے طور پر کام کرنے لگی۔

اور جب وہ سوپ کے لئے سبزیاں میش کرتی تھی، باتیں کرتے کرتے اُس کے لہجے میں دُکھ بھر آیا تھا۔

''ہمارا وہ تاریخی گاؤں تو اب کہیں گھاٹیوں میں چھپ گیا ہے۔ دریائے توم کے کنارے ہموار زمین پر ایک نیا شہر بس گیا ہے۔ جہاں میرے والدین نے بھی ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے۔

دریائے ینی سی کے اِس علاقے میں اب بے شمار شہر بس گئے ہیں۔''

دریائے ینی سی کے ذکر پر ایک بار پھر اُس کی آنکھیں چمکیں۔

کاش آپ ینی سی دیکھ سکتیں۔ دُنیا کا کوئی دریا اتنا خوبصورت اتنا سرکش نہیں ہو سکتا جتنا یہ ہمارا ینی سی ہے۔ کاراسی کے پانیوں سے لدا پھندا اس کا طمطراق اس کا پُر ہیبت شاہانہ انداز۔ اس کا ایک سیکنڈ میں سات میٹر کی رفتار سے بہنا۔ ایسے ہی تو ہمارے چیخوف نے نہیں لکھا۔

ینی سی پر زندگی تو آہ کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ پر اُس کا اختتام ایسی جرأت مندانہ

کاوشوں پر ہوگا جس کا تصور بھی محال ہے۔

''رُوس کا سب سے بڑا دریا ہے یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں سب سے بڑا تو لینا Lena ہے۔''

''جہاں جہاں کوئلے کی کانیں ہیں وہاں وہاں بستیاں آباد ہوگئی ہیں۔ ان شہروں میں یوں دھات اور مشین سازی کی صنعتیں بھی ہیں۔ تاہم کان کنوں کو زیادہ مراعات اور سہولتیں میسر ہیں۔ اُن کے مفادات کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ سڑکیں ایسے مزدوروں کے نام معنون کی جاتی ہیں جنہوں نے اچھے کام کیے۔''

انتونینا قومیت کے اعتبار سے سلافی ہے۔ رُوس کی قدیم ترین قوم سلاف سے۔ پر اُس کے خاندان کی یاقوتیوں کے ساتھ بھی رشتہ داری ہے۔ اُس کا چچا، ایک خالہ اور بھائی یاقوتیوں میں بیاہے ہوئے ہیں۔ سائبیریا میں رُوسیوں کے بعد یاقوتی دوسری بڑی قوم ہیں۔ نینتسی خانتی اور مانسی بھی ہیں۔ پر اُن کی تعداد کم ہے۔

سائبیریا وسیع و عریض علاقہ ہے۔ مغرب میں اورال کے پہاڑوں سے لے کر مشرق میں بحرا لکاہل تک۔ شمال میں بحر آرکٹک سے جنوب میں چین اور منگولیا کی سرحدوں تک۔ میرے پردادا پہلے التائی میں تھے۔ خانہ بدوش لوگ جو اپنے ریوڑوں کے ساتھ یہاں وہاں پھرتے رہتے۔ غربت کی انتہاؤں پر پہنچے ہوئے۔ تاجروں، سوداگروں اور مقامی نوابوں کے ہاتھوں استحصال کا شکار۔ بیچاروں کو ایک گلہری کے سمور کے بدلے ایک ڈبیہ دیا سلائی ملتی اور لومڑی کی کھال کے بدلے ایک سوئی۔ اب سوچ لیجیے زندگی کتنی مشکل ہوگی اُن کے لئے۔ میرے دادا نے رینڈ روں کو پالنا شروع کیا اور نوواسی برسک میں آ گئے۔ پھر کیمیر وا میں پکا پکا گھر بنا لیا۔

میں اپنے ماحول سے ایک مختلف لڑکی تھی۔ کچھ کرنے پڑھنے اور آگے بڑھنے کی متمنی۔ رُوسی کلچر خاندان کو لے کر چلنے اور نباہ کرنے والا کلچر ہے۔ یہاں شہری زندگی مشکل ہے

اور مہنگی بھی۔ ہم مل جل کر رہتے ہیں اور شیئر کرتے ہیں۔ ہماری زبان کی ایک کہاوت ہے۔

"One is not a soldier in the battlefield."

پر......

انتونینا نے فی الفور میری بات سمجھتے ہوئے کاٹ دی تھی۔

میں اپنے مختصر سے وقت میں حاصل ہونے والے تاثرات سے اُسے آگاہ کر چکی تھی۔ اور سہ پہر کو ہونے والے واقعے کی تفصیل بھی بتا بیٹھی تھی۔

''رُوس اور رُوسی خاصے مشکل اور مشکل پسند ہیں۔ یہ مغرب کی طرح مسکراہٹیں بکھیرنے کے عادی نہیں۔ نہ فضولیات میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ نہ جلدی گھلتے ملتے ہیں۔ پر جب بے تکلف ہو جائیں تو آپ کے بہت اچھے دوست ثابت ہوتے ہیں۔ دوسرے ذاتی کاروبار والوں نے تھوڑی تھوڑی تنخواہوں پر بھرتیوں کا کام شروع کر رکھا ہے۔ گاؤں سے معمولی پڑھی لکھی لڑکیوں اور عورتوں کو کم اُجرت پر بڑے شہروں میں لا کر ملازم رکھتے ہیں۔ جن کی نہ گرومنگ ہے نہ تعلیم اور نہ کاروباری سُوجھ بوجھ۔

انتونینا کے بیٹے کا نام سمیر نوف ہے۔ بچہ اُس وقت میرے سامنے چھوٹے سے برآمدے میں باپ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بڑا خوبصورت اور سمجھدار بچہ لگتا تھا۔ رُوسی اور پاکستانی ملاپ میں اُس نے ہر ایک کی اچھی چیز لی تھی۔

اور جب انتونینا اُس چھوٹے سے باورچی خانے میں مزید کُرسیاں گھسیڑ رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر لُدمیلا (Ludmila A vasilyev) کے بارے میں پوچھا۔ انتونینا نے چند لمبے پلکیں جھپکائیں پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ میں سمجھ گئی۔ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز میں ہوتی تھیں۔ شاید اب بھی وہیں ہیں۔ پتہ کرنا پڑے گا۔''

''نینا مجھے اُن سے ملنا ہے اور تمہیں میری مدد کرنی ہے۔''

''ضرور۔''

چھوٹی سی میز برتنوں اور کھانے کی چیزوں سے اُبلی پڑ رہی تھی۔ ''جام وسبو میرے آگے'' والا معاملہ بھی تھا۔ مزے کی بات انتونینا کے باپ نے پینا بھی شروع کر دیا۔ بیٹی مسکرائی تھی۔ بیوی خفگی سے کچھ بولی تھی شاید ڈانٹ رہی تھی۔

ہماری اماں نے بہت کوشش کی تھی کہ ابا کھانے کی میز پر نہ آئیں پر اُن کے لئے بھی یہ سنہری موقع ہوتا ہے۔ یہ بہت پیتے ہیں جو اُن کے لئے مضر ہے۔ کھانے کے بھی بہت شوقین ہیں۔

میں نے دلچسپی سے اس سین کو دیکھا تھا۔ انسان کسی بھی خطے کا کیوں نہ ہو اپنی فطری جبلتوں میں تقریباً ایک سا ہی ہوتا ہے۔ بوڑھوں کا کم وبیش یہی وطیرہ ہے۔

ہمارے لئے گلاسوں میں کولا ڈال دیا گیا تھا۔ یوں کھلے عام پینے پلانے کا یہ سلسلہ میرے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ منصور کی معذرت پر میں نے خوش دلی سے کہا۔

''چھوڑو اپنا اپنا کلچر ہے۔''

منصور سے میں نے اپنی ٹھیٹ پنجابی میں پوچھا تھا کہ ہمیں باہر کھانے کی کن کن چیزوں میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

''ہیم (Ham) یہاں سب سے مہنگا ہے۔ عام ریسٹورنٹوں اور سینک بارز پر چکن، بیف فش اور مٹن وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔ ہاں البتہ حلال کا مسئلہ تو ہے۔

ویسے اِس شراب کا اگر رولا نہ ہوتا تو سارے رُوس نے مسلمان ہونا تھا۔''

منصور ہنس رہا تھا۔

انتونینا بھی ہنس پڑی۔ میں نے پلیٹ میں سلاد ڈالتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

''تفصیل تو یقیناً دلچسپ ہوگی۔ جانتی ہیں تو بتاؤ۔ کہیں تھوڑا سا پڑھا سنا تو ضرور ہے۔ پر اب ذہن میں نہیں۔''

اُس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا۔گھونٹ لیا اور بولی۔

''زمانہ بارہویں صدی کا تھا اور کیف (Kiyev) مرکزی شہر تھا اور ماسکو کہیں نہیں تھا۔ پے لُویا کی عظیم شاہراہ جس کا ایک نام شاہراہ ریشم کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔

بازنطین کے چند تاجر بازنطینی خواتین کے ملبوسات کے لئے ریشم، موتی اور ہاتھی دانت کی خریداری کے بعد کیف آنکلے۔ کیف کے بادشاہ سے ملاقات کے بعد اُن کی دعوت پر سوداگروں کا ایک گروہ بازنطین گیا۔ جہاں سے واپسی پر انہوں نے بازنطینی تمدن، اُن کے گرجاؤں کی شان وشوکت، اُن کے محلات کی آرائش وزیبائش کے قصے سنائے۔ کیف کے درودیوار اس نئے رنگ سے آشنا ہوئے۔

پھر کیف پر والادی میر کی حکومت آئی۔ شہزادہ اپنی زندگی اور ملک کو ایک واضح مذہب دینے کا خواہش مند ہوا۔ اُس کی دعوت پر یونانی طرز کے شکن در شکن لباس پہنے بدھ آئے۔ عیسائی مسلک والے نستوری پادری آئے۔ روشنی کو پوجنے والے ''مانی'' آئے اور لمبے لمبے لبادے پہنے مسلمان مبلغین آئے۔

مختلف المذاہب کے اس ہجوم میں اُسے اسلام کی سادگی پسند آئی۔ چونکہ وہ خود دلیر اور بہادر تھا، اُسے جہاد کا فلسفہ پسند آیا تھا۔

لیکن شراب کی ممانعت کا جان کر اُس نے اپنے درباری اُمراء سے کہا۔

''رُوسی لوگوں کے لئے شراب نوشی خوشی و مسرّت کا سرچشمہ ہے میں اُن سے یہ خوشی کیسے چھین سکتا ہوں؟''

''نرا احمق اور گھامڑ تھا۔

میں نے تاسف سے لمبی سانس لی اور اپنے آپ سے کہا۔

کوئی طریقے سلیقے سے پیئے تو خوشی حاصل ہو۔ یہاں تو وہ حال ہے کہ جیسے واڈکا میں غوطے کھاتے ہوں۔ ہر چھٹا بندہ عادی شرابی، مایوسی، بددلی اور ڈپریشن کا شکار۔ کمیونسٹ

حکومتوں نے پابندیاں لگانے کا سوچا اور لگائیں بھی۔ پر بیکار۔

ہائے اور وہ مبلغین، تھوڑی سی گنجائش نکال لیتے۔ کچھ لچک کا مظاہرہ کر لیتے تو کیا تھا۔ اب کیا نہیں پیتے مسلمان؟ مفت کی شرابوں پر ان گناہ گار آنکھوں نے کیسے کیسے پرہیزگاروں کو مار دھاڑ کرتے دیکھا ہے۔

اللہ ان ڈھیروں ڈھیر گرجاؤں کی جگہ مسجدیں ہوتیں اور یہ رُوس کتنا اپنا اپنا سا لگتا۔''

محراب و منبروں کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ کھانا بچا تھا اور سامنے تھا سو اُس کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

سوپ کا تو بس گزارہ تھا۔ فش کیٹلس مزے کے تھے۔ سلادز بردست اور سب سے بڑھ کر انتونینا کی مہمان نوازی اور یہ کہنا کہ آج کی یہ ملاقات تو بس ایک تعارفی اور رسمی سی ہی ہے۔ پیٹرز برگ سے واپسی پر مزید نشستیں رکھیں تا کہ رُوسی کلچر اور لوگوں کے خدوخال آپ پر زیادہ اچھے انداز میں واضح ہو سکیں۔

میری خوشی بے حد و حساب تھی۔ اور جب میں منصور کے بچے کو پیار کرتی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے پنجابی میں کہا تھا۔

''پاکستانی پتر سسرال میں گھرا ہوا ہے۔ پر بڑا خوش قسمت ہے کہ انتونینا جیسی بیوی کا شوہر ہے۔''

اور جب ہم رُخصت ہونے والے تھے۔ میں نے اپنے بیگ میں سے خوبصورت کشمیری کڑھائی والی پشمینے کی چادر جو میں امرتسر سے لائی تھی کھول کر انتونینا کے شانوں پر پھیلا دی۔ ''اپنی بہو کے لئے۔''

کاش میرے پاس انتونینا کے والد کے لئے کوئی دُھسہ ہوتا۔ انسانوں کے نصیب میں لکھے آب و دانہ کی طرح چیزوں کا بھی مقدر ہوتا ہے کہ انہوں نے کس کس کے بدن کی زینت بننا ہے۔ منصور اور انتونینا تو کہیں خواب میں بھی نہ تھے۔

باب

7

ماسکو چکروں کے حصار میں • ایلنیکا سٹریٹ کی کرشمہ سازیاں اور ڈاؤن ٹاؤن کا گیت

Москова Окольный Ограда.

Под Мигаваие Улице Аленка И Песния Донтонна.

آنکھیں تو ابھی کھلی بھی نہ تھیں۔ پر خواہش ہونٹوں پر تھی۔

''اب بھلا مولا کریم تیرے لئے کیا مشکل ہے کہ کل کی طرح آج بھی کچھ ایسے بندے ٹکرا دے جو مددگار ہوں۔ انسانوں کے اِس سمندر میں تیرنا نہیں آتا ہے۔ پانی بھی زوروں پر ہے اور اندر اُترنا بھی ضروری۔ اُترنا تو ہے ہی۔ بس ذرا سہولت ہو جائے۔''

اور اُس دن قطعی کوئی سہولت حاصل نہیں ہوئی۔ سفر وسیلہ ظفر نہیں بنا۔ سب خجل خواری خود ہی بھگتی۔ پر سچی بات ہے مزہ بہت آیا۔

اب کرسنایا پلوشد (ریڈ سکوائر) جانا تھا کہ یہ ماسکو کا دل ہے۔ خون کی شریانوں کی طرح بکھرے سب اہم راستوں کا منبع یہی جگہ ہے۔ کریملن کا قلعہ سر کرنا تھا۔ نپولین تو سر نہ کر سکا۔ پر مجھے تو کرنا تھا۔ لیکن ابھی نہیں۔ پیٹرز برگ سے واپسی پر۔

یوں ہم بھی بڑی کم بخت عورتیں تھیں۔ مجال ہے جو کسی طرح کی عیاشی اپنے اُوپر حلال کر لیں۔ رات منصور کے ہاں سے واپسی خاصی دیر سے ہوئی۔ خدا کا احسان تھا مہر النساء تندرست تو بر تو تھی۔ سچی بات کہنی پڑے گی۔ جی دار عورت تھی۔ مجال جو پریشانی کا ہلکا سا عکس بھی اُس کے چہرے پر باقی ہو۔ جب بھی پوچھا۔

''ارے بالکل ٹھیک ہوں۔''

اب بھی سویرے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور میں بھی۔ نماز کے بھی ہمارے اپنے ہی اوقات تھے۔ کوئی گھڑی کوئی موبائل پاس ہوتا تو کچھ حساب کتاب رکھتے۔ نرے جاہلوں اور اُجڈوں والے کام تھے ہمارے۔

ماسکو کی راتیں نور پیر کے تڑکوں جیسی ہی ہوتی ہیں۔ اُوپر سے کھڑکیوں پر پردے بھی سفید جالی کے۔ اور اُس پر ستم ہم نیک پروین بیبیاں۔ آنکھ کھلتے ہی کھڑ پڑ شروع کر دیتیں۔

ڈائننگ ہال میں داخلے پر یقیناً اول نمبر ہمارا ہی ہوگا کہ آدھ گھنٹہ سے تیار ہو کر بیٹھی ہیں کہ کب لنگر کھلے اور کب جائیں۔

ابھی نو بھی نہیں بجے تھے کہ مینز سکوائر پہنچ گئیں۔ یہاں دائیں ہاتھ ماسکو یونیورسٹی کی دو پرانی عمارتیں جن میں سے ایک کا گنبد بڑا اور چپٹا ہے اور جس کے سامنے کھڑی میں حیرت زدہ سوچتی تھی کہ یہ اس درجہ خوبصورت عمارت اگر اولڈ ہے تو نیو کیا توپ شے ہوگی۔ میری کیفیت کسی دل پھینک قسم کے نوعمر بزدل چھوکرے جیسی ہی تھی جو کسی خوبصورت لڑکی کو دُور دُور سے دیکھ کر ہی خوش ہوتا ہے۔ میں بھی اس خوبصورت عمارت، اُس کے سرسبز باغ، اُنیسویں صدی کے انقلابی مصنفوں ہرتسن اور اوگاریوف جنہوں نے اسی یونیورسٹی سے پڑھا تھا اور زاریت کے خلاف جدوجہد کی تھی کے مجسموں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی اور لڑکے کی طرح قریب جانے سے ڈرتی تھی۔

یونیورسٹی کی دوسری عمارت میں رُوسی سائنس کے بانی میخائل لومونوسوف کا مجسمہ ہے۔

لومونوسوف کسان کا بیٹا تھا۔غریب کے بچے کے لئے تعلیم ضروری سمجھتا تھا۔اور شعروشاعری اور ادب کی بجائے اُس وقت جس کا رُوس میں بڑا گریز تھا سائنس کو بہت اہم خیال کرتا تھا۔

''ہائے وے میر یارتبا، میرے ملک پر ایسے عظیم اور انقلابیوں کی کب بارش ہوگی۔مولا! بڑا فقدان ہے۔اچھا قحط الرجال ہے، کب عنایت ہوگی تیری؟''

میں لینن لائبریری دیکھنا چاہتی تھی۔کل زرفشاں نے مجھے تاکید کی تھی۔انتونینا نے بھی کہا تھا۔سڑک سے بلندی پر سرسبز ٹیلے پر یہ سفید اور خوبصورت عمارت دیکھنے کی اشد ضرورت تھی۔پر مہرالنساء ماسکو کی قدیم ترین گلیوں اور بازاروں میں پھرنے کی خواہش مند تھی۔خواہش مند تو میں بھی تھی پر ذرا اطمینان سے۔ڈاؤن ٹاؤن ڈاؤن ٹاؤن۔اُس نے اپنے کٹے بالوں کو جھلار دیتے ہوئے گایا۔

ہسٹری میوزیم کی پُر شکوہ عمارت کو پھر نظروں میں تولتے ہم گم سٹور سے ملحقہ نکول سکایا (Nikolskaya) سٹریٹ میں داخل ہوئیں۔

یہاں کلاسیکل عمارتیں ہی نہیں تھیں۔ایک عہد، ایک تاریخ، ایک تہذیب ان کے اندر باہر رقم تھی۔

مجھے ڈاکٹر پرویز خان ترین کے الفاظ یاد آئے تھے۔

''جب تم اولڈ ماسکو کی گلیوں میں داخل ہوں گی تو خود کو دائیں بائیں کی عمارتوں، سڑکوں اور چوراہوں اور اُن میں گھومتے پھرتے لوگوں کو حال کی موجودہ تصویر میں ہی نہ دیکھنا۔اس کے تاریخی اور تہذیبی ارتقاء کو اگر ساتھ چلاؤ گی تو لطف اور نشہ دوبالا ہو جائے گا۔''

اور یہ کیسی خوبصورت بات تھی۔میری ظاہری آنکھیں تو کھلی تھیں پر اندرونی آنکھوں کی کھڑکیاں بھی پل جھپکتے میں کھل گئی تھیں اور منظر کتنے واضح ہو گئے تھے۔

تو یہاں دریائے ماسکو کے کنارے گھنے جنگلوں کا راج تھا۔جس میں تیز ہوائیں سرسراتی تھیں۔شہزادہ یوری دولگاروکی اور اُس کے ساتھیوں نے فصیل بنائی اور شہر آباد کیا۔

وقت کے چکر نے شہر کو بھی چکروں میں تقسیم کر دیا تھا۔

پہلا چکر تو خود کریملن کا تھا۔ گو یہ صورت میں مثلث نما ہے۔

کریملن سے کوئی کلو بھر میٹر دوسرا چکر پڑا او کھتونی ریادکا۔ یہ حفاظتی مٹی کی دیوار تھی۔ ان میں گلیاں بنیں مکان بنے۔

پھر تیسرے اور چوتھے چکر پڑے۔ مٹی کی دفاعی لائنیں۔ پانچواں بڑا چکر سادووائے کا تھا۔

وقت کے ساتھ یہ مٹی کی فصیلیں گرتی چلی گئیں۔ شہر نیچی پہاڑیوں پر پھیلتا چلا گیا۔ سڑکیں اور چوراہے چکروں کی صورت خم کھاتے شہر کو ایک صورت دیتے چلے گئے۔ پہلے یہ سڑکیں کچی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے چوبی مکان تھے۔ ان سڑکوں پر گھوڑا گاڑیاں چلتی تھیں۔ پھر اُن پر تارکول چڑھا۔ چھوٹے گھر بڑے ہو گئے۔ نئے تعمیری رنگ آئے۔

بیرونی حملوں اور ارضی و سماوی آفات نے بھی صورت کو بار بار بدلا۔

پر اب جو کچھ سامنے تھا وہ کمال کا تھا۔ قدموں کو چلتے چلتے روکتا تھا۔ میں رائل پرنٹ یارڈ کی عمارت کے سامنے رُکی کھڑی منہ اُٹھائے اس کے رُوسی گوتھک سٹائل کو دیکھتی تھی۔ کیا تاریخی چیز تھی۔ چنی مُنی سی سُرخ چھوٹی اینٹ۔ محرابی اور مستطیل کھڑکیوں کی ڈیزائن داری، ماتھے پر نقش و نگاری، عمارت کی فراخی و کشادگی۔

بلڈنگ آج کل یونیورسٹی آف ہیمنیٹیز (University of humanities) کے تصرف میں تھی۔

1812ء کی آتش زدگی کے بعد کی عمارات میں انفرادیت، رنگا رنگی، شاہانہ کرّوفر اور اندرونی و بیرونی زیبائش میں جو حُسن غالب آیا اُس نے ماسکو ایمپائر سٹائل کو روشناس کیا۔

ان عمارات کے ستون اور اُس پر سرامک کندہ کاری، دروازوں اور کھڑکیوں کے منفرد ڈیزائن۔ میٹھا سا بادامی رنگ اور پیشانیوں پر سجے شیر ایک عہد کی فنی تخلیق کا اظہار تھے۔

ہر مینشن کے سامنے میرا رُکنا مہر النساء کو ناگوار گذرتا تھا۔ پر میں بھی کیا کرتی۔ کہیں کہیں تو اتنا حُسن ہوتا کہ آگے بڑھنا اُس کی تذلیل لگتا۔ چلو رُکنا اور اُسے خراج تحسین پیش کرنا تو ضروری ٹھہرتا تھا۔

ایک سڑک سے دوسری، دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی میں داخل ہوتے گئے۔

لون بینک، آپراکسن مینشن کی بیرونی سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ ملحقہ چبوتروں پر بیٹھے شیروں کے ساتھ تصاویر بنواتے ہوئے ہم نے ڈاؤن ٹاؤن کا مشہور گیت گایا۔

You can always go down town
When you have got worries all the noise and hurry

Just listen to the music of the traffic in the city
And you find somebody kind to help and understnand you
Down Town, Down Town, Down Town

پولی ٹیکنیکل میوزیم کی سہ منزلہ عمارت اپنے رنگ وروپ کے ساتھ متاثر کرتی تھی۔ بس صورت دیکھ کر ہی ہیلو ہائے کر دیا۔ نوایا پلوشد میں کینفے کے سامنے دھری کرسیوں پر بیٹھے تو یاد آیا کہ ڈاکٹر ترین نے کسل (Kisel) خاص الخاص روسی مشروب کے لئے بھی کہا تھا۔

کسل کسل کی رٹ لگائی تو ایک ویٹر نے گز بھر لمبے ہاتھ کا سامنے کی جانب اشارہ دیا۔ وہاں گئے۔ ارغوانی رنگ کا مشروب سامنے آیا تو مجھے کانجی کے لبالب بھرے گلاس یاد آ گئے اب نزاکتوں سے اُسے اٹھایا۔ ابھی چھوٹا سا ایک گھونٹ بھرا، وہ حلق سے بھی نیچے نہیں اترا۔ بس مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سانپ کے منہ میں چھچھوندر والی بات ہوگئی ہے۔ اُگلوں تو کیسے؟ اور نگلوں تو کیسے؟ گلا اگر اس چسکے پر سزا دینے پر تُل گیا تو حشر ہو جائے گا۔ جوڑ جوڑ چٹخے گا اور تپ شوکراں مارتا چڑھے گا۔ بس تو چپکے سے اُٹھی چور آنکھوں سے ڈسٹ بن تلاش کرتی دور نکل گئی۔ اور جب

واپس آئی مہرالنساء چسکیاں لیتے ہوئے کہتی تھی۔

''یہ تو بھئی بڑے مزے کا مشروب ہے۔''

کچھ کہے بغیر چائے لائی اور پی۔ تازہ دم ہوئی۔ سکون سے بیٹھ کر نقشوں کی ورق گردانی کی اور جہاں بیٹھی تھی، یہیں ماسکو ہسٹری کا میوزیم تھا۔ بس دو قدم کے فاصلے پر۔

''کیا ہمارے پاس اُسے دیکھنے کا وقت ہے؟ ہرگز نہیں۔''

میرا خود کو جواب تھا۔ یہاں تو حشر ہوا پڑا ہے۔ اینٹ اُٹھاؤ تو نیچے سے تاریخ کا پٹارہ برآمد ہوتا ہے۔ کیتائی گورد کی تاریخ کتنی دلچسپ تھی۔ آج اور گذرے ہوئے کل میں لپٹی ہوئی۔

آج جو تھا اُس نے حکومتی تاج اُس کے سر پر سجایا ہوا تھا۔

جس طرف نگاہیں اُٹھتیں بیچاری واپسی کا راستہ بھول جاتیں۔ ایک تو عمارتوں کا شاہانہ کروفر، اُوپر سے حکومتی دبدبے کا تڑکا۔ حکومتی زندگی کا اہم مرکز۔

ایلنیکا (Alinica) سڑک پر چلتے ہوئے اُس کا ماضی بھی سامنے آ گیا تھا۔ کبھی اسی سڑک پر ماسکو کی کاروباری زندگی اپنے عروج پر ہوتی تھی۔ رُوس کے مختلف شہروں کی پیداواری چیزوں کی یہاں منڈی لگتی تھی۔ والگا کے جنگلوں سے سمور آتا۔ شمال سے نمک، استراخاں کی مچھلی، ماسکو کی بندوقیں۔

ان سڑکوں پر یوکرینی لڑکیاں اپنے کشیدہ کاری سے مزین لباسوں میں گھومتی پھرتی نظر آتیں۔ سرخ بالوں والے ہیئر بینڈوں سے سجائے اُن کے سر اور سرخ وسفید چوڑے چہرے۔ سائبیرین سر سے پیر تک سمور میں لپٹے۔ تاجک اور ازبک لڑکیاں لمبے لمبے رنگین دھاگوں سے کڑھے گھیردار فراکوں اور سروں کو رنگین ٹوپیوں سے سجائے۔ مرد اپنے اپنے پہناووں میں رنگ برنگے مختلف النوع صورتوں والے کوئی استرخاں ٹوپ پہنے، کوئی جھیری ٹوپی میں کوئی قفقازی لباس میں۔

یہ رُوس اور اُس کی ریاستوں کا نمائندہ مرکز تھا۔ یہ غیر ملکی سوداگروں اور تاجروں کا اڈہ

تھا۔ پر جب سرمایہ داری نظام کی شروعات ہوئی تو یہاں بینک اور سٹاک ایکسچینج کے دفاتر نمودار ہوئے۔ زمین دوز بڑے بڑے خُفیہ تجوری خانے تھے۔ اٹھارویں صدی کے کاروباری سوداگروں کی ٹوپیوں کے کنارے جو تیل اور میل سے اَٹے لشکارے مارا کرتے تھے۔ یہ تیل بھری ٹوپیاں اُنیسویں صدی تک ہیٹوں میں تبدیل ہوگئی تھیں اور رُوس کا سارا محنت کش طبقہ کسی نہ کسی انداز میں ان کی جیبوں کو بھاری کرنے میں دن رات ہلکان ہورہا تھا۔ اُس دور کا بھی ایک اپنا رنگ ڈھنگ تھا۔

اور انقلاب کی آندھی نے وہ اُکھاڑ پچھاڑ کی کہ ایلینکا کی تو ساری رونقیں جیسے ویرانیوں میں ڈھل گئیں۔ سارے ذاتی کاروبار بند۔ بڑی بڑی تجوریوں والے کچھ سلاخوں کے اندر کچھ مُلک سے باہر کچھ آب ودانے والی دنیا سے ہی غائب۔

انقلاب نے کیستائی گوروڈ کی کایا کلپ کرکے اسے ایک نیا اور طاقتور روپ دے دیا۔

یہاں سلیوونیسکا پلوشد (Slavyanskaya PL.) کے ایک بڑے روایتی سے ریسٹورنٹ سے ہم نے سلنیکا سوپ پیا اور اُبلے ہوئے قیمے والے چھوٹے چھوٹے سموسے کھائے جن کا نام بلینی (Blini) تھا۔

مختلف سڑکوں اور چوراہوں سے ہوتے ہوئے ریڈ سکوائیر میں آکر دم لیا۔ گم مارکیٹ کے ایک تھڑے پر بیٹھ کر ٹانگیں پسار دیں کہ تھک کر چُور ہوگئے تھے۔ میں نے بیگ سے ایئر پلو نکالا۔ ہوا بھری سرہانے رکھا اور مزے سے نیم دراز ہوگئی۔ سامنے لینن کا مقبرہ تھا اور کہیں یادوں میں میرا ماضی تھا۔

''ارے یوں بھینس کی طرح پَسر گئی ہو۔ کوئی کیا کہے گا؟''

مہرالنساء نے خفت سی محسوس کی تھی۔

''کاش کوئی مجھے دیکھتا اور کچھ کہتا، اِن خستہ حال چوباروں میں کس نے جھانکنا ہے میری جان۔ سو مجھے ماضی میں کہیں کھونے دو۔''

باب

8

قربتِ لینن میں چند گھڑیاں

Нисколька Часcов Близост Ленина.

کاغذوں کے حرف کہیں آنکھوں میں محفوظ تھے۔ وہ ورقے، وہ صفحے، وہ سطریں جنہوں نے کبھی دل کے تاروں کو چھو کر اس میں ہل چل مچائی تھی اب سامنے تھیں۔

This time we are determined to destroy
With our own hands the pack of imperialists and feudal lords.
No more will they force us to suffer,
No more will they shoot at workers and peasants.
Workers and peasants raise your banners

مجھے یاد ہے، بہت اچھی طرح یاد ہے، آواخر مئی کی وہ چلچلاتی دوپہر جب میں کالج لائبریری میں بیٹھی لیڈر راف ماڈرن تھاٹ ''کارل مارکس'' اور اُس کی بیوی جینی کی زبوں حالی اور کسمپرسی سے بھری ہوئی زندگی پر ایک مضمون پڑھ رہی تھی۔ اختتام پر کمیونسٹ سیاسی قیدیوں کا یہ شہرہ آفاق گیت تھا، بول کیا تھے؟ محرومیوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے اُٹھ کھڑے ہونے کے نمائندہ، جنہوں نے میرے تن بدن میں آگ سی لگا دی تھی۔ غربت کی ماری اِس اٹھارہ

سالہ لڑکی کے شب و روز گھر میں ننہال کی امارت اور والدین کی غریبی کی تلخ سوچوں کی گھمن گھیریوں میں گذرتے۔ سوالوں جوابوں نے حاسدی اور باغی جیسے خطاب سگے رشتوں سے دلوا دیئے تھے۔

کوئی ایک بار نہیں میں نے بیسیوں بار صوتی اور معنوی نغمگی سے لبالب بھرے یہ اشعار زیرِ لب دہرائے تھے۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کالج سے باہر سڑک پر ایک ہجوم بینر اٹھائے کھڑا میرا منتظر ہے۔ بس مجھے بھاگتے ہوئے جا کر ایک بینر اٹھا لینا ہے اور ماموؤں پر چڑھائی کرتے ہوئے یہ پوچھنا ہے کہ جاڑوں میں ان کی صبح نوکر کے ہاتھوں بیڈ ٹی لینے اور کشمیری گاؤن میں ملبوس ہو کر باہر آنے اور میرے ابا کی لنڈے کے اُدھڑے پدھڑے سویٹر، پھٹی پرانی پینٹ اور ہاتھ میں پکڑے رومال میں بندھی روٹی لے کر کام پر جانے کی بھاگ دوڑ میں کیوں ہوتی ہے اور یہ کہ ان کے سٹور خانوں میں گلگت اور اسکردو کے خشک میوہ جاتوں کے بوروں کے باوجود میری خالائیں اور ممانیاں میری ہتھیلی پر چلغوزے اور خوبانیاں فقیر کو دینے والے چٹکی بھر آٹے کی طرح کیوں رکھتی ہیں؟

ہم اتنے غریب کیوں ہیں؟

پھر وقت نے سمجھا دیا کہ چپکی بیٹھو۔ زیادہ اُچھل کود کی ضرورت نہیں کہ ظلم، ناانصافی اور جبر کے خلاف صدیوں سے علم اٹھتے رہے اور اُٹھتے رہیں گے۔ لوگ سینہ سپر ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے، نہ کبھی اور نہ کہیں اس فیوڈیلزم اور امپیریلزم سے نجات ملی اور نہ ملے گی۔ تیسرے درجے کے لوگ کل بھی پھانسیاں لگتے، جلاوطن ہوتے اور خون میں نہاتے رہے اور آج بھی کسی نہ کسی انداز میں اُن کا خون ارزاں ٹھہرتا ہے۔

پر بات اتنی سی ہے کہ رواں دواں وقت کا پہیہ جب اُلٹی چال چلتا ہے نیچے کی مٹی اُوپر آتی ہے، پستی بلندی پر چڑھتی ہے۔ تب بھی انسانیت کا گلا کٹتا ہے، تب بھی خون ارزاں ہوتا ہے۔ سیری اور بھوک ننگ کی نفسیات، خطوں، زمانوں، نسلوں اور مذاہب کے جنون قرنوں

صدیوں سے اسی طرح ہیں اور انہیں ایسے ہی رہنا ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی متمدن کیوں نہ ہو جائے آخر اپنی وحشی جبلت کا کیا کرے گا؟

تو جس دھرتی پر میں اس وقت موجود ہوں۔ جس کے انقلاب کی گونج سے پوری دُنیا چونکی تھی۔ وہ تو مقبرے میں دھری کسی مورتی کی طرح سجاوٹی شے بنا بیٹھا ہے۔ اور فیوڈل لارڈز اور امپیریئلسٹ اسی انقلابی دھرتی پر پھر سے موجیں مارتے پھرتے ہیں۔

Lennin is dead. Bow hammer now and sickle

In sorrow stricken on homage to his soul.

جرمنی کے ایرچ مہسم (Erich Miihsam) کی اس عقیدت بھری خواہش میں کروڑوں انقلابیوں کی خواہش شامل تھی۔

بڑے سال یہ ہتھوڑا اور درانتی دنیائے اوّل کے طاقتوروں کو ڈراتی دھمکاتی اور خوف زدہ کرتی رہی۔ بڑے سال یہ دنیائے دوم اور سوم کے محنت کشوں فاقہ زدوں کو اُمید اور روشنی کا پیغام دیتی رہی۔

مجھے آج بھی یاد ہے، ستر (70) کی دہائی کے وسط میں اپنی ایک پیشہ ورانہ ٹریننگ کے دوران سوویت روس پر ایک سبق کی تیاری کے لئے چارٹ پر ہتھوڑا اور درانتی کو عین اُوپر نہ بنانے پر کیسے ٹیچر کی لعن طعن نے میرا خون جلایا تھا۔

''کمبخت اسے دلکش بناؤ۔ اس میں خوبصورت رنگ بھرو کہ یہ غریب کی اُمید ہے۔''
میری اُستاد نے کسی غصیلے کامریڈ کی طرح آنکھیں دکھائی تھیں۔

پتہ نہیں میری وہ اُستاد اب کہاں ہے؟ کہیں ملے تو کہوں۔

''مس وہ ہتھوڑا اور درانتی تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئے ہیں اور سارے میں وہ شاہی امپریلزم کا امتیازی نشان دو مونہا عقاب اپنے پَر اور پنجے جھاڑ کر پرانے عہدے پر بحال ہو گیا ہے۔''

چلّی کے ہیوڈوبرو (Huidobro) کے خراج عقیدت میں اس کی پوری شخصیت سمٹی ہوئی تھی۔

Strogner than the song of life
Stronger than death itself
Stronger than the grief of remembrance
Stronger than the anguish of time
Is your presence in the heart of the world

10 دسمبر 1870ء کو سمبرسک میں پیدا ہونے والا ولادی میر ایلیچ الیانوف پیدائشی جری تھا یا اُسے حالات نے جری بنا دیا تھا۔

وہ سرکش اور باغی سا تھا۔ اپنے بچپن ہی سے۔ ایک دن گھر میں آنے والے نہایت معزز مہمان سے باتیں کرتے کرتے اچانک اُس کے والد الیانکولیوچ الیانوف نے کہا۔

''میں بہت پریشان ہوں۔ میرے بچے چرچ جانا پسند نہیں کرتے۔''

مہمان ہنسا۔ لینن کی طرف دیکھا اور بولا۔

''بید سے خوب ٹھکائی کرو۔ سیدھے ہو جائینگے۔''

اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ گلے میں پڑی صلیب والی چین اُس نے ہاتھ بڑھا کر وحشی انداز میں نوچی اور اُسے مہمان کے سامنے پھینک کر کمرے سے بھاگ گیا۔ اُس وقت اُس کی عمر دس سال تھی۔

بہنیں اور بھائی سب کے سب سوچوں میں منفرد، محنتی اور عام روایتی ڈگر سے ہٹ کر کام کرنے والے۔ ماں باپ پڑھے لکھے تھے۔ الیانکولیوچ الیانوف کازان یونیورسٹی میں فزکس اور ریاضی کا اُستاد تھا اور اور ماں ماریا الیگزینڈرونہ سکول انسپکٹریس۔

صرف سترہ برس کا تھا۔ جب اُس نے پھاہے لگے (پھانسی لگے) اپنے بڑے بھائی الیگزینڈر الیانوف کے لاشے کو دیکھا۔ جُرم تو وہی تھا کہ نعرے لگاتا تھا اُٹھو میری دُنیا کے غریبوں

کو جگا دو۔ کاخ امراء کے درو دیوار ہلا دو۔

زار الیگزینڈر سوم پر قاتلانہ حملے میں اُس کا نام بھی تھا۔ وہ رویا پر اپنی آنکھوں سے ٹپکتا پانی اُسے لہو لگا۔ وہ باہر بھاگا۔ بھاگتا چلا گیا۔ رُکا۔ پھر ایک آواز اُس کے جسم و جان کی پوری قوت سے اُس کا تن من پھاڑتی فضاء میں گونجی تھی۔

''انقلاب۔ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ انقلاب کے لئے وقف کرتا ہوں۔''

''کارل مارکس'' کو باریک بینی سے پڑھنے کے ساتھ ساتھ کازان یونیورسٹی میں طلبہ کی انقلابی سرگرمیوں کا لیڈر بھی بن گیا اور گرفتار بھی ہو گیا۔ پولیس کے سنیئر افسر کی نظروں میں تلوار جیسی چمک تھی۔ لہجے میں برچھی جیسی کاٹ تھی۔

''انجام جانتے ہو۔''

''میں پہلا اور آخری حرف ہوں۔ ابتداء بھی ہوں اور انتہاء بھی۔''

اُس کے چہرے پر خوف نہیں تھا۔ لہجہ پُر اعتماد اور آنکھوں میں کچھ کر جانے کی چمک۔

پولیس افسر نے بغور دیکھا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔

''زندگی شاعری نہیں۔ یہ تلخ حقیقت ہے۔ نوجوان ہو، خود کے دشمن بن گئے ہو۔ سامنے تو لوہے کی دیوار ہے۔ ٹکریں مارو گے تو کس کا سر پھٹے گا؟''

''کسی کو بارش کا پہلا قطرہ تو بننا ہے اور وہ میں کیوں نہ بنوں۔ یہ یاد رکھئے کہ ظلم و جبر اور استحصال پر کھڑی دیواریں بظاہر لوہے کی نظر آتی ہیں۔ مگر وہ مٹی کی ہوتی ہیں اور وہ بھی بودی۔ ایک زوردار دھکا لگے گا تو گر جائیں گی۔''

آفیسر نے مزید کچھ کہنے کی بجائے سر کاغذات پر جھکا لیا تھا۔

ہر کامیاب مرد کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔ ولادی میر لینن کی پشت پر تین عورتیں تھیں۔ ماں، بیوی اور بہن۔ اس کی ماں میکسم گورکی کے ناول ''ماں'' جیسی ہی تھی، بلند ہمت اور پُر عزم۔

ایک بار بیٹے سے ملنے جیل گئی۔ جیل کے داروغے نے خوفناک سرخ آنکھوں سے گھورا۔ طنز اُس کے چہرے پر غازے کی طرح چمکا تھا۔ بھدّی اور کرخت آواز نفرت اور گھٹیا پن سے بھری ہوئی تھی۔

''زار شاہی کو تم جیسی عورتوں کو تمغے دینے چاہئیں۔ کیسے قابل فخر بیٹے جنے ہیں تم نے۔ ایک تو پھانسی لگ گیا ہے اور دوسرا لگنے کو تیار ہے۔''

ماریا الیگزینڈر رووِنہ نے کچھ نہیں کہا۔ غم اور پریشانیوں کو تو پینے کھڑی تھی۔ چُپ چاپ آگے بڑھ گئی۔ پر قدرے آگے جا کر واپس پلٹی تھی۔ ایک ٹک داروغے کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''شاید میں نہ دیکھ سکوں۔ تم اگر زندہ رہے تو ضرور دیکھو گے کہ وہ ایک دن رُوس کے آسمان پر سورج کی طرح طلوع ہوگا۔''

اپنے بیٹے کے معاشی مسائل کا اُسے ہمیشہ احساس رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اُسے اپنی پنشن میں سے تھوڑی سی رقم ضرور بھیج دیتی۔ اُس کے بہت سے خطوں میں اس اصرار پر کہ وہ اُس کے پاس آجائے، پڑھتی۔ دُکھ کی بوجھل مسکراہٹ میں نہاتی۔ پھر اُس کا چہرہ خود کلامی کی کیفیت میں ڈھلتے ہوئے بولنے لگتا۔

''اِلیچ ممتا والی چنتا تو تیرے بارے میں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ پر تیرے لئے تیری بیوی کی محبت اور سچی چاہت دیکھ کر مطمئن بھی بہت ہوں۔''

ستر (70) سال کی بوڑھی عورت جو اپنے گھر میں تنہا رہتی ہے۔ اپنے گردو پیش میں اپنی ہم عمر عورتوں کو پوتے پوتیوں، بیٹوں بیٹیوں میں گھرا دیکھتی اور اُن کے خوشیوں بھرے قہقہے سنتی اور پھر افسردگی میں ڈوبی اُن دنوں کے حساب کتاب میں اُلجھ جاتی کہ کب کب کہاں کہاں اور کس کس جیل میں اُسے اپنے بیٹے، بیٹی اور داماد سے ملنے جانا ہے۔ انہیں دیکھنا ہے۔ ان کا حوصلہ بڑھانا ہے اُن سے حوصلہ لینا ہے۔ وقت تو گاڑیوں راستوں، جیلوں اور قلعوں کی انتظار گاہوں میں گذر جاتا ہے۔ بولو۔ تم ہی مجھے بتاؤ کہ تمہارے پاس کیسے آسکتی ہوں؟ ہاں تمہارے

خط جس میں تم مجھے لکھتے ہو کہ میرا کوارٹر ہر صورت گرم رہنا چاہیے اور یہ کہ مجھے صرف لوہے کا اسٹوو استعمال کرنا ہے۔ کھانے میں گوشت اور پھل ضرور لینے ہیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ یہ سب مجھے اچھا لگتا ہے اور مجھے اِن اندھیروں میں حوصلہ اور توانائی دیتا ہے۔

پیٹرز برگ کے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں پڑھنے والی لڑکی نادیزدا کرپسکایا (Nadezhada Krupskaya) جس کا چہرہ خوبصورت تھا۔ آنکھوں میں کام کرنے اور صعوبتوں کو برداشت کرنے کا عزم تھا۔ سیدھے سنہری بالوں کے نیچے دماغ انقلابی تھا۔ تن پر معمولی سا لباس قناعت اور سادگی کا مظہر تھا۔ ایک سوشل ڈیموکریٹ گروپ کی طرف سے قائم سٹڈی سرکل میں مزدوروں کو فارغ وقت پڑھایا کرتی تھی۔

لینن نے قانون پڑھا پر وکالت کی بجائے انقلابی سرگرمیاں اس کا محور تھیں اور پیٹرز برگ کی زمین زیادہ انقلابی تھی اور یہیں وہ نادیزدا کرپسکایا سے ملا۔

کرپسکایا کے سٹڈی سرکل میں نکولائی پیٹرو واچ کے فرضی نام سے لیکچر دینے لگا۔ بظاہر اس کی شخصیت ذرا متاثر کن نہ تھی۔ پر اس کا علم، اُس کا اندازِ بیان، اُس کے دلائل سیدھے دل میں اُترتے۔ وہ "مارکس کی کیپیٹلزم" (Capitalism) میں سے تھوڑا سا پڑھتا، اُس کے ہر پہلو کی وضاحت کرتا۔ پھر مزدوروں سے اُن کے کام اور حالات کار کے بارے میں پوچھتا۔ سادہ سے لہجے، سادہ سی زبان میں روزمرہ زندگی کی مثالوں سے ہی وہ مزدوروں کی زندگی کو سماج کے ڈھانچے سے جوڑ دیتا۔ اُس کے ہاں نظریہ اور عمل لازم وملزوم تھے۔

کرپسکایا شدید متاثر ہو چکی تھی۔

اُس کے کام میں چیتے جیسی تندی اور تیزی تھی۔ لیف لیٹس کی تیاری میں اُس کا گہرا انہماک توجہ اور لینن کی مشاورت کے لئے اُس کی طرف کرپسکایا کا غیر معمولی جھکاؤ اُس کے دلی جذبوں کا عکاس تھا۔

گرفتاریاں ہو گئیں۔ دونوں پکڑے گئے۔ لینن کو سائبیریا بھیج دیا گیا۔ اور جب اُسے

کہیں اور جلاوطن کیا جانے لگا۔ وہ افسران بالا کے سامنے پیش ہوئی۔ اُس نے کہا۔

''مجھے شوشن شکوئے بھیجو۔''

لینن اُسے Shu. shu. shu کہتا تھا۔

اس کی درخواست مان لی گئی تھی۔ جب وہ وہاں پہنچی۔ اُس نے ہنس کر کہا۔

''تو اب بیاہ کرتے ہیں اور اس جہنم جیسی زندگی کو جنت میں بدلتے ہیں۔ دونوں کا بیاہ ہو گیا۔''

وہ لینن کا سایہ تھی۔ سائبیریا کے بیانوں سے لے کر'' کریملن اور گورکی'' کے اُس کمرے تک جہاں اُس نے آخری سانسیں لی تھیں۔ زندگی جہد مسلسل تھی۔ معاشی مسائل نے ہمیشہ پریشان کیا۔ جینوا، لندن، میونخ، پیرس، سوئزرلینڈ کے سستے ترین علاقوں میں ایک ایک کمرے کے فلیٹ میں اُن کی جلاوطنی کا سارا وقت گذرا۔

کام کا غیر معمولی پریشر، پارٹی کے مسائل اور اُن کے جھگڑے۔ ''اسکرا'' (ہفت روزہ) کے اداراتی بورڈ میں ممبران کے درمیان ڈھیروں ڈھیر مسائل، توڑ جوڑ، ملک کے دگرگوں سیاسی حالات، وہ استقامت سے اُس کے ساتھ اس کا دستِ راست بن کر ہمیشہ کھڑی رہی۔ ''اسکرا'' کے مضامین کی پروف ریڈنگ کرتی۔ اندرون ملک کامریڈز کے خطوط کو پڑھتی۔ لینن کی ہدایات پر اُن کے جواب لکھتی۔

دودھ اور لیموں سے لکھے جانے والے ٹاپ کنفیڈنشل خطوں کو بھی پڑھنے کی ذمہ داری اُسی کی تھی۔ یہ خط پڑھنے بہت دشوار تھے۔ کانگریس کی میٹنگوں میں ممبران کی آپس میں تلخیاں، لینن کا شدید جذباتی تناؤ میں آنا، رُوسی جلاوطنوں کی ابتر حالت اور فنڈز کی کمی یہ سب وہ پریشانیاں اور مسائل تھے جو اکثر اُسے اپ سیٹ کرتے۔ ایسے میں اُسے نارمل کرنا کرپسکایا کا وہ کام تھا جسے کرتے ہوئے اُس نے کبھی اکتاہٹ یا بیزاری محسوس نہیں کی۔

لینن کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ اور اُن کے پاس ڈاکٹر کا علاج کروانے کے لئے پیسے

نہیں تھے۔ زبردستی کروپسکایا اُسے معائنے کے لئے لے گئی۔

اسے ''ہولی فائز'' ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا۔

اور کرپسکایا نے لمبی سانس بھرتے ہوئے ڈاکٹر سے مرض کی تفصیل سنی کہ یہ کمر اور سینے کے اعصابی سروں پر سوزش کی ایک بیماری ہے۔

اور علاج کیسے ہوتا کہ اُن کے پاس ڈاکٹر کی فیس ایک گنی بھی نہیں تھی۔

دونوں گھر آئے۔ لینن کرسی پر بیٹھا چپ چاپ، سنجیدگی اور تفکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب اُس نے کہا۔

''اپلیچ وہ گیت گاؤ جو تمہارا فیورٹ ہے۔''

I love you, love you, without end.

وہ مسکرایا اور بولا۔

''تم بڑی ظالم ہو۔''

اور اُس شام اُس چھوٹے سے کمرے میں اُن دونوں کی آوازوں نے مل کر بہت سارے گانوں کی ٹانگیں توڑیں۔

" They did not marry us in the church."

" The jolly day of May has come."

" Comrad, March, march, march."

کوئی بھی گیت انہیں پورا نہیں آتا تھا۔ بس وہ گاتے رہے، ہنستے رہے اور اس ہنسی میں اپنے غم اور پریشانیوں کو تحلیل کرتے رہے۔ جہاں قوت ارادی زبردست ہو، محبت و پیار اور احساس کی فراوانی ہو تو پھر گھریلو ٹوٹکے بھی مسیحائی کا کردار ادا کر دیتے ہیں۔

میوزک کا حد درجہ دلدادہ۔ بہت مگن ہو کر موسیقی سنتا۔ یاداشت تو یوں بھی کمال کی تھی۔ زمانوں پرانے گیت اور موسیقی کی دُھنیں اُن کے ساتھ وابستہ یادیں بھی اپنی تفصیلی جزئیات کے

ساتھ یا د ہوتیں۔ وائلن کا بہت شوقین۔ پیانو بھی کمزوری تھا۔ بیتھووان کے سانیٹز Pathetique and Appassionata بہت پسند تھے۔ اکثر جذب کے عالم میں نیم وا آنکھوں سے وہ اُداسی میں لپٹی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کرپسکایا سے کہتا۔

''جی چاہتا ہے میں appassionata کو روز سنوں اور سنتے سنتے اس میں گم ہو جاؤں۔ یہ کیسی جسم و جان میں حلول کرتی سحر انگیز موسیقی ہے۔ پر میں اسے ہر روز نہیں سن سکتا۔ یہ میرے اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے۔''

کلاسیک لٹریچر کا بڑا شائق۔ ٹالسٹائی کو بار بار پڑھتا۔ لطف اُٹھاتا اور کہتا۔

''کرپسکایا یورپ میں ٹالسٹائی کا مقابلہ کس سے کروگی؟

اپنے ہاتھوں کو خوشی و سرشاری سے مسلتے ہوئے وہ اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتا۔

''کسی سے بھی نہیں۔ کوئی بھی اُس جیسا نہیں۔''

بیلے کی نسبت اوپیرا زیادہ پسند تھا پر اکثر پہلے ایکٹ کے بعد اُٹھ جاتا تھا۔ تھیٹر بھی شوق سے دیکھتا۔ اچھی پرفارمینس ہمیشہ اُسے شدید متاثر کرتی۔

لکھنے میں رفتار حیرت انگیز تھی۔ تحریر ہمیشہ لوجک پر ہوتی۔ تصحیح کی ضرورت بہت کم پڑتی۔ تقریر ہمیشہ سادہ اور جوش و جذبے سے پُر ہوتی۔ بولنے کا انداز بھی سادہ ہوتا۔ خالصتاً رُوسی سٹائل۔ یہ جذباتی طور پر چارج کرتی پر مصنوعی نہ لگتی۔ لفظوں کا انتخاب ہمیشہ اچھا اور خوبصورت ہوتا۔

وہ ہمیشہ جذبے کی بھرپور سچائی سے بات کرتا خواہ یہ نجی گفتگو ہوتی یا پبلک میں کوئی تقریر۔ جب بھی وہ کمرے میں چکر کاٹنے لگتا۔ اُس کی خود سے باتیں یا سرگوشیاں شروع ہو جاتیں اور وہ جذباتیت کے بہاؤ میں آ جاتا۔ کرپسکایا کا کہنا تھا۔

میں سمجھ جاتی تھی اور اُس کے پاس ہوتے ہوئے بھی خود کو غائب کر لیتی۔

سیر کے دوران بھی اگر مجھے اس امر کا احساس ہو جاتا تو میں اُسے کبھی ڈسٹرب نہیں کرتی

تھی۔تھوڑی دیر بعد اگر اُس کا جی چاہتا وہ تفصیلی بات کرتا۔ایسے وقت میں وہ بحث اور مداخلت کو قطعی پسند نہیں کرتا تھا اور میں ہمیشہ اس کا خیال رکھتی تھی۔جب بھی وہ باہر کہیں کسی ڈیبیٹ پر جاتا، اپنی واپسی پر اکثر وہ افسردہ، خاموش اور کم ہمت سا ہوتا۔اور ایسے وقت میں مَیں سوالات کرنے سے گریز کرتی۔اکثر بعد میں وہ مجھے تفصیلاً سب کچھ بتاتا۔

اس کی بیماری کے دوران ڈاکٹر اُسے پڑھنے لکھنے سے منع کرتے، تب وہ مجھ سے کہتا۔

''یہ تو زیادہ نقصان دہ ہے۔وہ مجھے سوچنے سے روک نہیں سکتے اور نہ میں خود کو ایسا کرنے سے باز رکھ سکتا ہوں۔''

اُس کی شخصیت میں اثر پذیری کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ردِّعمل ہمیشہ بڑا طوفانی ہوتا۔برسلز میں پلیخانوف کے ساتھ ایک جھگڑے میں جب وہ فوراً پلیخانوف کے طنزیہ ریمارکس پر جواب آں غزل لکھنے بیٹھا۔اُس نے کٹیلے لہجے میں کہا تھا۔

''بلاشبہ میری حیثیت ایک گھوڑے سے زیادہ نہیں۔میں کوچوان پلیخانوف کے گھوڑوں میں سے ایک ہوں۔انتہائی صبر والا گھوڑا۔لیکن جس طرح وہ مجھے زِچ کرنے پر تلا ہوا ہے ایسے میں صبر والا گھوڑا اُسے پھینکے گا نہیں تو اور کیا کرے گا۔''

میں کمرے میں کھڑی اس سنگین صورت حال کو دیکھتی تھی کہ وہ کس قدر شدید دباؤ میں ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ پلیخانوف بہت باصلاحیت اور گہری دانش کا مالک تھا۔لیکن انقلابی اور عملی جبلت سے خالی تھا۔لینن حقیقت پسند انقلابی تھا اور اُسے لگا تھا کہ پلیخانوف کا ذرافت انقلابی عمل کی راہنمائی کے لئے قطعی موزوں نہیں۔میں نے اُس کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا اور اُسے سیر کے لئے چلنے کی ترغیب دی۔

"Let's go take a look at the Cathedral."

اُس کا جواب تھا۔

لباس سے لے کر کھانے تک میں ہمیشہ سادگی ہوتی۔لینن کو دہی بہت پسند تھا۔سٹرابیری

سے چڑ تھی۔ کریملن میں جب وہ سیاہ وسفید کا مالک تھا، اُس کے رات کے کھانے اور دوپہر میں چائے، بلیک بریڈ، مکھن اور پنیر ہوتا۔ اگر کبھی کوئی غیر ملکی مہمان آ جاتا، میٹھے کی ضرورت پڑتی تو لینن کی بہن بھاگی پھرتی۔ ادھر اُدھر ہاتھ مارتی۔ کہیں کوئی جار ملتا۔ تھوڑا سا جام یا جیلی اُس کے اندر ہوتی۔ بس تو اسی سے تواضع ہو جاتی۔

قحط سالی کے دنوں میں جب کارکنوں کو کھانا راشن پر ملتا تھا۔ ملک بھر سے لینن کو گوشت، پھلوں، سبزیوں اور بیکری کی اشیاء تحائف کی صورت آتیں جنہیں وہ ہمیشہ فوراً اسپتالوں اور بچوں کے سکولوں میں بھجوا دیتا۔

ایک بار اُس کی بہن ماریا ایلنچنا (Ilyinichna) نے کہا۔

''ولوڈایا (Volodya) تم کچھ اپنے لئے بھی رکھ لیا کرو۔ تم بھوک سے کمزور ہوتے جا رہے ہو۔ انقلاب کی کامیابی کو تمہاری صحت کی ضرورت ہے۔''

''میں کچھ نہیں کھا سکتا جب کہ مجھے علم ہے کہ میرے کارکن لوگ اور بچے بھوکے ہیں۔''

میکسم گورکی اپنی پہلی ملاقات کا احوال قلم بند کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

اُس کا ہیروازم اس کی ظاہری شخصیت کا محتاج نہیں تھا۔ وہ رُوس کا حد درجہ مخلص دانشور، عملی انقلابی، اپنی ذات میں درویشی جیسی صفات کا حامل، نہ ٹوٹنے والا جس کی زندگی کا اوّلین مقصد دنیا کے لوگوں کو انصاف اور خوشیاں بانٹنا تھا۔

جب ہم ایک دوسرے سے ملے اُس نے میرے ہاتھوں کو مضبوطی سے دبایا اور کہا۔

''کتنا اچھا ہوا کہ تم آئے ہو۔''

میں اُس سے کبھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی اُس کے متعلق کچھ زیادہ پڑھا تھا۔ لندن کے ساؤتھ گیٹ روڈ پر برادرہوڈ چرچ وائٹ چیپل کا وہ ننگی دیواروں والا مضحکہ خیز سا کمرہ ابھی بھی میری نظروں کے سامنے تھا جس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں اس ہال میں کھلتی تھیں جو ایک بھدے سے سکول کے کلاس روم کا تاثر دیتا تھا۔

میرے ذہن میں اُس کے متعلق ایسا تصور نہیں تھا جیسا وہ مجھے نظر آیا تھا۔ اپنے کوٹ کے بازوؤں کے پھٹے سوراخوں میں اپنے انگوٹھے گھسیڑتا اور حلق سے آوازیں نکالتا مجھے محسوس ہوا تھا۔ اُس میں کسی چیز کی کمی ہے؟ کس چیز کی؟ میں کچھ اُلجھا ہوا تھا۔

بہت سادہ تھا۔ لیڈروں والی کوئی بات نہیں تھی اس میں۔ ظاہر ہے میں لکھنے والا تھا اور باریک بینی اور تفصیلات میں اُترنا میری سرشت میں داخل تھا۔

پر جب ''آ سکرا'' کے ادارتی بورڈ کے سینئر اہم ممبر پلیخا نوف سے میرا تعارف ہوا۔ اُس نے سنگ دلانہ نظروں سے مجھے اُس تھکے ہوئے اُستاد کی طرح دیکھا کہ جو کہتا ہو۔

''لوایک اور نیا شاگرد آ گیا ہے۔''

اتنا ضرور اُس نے کہا۔

''میں تمہارے ٹیلنٹ کا مداح ہوں بس۔''

لیکن وہ بے کیف، ظاہری دلکشی سے عاری، گنجا آدمی جو مسلسل اپنی سقراطی بھنوؤں کو ایک ہاتھ سے مسلتے اور دوسرے سے میرے ہاتھوں کو جھٹکا دیتے، اپنی مسکراتی روشن آنکھوں سے ''ماں'' کے بارے میں بولنا شروع ہو گیا تھا۔

''موجودہ وقت کو ایسی ہی کتاب کی ضرورت تھی۔ پر مزید لکھو کہ سرمایہ دار کس طرح زمین اُس کے تیل، لوہے، لکڑی اور کوئلے پر قابض ہو کر مزدور کی زندگی جہنم بنا رہا ہے۔''

لینن کے کردار کا یہ ایک مثالی اور روشن پہلو تھا کہ وہ جذباتیت، اپنی ذاتی پسند ناپسند کو اصولی سیاسی مسائل سے کبھی گڈ مڈ کرنے کی ہلکی سی بھی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اُس میں لوگوں کی صلاحیتوں کو پہچاننے کی ایک قدرتی حس تھی۔ ذاتی نفرت اُس کے قریب سے بھی نہیں گذری تھی۔

انقلاب کے بعد جب لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا۔ غیر تربیت یافتہ ان پڑھ بالشویک مزدوروں نے اپنے آپ کو صنعت وحرفت کا مالک سمجھنا شروع کر دیا۔ پورے مُلک میں طوائف

الملکی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ گورکی نے اپنے ذاتی اخبار ''نوایا'' میں بالشویکوں پر نکتہ چینی کی تو اُس کے اخبار کو بند کرنے کا مطالبہ ہوا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' لنین مسکرایا۔

''گورکی ہم میں سے ہے۔ گورکی غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ سچی بات لکھتا ہے۔ اُسے رجعت پسندی کے دورے ضرور پڑتے ہیں۔ پر جو کچھ ہورہا ہے یہ بھی تو ہمارے لئے تباہ کن ہے۔ ہمیں اپنی کمزوریوں کو درست کرنا ہے۔ گھبراؤ نہیں وہ ہمارے پاس واپس آئے گا۔''

چھوٹی سی قامت پر بڑے دماغ اور ملک کے لئے اونچے اونچے خواب دیکھنے اور انہیں پورا کرنے کا عزم رکھنے والے کی ذہنی سوچ، کام کا طریق کار اور اُس کی ادائیگی سبھی سائنسی انداز کے تابع تھے۔

انقلاب کے بعد پورے رُوس کے ریلوے نظام کی بوسیدگی اور تنزلی لمحہ فکر تھی۔ ملک کے طول و عرض کو برقانے (Electrification) انگلینڈ اور ہالینڈ کی طرز پر سیٹ کرنے میں اُس کا جنون دیکھ کر برطانیہ کا ہربرٹ جی ویلز دنگ رہ گیا تھا۔ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

''زمینی حقائق کو سامنے رکھیے۔ انگلینڈ اور ہالینڈ کی طرف مت دیکھیے۔ ان کی گھنی تعلیم یافتہ آبادی، اعلیٰ درجے کے صنعتی علاقوں اور مرکزوں میں ایسے منصوبے اقتصادی اور کاروباری لحاظ سے بہت کامیاب ہو سکتے ہیں پر رُوس جیسے پس ماندہ، گھنے جنگلوں پر مشتمل علاقے، جہاں اَن پڑھ کسانوں اور بے ہنر لوگوں کی اکثریت رہتی ہے اور جس قسم کے حالات کا ملک سامنا کر رہا ہے۔ ان خوابوں کی کامیابی ممکن نہیں۔

''صرف دس سال۔ ہمارے عزائم کے سامنے کچھ بھی مشکل نہیں۔''

اُس کے کام کرنے کا انداز حیرت انگیز تھا۔

الیگزینڈر سرافیموچ (Scrafrmovich) لکھتا ہے۔

''یہ انقلاب کے ابتدائی دن تھے۔ ایجوکیشن کمسار (وزیر وزارت) کی سربراہی میری

تحویل میں دی گئی۔ اس وقت پرانا لٹریچر کہیں کھڈے لائن لگا پڑا تھا اور انقلاب سے پہلے کے لکھنے والے بھی غائب تھے۔ نئے پرولتاری لٹریچر نے ابھی کوئی واضح صورت اور رنگ نہیں پکڑا تھا۔ اس وقت صرف مایاکووسکی ہی ادبی منظر نامے پر حاضر تھا۔ مجھے انقلاب کے حامیوں سے لکھوانا تھا جو یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ اور ولادی میر ایلچ اس کے لئے بہت بے چین تھا۔ ایک دن مجھے رپورٹ کے لئے بلایا گیا۔ میں کریملن پہنچا۔

اکتوبر کا یہ چمکتا دن، ہواؤں میں جھومتے درختوں کے پیلے پتے، کریملن سے باہر سینٹ باسل چرچ کا ایک گنبد، جو شیل سے زخمی ہو چکا تھا اور جس کی ابھی بھی مرمت نہیں ہوئی تھی سب ایک پُر اثر منظر کے عکاس تھے۔

مجھے ایک بڑے ہال میں لے جایا گیا۔ غیر معمولی بڑا کمرہ، غیر معمولی بڑی میز جس کے گرد تقریباً اسی (80) کے قریب ایڈمنسٹریٹر کمسار (وزیر) اُن کے ڈپٹی، ڈپارٹمنٹوں کے سربراہ، کمیٹی چیئرمین اور دوسرے صوبوں کے لوگ موجود تھے۔

کامریڈ لینن صدارتی کرسی پر تھا۔ میں نے دیکھا کہ سپیکر کو ایوان میں بحث کے لئے کہا جاتا۔ ٹو دی پوائنٹ بات اور اگر وہ کہیں فنِ خطابت میں کسی فضولیات میں پڑتا تو اُسی وقت ٹوک دیا جاتا۔ نوٹس لئے جاتے۔ مختصر بحث۔ طریق کار واضح۔ آگے بڑھیئے۔

کاغذ کی قلّت کا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ بتایا گیا کہ فوری طور پر سرخ فوج، سویلین اور پبلیشنگ کے لئے کاغذ کی اشد ضرورت ہے۔

لینن نے اپنے سامنے پڑا فولڈر اٹھایا اور کہا۔

''اس فولڈر میں کاغذ کی صنعت اور کاغذ سازی کی فیکٹریوں جو بہترین کارکردگی کی حامل ہیں سے متعلق پروجیکٹ کے کاغذات ہیں۔

لینن کامریڈ شیوڈ چکوو (Shvedchikov) جو پیپر پروڈکشن کے انچارج تھے سے مخاطب ہوئے۔

آپ اس پروجیکٹ کے خالق کے ساتھ باہر کوریڈور میں چلے جائیں۔ یہ آپ کو اس کے بارے میں آؤٹ لائن دے گا۔ اگر آپ نے اسے منظور کیا تو ہم اس پر کسی قسم کی بحث کئے بغیر اسے اوکے کریں گے اور اگر آپ نے محسوس کیا کہ یہ محض بکواس ہے اور منصوبہ ساز نے وقت ضائع کیا تو اسے تین دن حراست میں رکھا جائے گا۔

میں صرف پانچ منٹ دوں گا۔''

میٹنگ اگلے مسئلے پر شروع ہوگئی۔ دونوں باہر چلے گئے۔ منصوبہ ساز کچھ خاموش سا نظر آتا تھا۔ چہرہ چقندر کی طرح سرخ تھا۔ پانچ منٹ بعد دونوں کی واپسی ہوئی۔

''یہ ٹھیک ہے۔''

فولڈر منظوری کے ساتھ سیکرٹری کو ایک منٹ میں حوالے کر دیا گیا۔

ایسے ہی روس نے نیم تاریک اندھیرے میں سے چھلانگ مار کر روشن دنیا میں قدم نہیں رکھ دیا تھا۔ اُس کی ترقی نے ایک زمانے کو حیران پریشان کر دیا تھا۔ سوال اُٹھتا تھا، روسی انسان ہیں یا جن؟

وہ مخلص اور خاموش کام کرنے والوں کا بہت مداح تھا ہمیشہ انہیں یاد رکھتا۔ جب کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ مرتب ہو رہی تھی۔ اُس نے اُن سب لوگوں کے بارے میں مختصر نوٹس لکھوائے جنہوں نے کام کا آغاز کیا پر اس کا نتیجہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے۔

اُس کے الفاظ آغاز ہی محنت طلب کام ہے۔ زیرو سے شروع۔ صبر کے ساتھ نظریات کا پھیلاؤ۔ ایک ایک دو دو لوگوں کا قائل ہونا۔ تنظیم، تعمیر جنہیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

موت نے بالآخر اُس انسان کو پچھاڑ دیا تھا جو ذہنی طور پر بہت طاقتور تھا۔ جس کی قوت ارادی بے مثال تھی۔ جو آہنی خیال کیا جاتا تھا۔ جس کے دل کے دورہ کا سن کر ایک ہی سوال گردش میں آیا۔ لینن کو کیا ہو سکتا ہے؟ اُس کے دل جیسا دل تو پورے رُوس میں کسی کا نہ ہوگا۔ سخت جان۔

یہ جملہ میرے ہونٹوں نے نہیں میرے دل نے کہا تھا۔

میں جانتی تھی کہ اگر یہ میرے اندر سے اٹھ کر لہروں پر تیرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا تو سوال جواب کا لمبا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔ ہم لکھنے والوں کے جو بندھن اجنبی سرزمینوں کے کاغذ قلم اور فن سے رشتہ رکھنے والوں سے جڑے ہوتے ہیں وہ عام لوگوں کی سمجھ میں کب آتے ہیں۔ دوستووسکی سے بڑا کون اپنا ہوسکتا ہے؟

فاروق ہمیں ٹکٹ رات پہنچا گیا تھا۔ ہم نے ساتھ لے جانے والا سامان نکال کر بقیہ اُس کے حوالے کر دیا تھا۔ اُس نے تاکید کی تھی کہ چیک آوٹ سے قبل رجسٹریشن لیٹر کا پاس ہونا ضروری ہے۔ ناشتے کے بعد رجسٹریشن بلاک کی طرف گئے۔ بڑی پکی پیٹھی کاروباری عورتیں مختلف کمروں میں بیٹھی کاغذات کے پلندوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ ہماری درخواست پر مزے سے بولیں۔

ہفتہ اتوار ماسکو میں چھٹی کے دن ہیں۔ رجسٹریشن تو ہو ہی نہیں سکتی۔

''لو میاں کرلو گل۔''

اپنے آپ سے کہتے ہوئے ہم نے اپنے بلکے سے بیگ کی سٹریپ اپنے کندھوں پر ڈالی ''دفع کرو جی جو ہوگا دیکھا جائے گا'' کا سوچا اور ''چلو چلو کم سومولسکا یا چلو'' کا نعرہ جی ہی جی میں لگایا۔

کم سومولسکا یا میٹرو کا مرکزی اسٹیشن ہے۔ واہ جی واہ! کیا بات تھی اُن راہداریوں کی جن سے ہمیں گذرنا پڑا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی عوامی گذرگاہ سے نہیں کسی خاص الخاص محل کے کسی برآمدے میں موجود ہیں۔ لمبے کشادہ راستے جن کے دونوں اطراف کے گول ستونوں پر محرابی دیواروں اور محرابی چھت نقاشی کے فن اور اُس سے لٹکتے درجنوں شاندار شینڈ لیرز سے بجی حیرتوں کے دروازے وا کرتی تھی۔ ستونوں کے درمیان دھرے آرام دہ بینچوں پر سکون سے بیٹھنے، لیٹنے اور اگر دل چاہے تو ٹیک لگا کر رُوس کے اس عظیم کارنامے کو سراہنے کا بھی انتظام تھا۔ ہم بینچوں پر

بیٹھ گئیں۔ کونسی جلدی تھی؟ اطراف میں بنی پٹڑیوں پر گہرے سرخ اور اُودے رنگ کی گاڑیوں کا دھواں دھار طریقے سے آنا جانا رواں دواں تھا۔

دنیا کی کوئی میٹرو اتنی خوبصوت نہیں ہوسکتی جتنی ماسکو کی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکمرانوں نے جیسے اپنے لوگوں کو محبت سے لبالب بھرا ہوا یہ خوبصورت تحفہ دیا ہو۔

پھر مزے سے اٹھے دُنیا گول ہے شاید میٹرو سٹیشن کی مرکزی جگہ بھی اسی کلیئے قاعدے پر بنائی گئی ہے۔ گولائی لئے ہوئے اس کی آمنے سامنے کی دیواروں کی جو پینٹنگ تھی وہ لاجواب ہونے کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے کام اور جذبات کی بھی عکاس تھیں۔ یہاں سے مختلف راستے ماسکو کی مختلف جگہوں کے لئے نکلتے ہیں۔ یہاں سے پھر ایک طویل راہداری تھی جس پر چلتے ہوئے ہم بالآخر باہر آ گئے۔

جس جانب ہم نے رُخ کیا وہاں چھوٹے چھوٹے خوبصورت کھوکھوں اور دکانوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ کھانے پینے، ویڈیو شاپس، ریڈی میڈ کپڑوں اور موبائیلوں کی دوکانوں پر لوگوں کا جم غفیر خریداری میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہاں سے ہم نے برگرز لئے۔ سٹیشن کی عمارت کے اندر جانے کی بجائے کم سومولسکایا سکوائر میں آ گئیں۔ لمبے چوڑے سنگی بینچوں کے ساتھ ساتھ کھلے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ آہنی جنگلوں میں مقید سرسبز گھاس کے قطعے، ٹیکسیاں، گاڑیاں، رنگ برنگے پیرہنوں میں لوگوں کے پرے، ماحول کو کتنی خوبصورتی دیتے تھے۔

گرینائٹ کے چبوترے پر رُوس کا نقشہ سٹیٹ ایگل کے ساتھ دائیں بائیں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے نقشوں سے بہت دلچسپی ہے۔ بہت اچھی اٹلسوں کا ذخیرہ ہے میرے پاس۔ ملکوں کی ظاہری شکل وصورتوں کا موازنہ کرنا بڑا دلچسپ شغل ہے۔

رُوس اپنی ظاہری صورت میں اپنے دائیں طرف کے بالائی اور زیریں خموں کے ساتھ کسی آرام کرتے ہوئے گھوڑے کی مانند نظر آیا تھا۔

سوویت کے زمانوں والا پھیلاؤ اب سکڑ گیا ہے۔ ساری ریپبلکیں آزاد وخودمختار ہوگئی

ہیں۔ پر وہ کہتے ہیں۔ چنے کی دال سڑ بھی جائے تو گوشت سے خراب نہیں ہوتی والی بات ہے۔ ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا ہے۔ بحرالکاہل اور بحیرہ جاپان کے ہمسائے ولادی وستوک میں جب رات ہوتی ہے، ماسکو میں اُس وقت صبح طلوع ہوتی ہے۔ آبنائے بیرنگ انتہائے مشرق کا سرا اور ولادی وستوک جنوب مشرقی سرا۔ شمال تو بحر منجمند شمالی سے گھرا ہوا ہے۔ ان برفیلے سمندروں میں جتنے جزیرے ہیں اُن میں زندگی کی سختیوں کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

چودہ ریپبلکیں استھونیا، لتویا، مولداویا بیلا رس (Byelorussia) یوکرائن، جارجیا، ازبکستان، تاجکستان، آذربائیجان، ترکمانستان، کرغستان اور پندرھویں روس خود جو کچھ جنوب اور کچھ مغرب میں ہیں آزاد ہوگئی ہیں۔ انہیں نکالنے کے باوجود رقبہ دُنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ 17 ملین مربع کلومیٹر جس کا صرف ابھی تیرہ (13) فی صد آباد اور بقیہ ویسے ہی غیر آباد۔ مشرق و مغرب، شمال اور جنوب کے درمیان حائل ہزاروں میلوں کے ان فاصلوں میں موسموں، فصلوں، نسلوں اور تمدنوں کی انفرادیت اور رنگا رنگی ہے۔

اور جب ہم سُرخ سفید اور کاسنی پھولوں کی کیاریوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے برگرز کی چھوٹی چھوٹی بائٹ لیتے بڑے مسرور سے انداز میں بیٹھی دھوپ سے لطف اٹھاتی تھیں ہم نے مان سنگھ کو دیکھا تھا۔ بھارتی پنجاب کے ضلع ہریانہ کا مان سنگھ جو ہمیں حیرت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا تھا پر تھوڑا آگے جا کر واپس پلٹا تھا۔

آنکھوں میں حیرت تھی پر ساتھ باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ پنجابی زبان میں بے تکلفی سے بولا تھا۔

''تُسی کتھوں او جی۔''

اور شہر لاہور کا سن کر تو نہ صرف باچھوں کا پھیلاؤ بڑھا بلکہ آنکھوں میں خوشی بھی ناچ اٹھی تھی۔ لاہور کا مضافاتی شہر کاموکی اُس کے والدین کی جنم بھومی تھی۔ اجنبی سرزمین پر ماں بولی نے ہمیں بھی سرشاری دی تھی۔

مان سنگھ کوئی پینتالیس اڑتالیس کے ہیر پھیر میں ہوگا۔ پچیس سال سے ماسکو میں تھا ہیوی مکینیکل انجینئرنگ میں تعلیم ماسکو یونیورسٹی سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ سائبیریا کے برف زاروں میں کام کرنے کے بعد اُس نے مشین ٹولز کی تجارت شروع کردی۔ اس وقت اُس کا ہوزری کا کاروبار عروج پر تھا۔ شادی اُس نے رُوسی لڑکی سے کی۔ دو بچوں کا باپ تھا اور رُوسی معاشرے میں پوری طرح رچا بسا تھا۔

میرے ذہن میں بند پھڑ پھڑاتے سوالات اُن کبوتروں کی طرح ہی تھے جو کا بک کی بند کنڈی کھلتے ہی اُڈاریاں مارنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اپنا ہم زبان کیا ملا۔ ایک کے بعد ایک کی یلغار ہونے لگی۔

سوویت کیوں ٹوٹا؟ آپ نے پوچھا ہے؟

''ارے بھئی اسے تو ٹوٹنا ہی تھا۔ ہماری پنجابی زبان میں کہاوت ہے۔ رنڈی یعنی بیوہ تو اپنی بیوگی کاٹ ہی لے پر گاؤں کے اُچکے اُسے کاٹنے نہیں دیتے۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ انقلاب کے ساتھ ہی رُوسی معیشت کی تباہی و بربادی کے لیے دنیا کے چاچے مامے امریکہ اور برطانیہ نے اینٹی کمیونسٹ عناصر، وائٹ گارڈز (زاروں کی حامی فوج)، جاگیرداروں اور نوابوں کو ہتھیاروں اور پیسوں کی فراہمی کی صورت در پردہ سازشوں کا آغاز کر دیا تھا۔

سٹالن کے ہاتھوں بہترین جرنیلوں کی موت اور جنگ سے متعلق اُس کے ابتدائی غلط اندازوں کے باوجود جنگ عظیم دوم میں سوویت کی سرخ فوج کے کارناموں پر مغرب بمعہ ہٹلر سکتے میں آ گیا۔ چرچل اور روز ویلٹ تو انتظار میں گھڑیاں گنتے تھے کہ دیکھو کب کون کس کی گردن مروڑتا ہے اور پھر وہ آگے بڑھ کر مروڑنے والے کا منگو ٹھونپیں۔

پر وائے حسرت سُرخوں نے مہلت ہی نہ دی اور جھنڈے لہرا دیئے۔

اب سچی بات ہے دھاک تو بیٹھ گئی تھی۔ پوری دنیا میں واہ واہ اور بلّے بلّے بھی ہو گئی تھی۔ سکون سے بیٹھ جاتے، پر نہیں جی۔ فوج کو عظیم تر بنانے کے لیے قومی دولت کا گیارہ بارہ فی صد

اُس پر خرچ ہونا شروع ہوگیا۔ فیکٹریوں نے صرف عام اسلحہ ہی نہیں نیوکلیئر ہتھیاروں کے ڈھیر لگا کر امریکہ اور نیٹو (NATO) کو پیغام دیا کہ ہم کوئی تم سے کم ہیں۔ اُوپر سے ماشاء اللہ خلائی تسخیر میں بھی سبقت کا جنون۔ بلا سے اسلحہ کوالٹی کے اعتبار سے امریکہ کے پلّے کا نہ ہوا اور فورسز کا تعلیمی اور تربیتی معیار بھی کم تر ہو۔

بیچارے عام رُوسیوں کا تو وہ حال کہ کہا جائے آسمان سے گرے اور کھجور میں جا اٹکے۔ زاروں کم بختوں کے چنگل سے نکلے تو ان کمیونسٹ باگڑ بلّوں کے ہتھے چڑھ گئے۔

مارکسزم کا پرچار اور کمیونسٹ بلاکوں کو زیر اثر کرنے کے لیے انہیں اسلحے کی فراہمی کبھی مفت اور کبھی بہت کم قیمت پر ہونے لگی۔ مشرقی یورپ کو تیل 20% کم ریٹ پر۔ کیوبا کو سوویت ٹوٹنے تک ایک ملین ڈالر روزانہ کی چھوٹ تھی۔ اب بوجھ قومی معیشت پر تو پڑنا تھا۔ وہ پڑا۔ یہ صرف ایک دو مثالیں دی ہیں میں نے۔

پرائیویٹ سیکٹر کا ریاستی سیکٹر کے ساتھ بھلا کیا مقابلہ۔ انسانی فطرت کے تقاضوں کے آگے ڈنڈے کے زور پر بہت دیر تک بند نہیں باندھا جا سکتا۔ ذاتی دلچسپی نہیں تو کون جان مارتا ہے؟ میں چار کی بجائے کارخانے سے دو بجے ہی کیوں نہ بھاگ جاؤں۔ تنخواہ تو مجھے ملنی ہی ملنی ہے۔ یہی ہوتا تھا اشیاء کی کوالٹی کا معیار ناقص، زرعی فاموں پر پیدا ہونے والی اشیاء اپنے اہداف سے کم، اُوپر سے غریب کسانوں پر ظلم و ستم کی انتہا۔ اجتماعی پیداوار پر زور۔ ایسے میں کولاک (امیر ترین) کسانوں کا رویہ پنجابی زبان کی اُس کہاوت کا غماز کہ تینوں نہیں دینی کھنگے نال پھڑ والینی ال۔ اُنہوں نے فصلیں اُجاڑ دیں۔ کھلیانوں اور گوداموں کو آگ لگا دیں۔ جانور ذبح کر دیئے۔

لوگوں کے پاس گھروں کی قلت تھی۔ معیار زندگی مشرقی یورپ سے بھی پست۔ خوراک کی کمی، بلیک مارکیٹوں کا رُجحان، اُوپر سے دنیا کے سکڑنے کا عمل، نئی نسل کے امریکہ کے ساتھ تقابلی جائزے، ٹیکسوں اور صنعتوں کی سبسڈی کے حوالے سے بھی رُوس کی صنعتوں کا دنیا کی تجارتی قیمتوں سے کوئی ربط و تعلق نہیں تھا۔ بیوروکریسی فوج کے اعلیٰ افسروں اور بڑے کمیونسٹ

لیڈروں کے الّلے تللّے۔ سچ تو ہے ایسے میں امریکہ بہادر کی اپنے کرتے دھرتے چمچے گورباچوف کے ہاتھوں گلاس ناسٹ (Glasnost)، پرایسٹرائیکا (Perestroika) اور ڈیموکریٹائزیشن جیسی اصلاحات کے ساتھ سوویت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی سازشیں۔ کیا گورباچوف واقعی ریفارمر تھا؟ میں ناقد نہیں۔ ان سبھوں پر طرّہ رُوسی فوجوں کی افغانستان میں شرمناک شکست اور واپسی۔ سوویت ریپبلکوں کا ان مواقع سے فائدہ اُٹھا کر علیحدگی کے اعلانات۔

اور مان سنگھ کھلکھلا کر ہنسا۔ ''بیچارہ ٹوٹنا نہ تو اور کیا کرتا۔''

''سیاسی پارٹیوں کی کیا صورت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کمیونسٹ پارٹی آف رشین فیڈریشن ہے۔ سٹالنسٹ عناصر ہیں۔ کسان تنظیمیں بھی موجود ہیں۔

مان سنگھ باتیں کرتے کرتے دفعتاً رُک کر بڑی محبت بھری آواز میں بولا۔

''لو میں بھی کیسا بُھلکڑ ہوں، آپ لوگوں کو چائے پانی کا تو پُوچھا ہی نہیں۔ چلیں اُٹھیں۔ آپ کو دیسی کھانا کھلاؤں۔''

''ارے مان سنگھ جیتے رہو۔ میرے لہجے میں خود بخود ممتا کا رس گھل سا گیا تھا۔ ابھی برگر کھائے ہیں ذرا گنجائش نہیں۔ تم بات کرو۔ ان باتوں کی زیادہ ضرورت ہے۔''

دراصل طبقات میں بہت کشمکش ہے۔ ملک کی ایک کلاس وہ ہے جن کے آباءواجداد کا تعلق ماضی کی شاہی ایلیٹ کلاس سے ہے۔ اُن کے خوبصورت بڑے بڑے گھر، ان کی اولادیں مہنگے ترین پرائیویٹ اداروں میں زیرِ تعلیم، اُن کے لئے بہترین ہسپتال، قیمتی گاڑیاں اور عیاشانہ طرزِ زندگی سبھی کچھ ہے۔ عام رُوسی اور اَپر کلاس رُوسی میں بُہت فرق ہے۔ رُوس سوشلسٹ نہیں کیپٹلسٹ ملک بن رہا ہے بلکہ بن گیا ہے۔

رُوس کے نوجوان طبقے کو ان دنوں میں مَیں نے جس انداز میں دیکھا تھا اُس کے بارے میں بھی پوچھنا ضروری ہو گیا تھا۔

اکتوبر انقلاب غریب طبقے کی اُمید تھی۔ یہ انقلاب جس سرعت سے کامیاب ہوا اس کی نظیر نہیں۔ عام لوگوں کے جوش و خروش نے اپنی ساری توانائیاں اس میں جھونک دیں تھیں۔ سٹالن کے دور میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ پر نوکر شاہی، بیوروکریسی، مراعات یافتہ ٹولے، سامراجی طاقتوں کی سازشیں، سوویٹ کا شیرازہ بکھیرنے اور تیسری نسل میں کاہلی، آرام طلبی، جوا، شراب نوشی، چوریاں اور غنڈہ گردی سب کی سب پیدا کرنے کی ذمہ دار بنیں۔ شراب تو روسی ویسے بھی یوں پیتے ہیں جیسے پانی۔

مان سنگھ بہت دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ چائے پانی کے لئے پھر مُصر ہوا۔ ہماری معذرت پر اُس نے اپنا کارڈ ہمیں دیا۔ پیٹرز برگ سے واپسی پر اپنے گھر آنے کی تاکید کی۔

''میرے گھر ٹکر بھی کھانا ہے تے گلاں وی کرنا ئیاں ان۔''

پر جاتے جاتے اُس نے ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی تو سرکا دی یہ کہتے ہوئے کہ ''رجسٹریشن لیٹر کا پاس ہونا بہت ضروری ہے۔ یہاں کی پولیس پوری چنڈال ہے۔ انّی کانی۔ نہ کچھ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔ اٹھا کر بندی خانے ڈال دیتی ہے۔''

''ربا نواں سیاپا۔'' (خدایا نئی مصیبت)

اُسی وقت افراتفری میں اٹھیں۔ میٹرو پر چڑھیں اور ہوٹل کے آفس آئیں۔ اب کمرے میں جس لڑکی سے سامنا ہوا۔ اُس کا حسن تو گنگ کرنے والا تھا۔ بٹر بٹر اُس کا چہرہ دیکھتے ہوئے میں سوچے چلی جارہی تھی۔ اس کی کونسی چیز نندن (رد) والی ہے۔ واللہ ایک بھی نہیں تھی۔ اُسے مسئلہ بتایا۔ فائل اٹھا کر اُس نے لیٹر نکالا اور ہمارے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

''میں ابھی اسے پولیس اسٹیشن سے سائن کروا کے لائی ہوں۔''

چلو شکر کا کلمہ پڑھا اور واپسی کی۔

اُس وقت چار بج رہے تھے جب ہم ریلوے اسٹیشن کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئیں بڑے ہال میں شیشے کے کیبنوں میں کام کرتی عورتوں کی دودھیا روشنی میں چمک

دمک بڑی متاثر کن تھی۔ تین ویٹنگ رُوم تھے۔ گراؤنڈ فلور پر درمیانہ حصہ کرسیوں سے بھرا ہوا جن پر لوگ سکون سے بیٹھے تھے۔ اطراف دُکانوں سے سجی ہوئیں اور چھت بھی اپنے ڈیزائن میں بڑی منفرد سی تھی۔ اہرام مصر جیسا سٹائل۔

وسیع وعریض بالکونی میں نشستیں زیادہ آرام دہ اور صوفہ ٹائپ تھیں۔ انتظار کی صورت میں سونے کی موج تھی۔ اور بالکونی سے قدرے اُوپر کوئی بیس فٹ اونچی شیشے اور سٹیل کی دیواروں والا وسیع وعریض ایک اور ویٹنگ لاؤنج بھی ایسی ہی صورت کا نقشہ پیش کرتا تھا۔

ایک ایسا شعوری نظم وضبط یہاں موجود تھا جس کی ہم جیسے تیسری دنیا کے غریب غربے صرف تمنا ہی کر سکتے تھے۔ سکون سے بیٹھے، تہذیب سے کھاتے پیتے اور کتابیں پڑھتے لوگوں کو کوئی افراتفری نہیں تھی۔ کسی امر کی قطعی کوئی گھبراہٹ، کسی ہڑبونگ پن کا کوئی مظاہرہ یکسر نہیں تھا۔ لڑکے بالے اور لڑکیاں موبائلوں پر باتیں کرتی تھیں۔ اور آناؤنسمنٹ کا سلسلہ جاری تھا۔

کچھ لوگ خاموشی سے اُٹھتے۔ کرسیوں کے پاس دھرا اپنا سامان اٹھاتے اور چلے جاتے۔ کچھ اور لوگ اُن کی جگہ لینے آجاتے۔

چست پتلونیں، جینز کوٹ، چھوٹے بلاؤز پہنے رنگے ہوئے بالوں والی نوجوان اور بوڑھی عورتیں تھل تھل کرتے ان کے وجود، کس قدر سمارٹ، کام کرنے میں جیسے شیر کی بچیاں ہوں۔ دُکانوں میں سلیز گیری کرتیں، مشینوں سے صفائی، گاڑیوں کے سامنے کھڑی چیکنگ کے مراحل سے لوگوں کو گذارنے میں مصروف۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے رُوسی عورت نے گھر اور ملک دونوں کو بانہوں میں سنبھالا ہوا ہے۔

سارا اسٹیشن کوئی دو مرتبہ اُوپر نیچے سے پھرول ڈالا تھا۔ کہیں کہیں کوئی ایسا دلکش اور من موہنا چہرہ نظر آتا کہ بے اختیار رُک کر اُس پر تفصیلی نظر بازی ہوتی۔ رُوسی عورتوں کی اکثریت فربہی ہے۔ پچھلے اور اگلے حصوں کی زیر وزبر کے ساز بجاتی موسیقی ہم جیسے گنوار نواردوں کو تو بٹر بٹر دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ پارے کی طرح پھرتیلی۔ چلنے کا انداز کچھ ایسا ہی ہے جیسے عاجز

مسکین اور نمانی سی زمین کو ٹھک ٹھک بجاتی ایڑیوں کی نوک سے چھلنی کرنے پر تلی بیٹھی ہیں۔

چھ بجے ہم اوپر والے لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔

اور جب میں پورے ہال پر اپنی نظریں دوڑاتی تھی۔ مجھے بہت دُور کونے میں گھرے سانولے رنگ کے دو نوجوان نظر آئے تھے۔ چہروں مہروں سے اپنی طرف کے جان پڑتے تھے۔ سوچا۔ چلو معلوم تو کروں۔ مہرانساء بھی میرے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی۔ پر میرے ساتھ چلنے کیلئے نہیں۔ بالکونی والے ویٹنگ لاؤنج میں پڑے صوفوں پر اک ذرا ستانے کیلئے۔

''چلو ٹھیک ہے۔ پر دیکھو مہرو ادھر اُدھر نہیں ہونا۔''

قریب جا کر اپنا تعارف کروایا۔ اور اُن کے بارے میں جانا۔ دونوں افغانی دونوں پشاور اور نوشہرہ میں سیٹل پر دونوں اُردو بولنے سے گریزاں۔ ایک قدرے کم اور دوسرا زیادہ۔ ایک تو پورا زہری جان پڑتا تھا۔ زہریلی سنڈی جیسا، دو اُنگلی کے چوڑے متھے پر ستر بل پڑتے تھے۔ آنکھ اُٹھا کر ایک بار دیکھنے کا چور ہوا تھا۔ دوسری بار زحمت نہیں کی تھی۔

ایک تو بچپن سے سنتے کان پک گئے تھے کہ پردیس میں دیس کا کتا بھی پیارا لگتا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ کتا اپنے دیس کا ہے۔ گلیوں میں رُلنے پھرنے والا گندہ مندہ سا) اور جب کتابوں سے آشنائی ہوئی تو جانا کہ وطنی کو دیکھ کر دل کا چھوٹا سا نالہ محبت سے لبالب بھرا دریا بن جاتا ہے۔ اب یہاں جو تجربہ مل رہا تھا اُسے کیا نام دیتی؟

پر میں کون سا کم تھی۔ پوری پکی چنڈال۔ چھوٹتے ہی کہا۔

''تم پاکستان میں رہتے ہو۔ اس کی پناہ میں ہو۔ کاروبار کرتے ہو۔ رزق روٹی تمہیں میسر ہے۔ تو اتنی نفرت کیوں کلیجوں میں ٹھونسے بیٹھے ہو۔ ارے چلچلاتی دھوپ میں چلنے والا ایک مسافر بھی راستے کے اُس درخت جس کی فرحت بخش چھاؤں میں وہ کچھ دیر ستانے بیٹھتا ہے کیلئے دعائے خیر مانگ لیتا ہے۔ تم لوگوں نے تو لٹیا ہی ڈبو دی ہے۔ بالکل ہی گئے گذرے ہو۔''

کھانے کا پٹارہ کھولے بیٹھے تھے۔ دودھ کی بوتلیں پاس دھری تھیں۔ کم بختوں نے

پھوٹے منہ صلح تو کیا کرنی تھی بیٹھنے تک تو نہیں کہا۔

مجھے بھی آگ سی لگی تھی۔

''دیکھو تو جس تھالی میں کھاتے ہیں اُسی میں چھید کرتے ہیں۔ حرامزادے۔ ہمارا تو وہ حال ہے کھروں کھر گوایا باروں پڑوا کھوآیا اں (یعنی اپنا گھر بھی گنوایا اور باہر سے طعنے بھی سنے)۔ پناہ دی۔ ان کی لڑائی لڑی۔ اُوپر سے اپنے ملک کے لوگوں کو دس علتوں میں جھونک کر لڑائی کو بھی اپنے ویہڑے میں ڈال لیا۔ پورا ملک آگ اور خون میں نہا رہا ہے اور ان کا طنطنہ دیکھو۔''

ڈٹ کر سنائیں۔ واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھی پر کھولن ابھی بھی کم نہ ہوئی تھی۔ انسانوں کے بھی کتنے رنگ رُوپ ہیں۔ کہیں خوبصورت اور کہیں کریہہ۔ دیوار پر آویزاں کلاک کو دیکھا۔ گھڑی ساڑھے چھ بجا رہی تھی۔ وقت کتنی سست روی سے اپنے سفر پر گامزن ہے۔

پھر ایک اور منظر سامنے اُبھرا۔

ایک نوجوان مرد ایک خاتون (پورے دنوں پر) ساتھ ایک چھوٹی بچی۔

مرد نے بولنا شروع کیا۔ اب بول کیا رہا تھا یہ تو سمجھنا مشکل تھا۔ پر قرائن جو بتاتے تھے وہ امداد کی طلب تھی۔ کچھ لوگوں نے کشکول میں کچھ ڈالا، کچھ نے بے اعتنائی برتی۔ پر ایک بات ضرور تھی کہ مانگنے میں بھی ایک نفاست اور طریقہ سلیقہ تھا۔ اپنی جگہ پر ڈٹے کھڑے رہے۔ جنہوں نے دینا تھا، خود اٹھ کر اُن تک گئے۔ پندرہ بیس منٹ میں قصہ تمام ہوا اور تینوں دروازے سے نکل گئے۔

اور جب گھڑی کی سوئیاں آٹھ کے ہندسے پر پہنچیں۔ میں کھڑی ہوگئی۔

دس سیڑھیاں اُتر کر بالکونی میں آئی۔ یہاں مہرانساء کہیں نہیں تھی۔ ایک بار، دوبار اور پھر کئی بار تینوں سمتوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ اب وہ کوئی سینک سلائی تو تھی نہیں جو نظر نہ آتی۔ وہیں سے نیچے ہال میں دیکھا۔ میری نظریں بار بار ناکام ہو کر واپس لوٹتیں۔ اب دل دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔

دیر بعد نیچے آئی۔ واش روم گئی۔ پندرہ روبل خرچ کیے۔ بند دروازوں کے سامنے صدائیں بھی لگائیں پر سب کچھ بیکار تھا۔

گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اور ویسے ہی میری بھاگ دوڑ اور دیوانگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک چکر، دو چکر، تیسرا چکر۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پیر کسی Roller Skating پر چڑھ گئے ہیں۔ جو مجھے بھگائے لئے جاتے تھے۔ لمبی لمبی سانسیں کھینچتے ہوئے خشک ہونٹوں، وحشت زدہ آنکھوں اور اضطرابی حرکات سے شاید میں سبھوں کی نظروں میں تھی۔ اب یہ بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ کسی سے پوچھوں تو کیا پوچھوں؟

پھر ایک منظر سامنے اُبھرا۔ ڈھیر ساری انڈین عورتیں رنگ برنگی ساڑھیوں میں ایک بڑے سے ٹرالے پر سامان کی اُتروائی میں ہپوبان (ہلکان) ہو رہی تھیں۔ ایک پل کے لئے بھی میرا جی نہیں چاہا کہ میں ان کے پاس جاؤں۔ مجھے اپنی یہ مظلوم سی ہونق صورت اُنہیں دکھا کر اُن سے زبانی کلامی کسی ہمدردی کی طالب ہونا خود اپنی توہین محسوس ہوئی تھی۔

پھر دل کو تسلی دی کہ ہوسکتا ہے پلیٹ فارم پر چلی گئی ہو۔ کہ آخر کار پہنچنا تو وہیں تھا۔ کون سی ان پڑھ عورت ہے؟ بہروپ بدل کر سرینگر تک ہو آئی تھی۔ ٹرین اور کمپارٹمنٹ کے نمبر دونوں اُسے یاد تھے۔ مزے کی بات ٹکٹ میرے پاس تھے اور روبل اُس کے پاس۔ میں پلیٹ فارم نمبر نو پر پہنچی۔ پیٹرز برگ کیلئے گاڑی لائن پر آ گئی تھی۔ بہت لمبی ٹرین۔ خاصا چلنا پڑا۔ ہر کمپارٹمنٹ کے سامنے لیڈی چیکر کھڑی تھی۔

یہ بڑے جانکسل سے لمحات تھے۔ میرے اندر اضطراب اور پریشانی کا ایک طوفان گذرتی ساعتوں کے ساتھ ساتھ بڑھ رہا تھا۔

لیڈی ٹکٹ چیکر صورت حال کے بارے میں جان چکی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اب نو منٹ رہ گئے تھے۔ اُس نے میری طرف دیکھا تھا۔ اُس کی خاموش نظر نے بے بسی کی نمی

سے میری آنکھوں کو بگھو دیا تھا۔

اب پانچ منٹ رہ گئے۔ میری نم آلود نگاہیں بہت دُور تک گئی تھیں کہ شاید وہ کہیں بھاگتی ہوئی آ رہی ہو۔ پر مایوسی اور نا اُمیدی اُس کشادہ راستے پر بکھری ہوئی تھی۔

پھر جیسے غم و غصے کا ایک لاوا اُبلا۔ میرے اندر کے سُلگتے جذبات نے میرے بیٹوں اور شوہر پر چڑھائی کر دی۔

''حرامزادے کمینے کُتے۔ پہلے بیٹے زد میں آئے۔ بیویوں کو چالیس چالیس ہزار کے موبائل سال گرہوں پر گفٹ کرتے ہیں۔ قیمتی ہینڈ بیگوں اور مہنگے پرفیوموں سے اُن کی ڈریسنگ ٹیبلز سجانے میں اُن سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ پر ماں کے لئے اُس کے موبائل میں ایک انٹرنیشنل سم ڈلوانا مشکل ہے، بہت ہی مشکل۔

اور اس بندے کو تو دیکھو جو جیون ساتھی ہے۔ بظاہر یوں واری صدقے کہ ملنے جلنے والے رشک کریں کہ صورت کی پُجاری پر مقدر کی مہارانی۔ فکر کے کتنے اظہار، کھلا خرچ کرنا، پیسہ زیادہ لے جانا، جاتے ہی سم ڈلوا لینا۔ ساتھ رہنے والوں کے دانت کب گنے جاتے ہیں؟ وہ تو سمجھے سمجھائے ہوتے ہیں۔ پینتیس (35) سال کا ساتھ ہے۔ کیا جانتا نہیں کہ اپنی ذات کے لئے کتنی شُودی ہوں کس قدر شوم ہوں۔ پلّے بندھی دمڑی کے لئے بھی دس بار سوچتی ہوں۔ کھولوں کہ رہنے دوں۔ اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اپنا موبائل ہاتھ میں پکڑا تا۔ کسی اجنبی ملک میں پہنچتے ہی دکانوں کی کھوج میں لگ جاتی۔ سب لفڑے بازیاں۔ سب ڈھونگ۔

اور اس امیر زادی چھمک چھلو کو تو دیکھو۔ جوڑوں اور میک اپ سے بھرا قد سے بھی اُونچا صندوق لے کر آئی اور موبائل چھوڑ آئی۔''

پھر طنز اور لعن طعن کے بارودی گولے اپنے اوپر برسائے۔

''کمینی عورت تجھے بھلا کوئی کمی تھی پیسے کی۔ سم ڈلوانا مسئلہ تھا۔ یونہی صرفے کرتی کرتی مر جائے گی۔ آل اولادوں نے ختم پر آلو گوشت اور زردے کی دیگیں لوگوں کو کھلا پلا کر بعد میں قبر

پر تھوکنا بھی نہیں۔ اب اگر میں اُسے بھی موبائل کا پابند کرتی اور خود بھی لاتی تو اس وقت یوں غم و اضطراب کے سمندر میں تو نہ بھٹکتی پھرتی۔''

''صرف ایک منٹ۔'' مجھے کہا گیا۔

ایک پل کیلئے میرا جی چاہا میں گاڑی میں سوار ہو جاؤں۔ جہنم میں جائے۔ اپنی آپ پھڈ ریوں کو خود بھگتے۔

میرے پاؤں اُٹھے۔ تین سیٹپ چلے۔ پھر رُک گئے۔

''میرے خدایا میں اُسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی ہوں۔ میں کوئی بے حس عورت ہوں۔''

گاڑی نے خفیف سی حرکت کی۔ اور اُس کے ساتھ ہی جیسے میرے اندر کی مایوسی، کرب اور دُکھ آنسوؤں کی صورت میرے گالوں پر بہنے لگا۔ ایک بار پھر میرا جی چاہا۔ بھاگوں اور ڈبے میں سوار ہو جاؤں۔

اور میں دو قدم بھاگی بھی۔ پھر رُک گئی۔

''نہیں میں نہیں جا سکتی۔ بہت لمبی یاس میں بھری اِک آہ میرے اندر سے نکلی اور میرے سارے شریر میں پھیل گئی۔

''پیٹرز برگ جانا شاید میرے نصیب میں نہیں۔ دوستووسکی کی سرزمین پر قدم دھرنا شاید میرا مقدر نہیں۔ تہذیب و تمدن کے اُس شہر کو دیکھنا شاید میری قسمت میں نہیں۔''

اور جیسے میرا مُومُو احتجاجی بن کر ''کہاں دفع ہو گئی۔ زمین کھا گئی اُسے یا آسمان نے نگل لیا۔'' جیسے جملوں کی صورت اندر کا غصہ اور کھولن باہر نکالنے لگا۔

وسوسوں واہموں کی قطاریں تھیں جو ایک کے بعد ایک اپنے بدترین خوف کے ساتھ سامنے آتی جاتی تھیں۔ اجنبی سرزمین پر اپنی بے بسی اور کم مائیگی کا شدت بھرا احساس تھا کہ آنسو اک تواتر سے بہنے لگے تھے۔

مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا کہ کب مجھے چند مشفق بانہوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ یہ

نوجوان تاجک تھے۔

سٹیشن کی ساری عمارت کو کنگھالا گیا۔ اعلان ہوئے۔ مجھے تو اُن مہربان صورتوں نے بیٹھا دیا تھا۔ پانی کی بوتل میرے ہاتھوں میں پکڑا دی کہ پئیں اور اپنے حواس بحال کریں۔

سب کچھ بیکار ہو رہا تھا۔ گھنٹہ اسی خجل خواری میں گذر گیا تھا۔ پھر وہ لڑکے میرے پاس بیٹھے کہ اب کیا کرنا ہے؟

میں نے باری باری ان کے کندھوں پر بوسے دیئے اور گلوگیر لہجے میں کہا کہ وہ جائیں۔ آخر میں انہیں کب تک روک سکتی تھی؟

کیا وہ کہیں باہر نکلی اور کسی گاڑی ٹیکسی کے نیچے آگئی اور ہسپتال پہنچ گئی۔

میں عجیب سی خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

اب کیا کروں؟ فاروق کو فون کروں۔ منصور سے بات کروں۔ کیا کروں؟ کس مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ پاکستان کے سفیر سے رابطہ کیا جائے۔ نہ ہوٹل نہ کوئی ٹھور ٹھکانہ۔ کیسی غریب الوطنی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہیں گرم بستر مل جائے۔ لیٹوں اور سو جاؤں۔

دفعتاً دبلا پتلا نوجوان پولیس مین بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔

''آپ کی ساتھی اُوپر سو رہی ہے۔''

''ہیں۔''

میری آنکھیں پھٹیں۔ اتنی شدید پریشانی کے بعد یہ خبر کچھ ایسی ہی تھی کہ جیسے کوئی کہہ دے۔ لڑکا تو بغل میں بیٹھا ہے اور گمشدگی کا ڈھنڈورہ سارے شہر میں پیٹ دیا ہے۔

میں بھاگی میرے ساتھ ریلوے کی لیڈی پولیس بھاگی۔ وہ نوجوان لڑکا بھی بھاگا۔ تیزی سے سیڑھیاں چڑھیں۔ سامنے لمبی کرسیوں پر مہرانساء سو رہی تھی۔

میرا جی چاہا اس گٹھڑی کو اٹھاؤں اور ریلنگ سے نیچے پھینک دوں اور پھر خود بھی چھلانگ

لگادوں۔

اب چونکہیں لڑنا تو ضروری تھا۔ وہ لڑیں پر میں میدان کارزار میں کشتوں کے پشتے نہ لگا سکی کہ وہاں ڈھٹائی کی انتہا تھی۔ "میں تو یہیں تھی، اسی جگہ۔ یہاں سے ہلی بھی نہیں۔"

اس مہربان عورت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے راستہ دکھایا تھا کہ پیٹرز برگ کیلئے اگلی گاڑی کا وقت دو بجے ہے۔ اس میں بیٹھیں لو۔

پہلی ٹکٹوں کی واپسی، ہرجانہ اور نئی کی خریداری میں سات سو روبل کی قربانی۔ چلو صبر شکر۔

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ خون میں اُبلتے ہوئے سیاحت کے شوریدہ سر جذبوں پر جیسے کسی نے ٹھنڈے یخ پانی کی بالٹیاں انڈیل دی ہیں۔ ذہنی اور جسمانی پریشانی نے جو جوار بھاٹا اٹھایا اُس نے تین گھنٹوں میں دھوبی کے گھاٹ پر پٹخنیاں کھاتے کپڑے کی طرح مروڑ کر رکھ دیا تھا۔

"اب یہاں بیٹھنا ہے۔ میں تم لوگوں کو خود گاڑی میں سوار کراؤں گی۔"

اور جب دو بجے گاڑی میں آمنے سامنے کی دونوں برتھوں پر گدّے اور چادریں بچھا کر اُس نے ہم سے رخصت چاہی۔ میں عین اُس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔

"اپنا نام نہیں بتاؤ گی؟"

رُوس کی سرزمین لاکھ سرد سہی، لاکھ بے مہر سہی۔ پر اس میں زرفشاں، انتونینا اور ایوانونا جیسے وجود بھی ہیں جو محبت کی گرمی سے دہکتے ہیں، اور اجنبیوں کو اس گرمی سے آسودگی پہنچاتے ہیں۔

کمبل کھول کر میں نے اُس کے ساتھ چادر لگائی۔ تکیے کو سیدھا کیا اور آنکھیں موند لیں۔

باب
10

پسنجر ٹرین کے مزے • پولات ابراھیم آزور اور ایلکسی سے ملنا

Приятный Поездка Пасажерскои Поезде.
Встреча Арзу с Алексеиом.

یہ طمانیت اور سکون سے لبریز ایک ایسی ہی نیند تھی جیسے ایک ماں دردِ زہ کی مشقت بھوگ کر تخلیق کی آسودگی پاتے ہی گہری نیند سو جاتی ہے۔ کمبل بڑا نگھا تھا۔ برتھ بڑی آرام دہ تھی۔ ایک آدھ بار آنکھ ضرور کھلی تھی پر گرمائش کے فرحت افزا احساس نے آنکھوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا

''بند کرلو انہیں فوراً۔ اگر ذرا ہوشیاری دکھائی تو ذہن جاگ جائے گا اور نیند کسی چالاک محبوبہ کی طرح ادائیں دکھانے میں جت جائے گی۔''

جب آنکھ کھلی اور کھڑکی کے شیشوں سے باہر دیکھا۔ ہریالیوں میں لپٹی ویرانی اور فضاؤں میں تیرتا پھرتا سناٹا نظر آیا تھا۔ برچ چیڑ اور صنوبر کے گھنے جنگل، ان جنگلوں میں کہیں کہیں موجیں مارتی ندیاں، سبزے سے لہلہاتی زمین، اوپر ابر آلود آسمان اور گاڑی کی جوں کی طرح چلتی رفتار، یہ سب بہت خوبصورت تھا۔ کہیں کہیں گہرے براؤن پینٹ والی کوئی عمارت

اپنی ڈھلانی تکونی چھتوں کے ساتھ سبزے کے اندھیرے جنگل میں کسی جگنو کی مانند لشکارا مارتی۔ کوئی چھوٹا سا اسٹیشن، چند گھروں تک جاتی کچی پکی سڑکیں، شاہ بلوط کی لکڑی کے کٹے ہوئے ڈھیر، کہیں گٹھوں کی صورت اور کہیں ٹرالیوں میں لدا ہوا۔

میں نے شال کندھوں پر لپیٹتے ہوئے فضا میں قلانچیں بھرتے پرندوں کو دیکھا۔ ایک انجانی سی خوشی کا احساس میرے رگ و پے میں دوڑا۔

ایک جگہ گاڑی رُک گئی تھی اور جو منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ کاش کہیں مصور ہوتی تو پینٹ کر لیتی۔

کوئی دس بارہ گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں، مکانوں کی خوبصورتی، اُن کی چوبی کھڑکیوں کی کٹاؤ دار لٹکتی جھالریں، اُن کے ڈیزائن دار دروازوں اور ایک گھر کے عقب میں نظر آنے والے سیبوں اور چیری کے باغ میں کُوکتی کسی پرندے کی آواز، میرا کلیجہ میرے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔

بے اختیار میں نے چاہا تھا کہ اُتر کر جنگل کے سبزے میں گم ہو جاؤں۔ یہ آواز مجھے اُٹھا کر میرے بچپن کے اُن سبزہ زاروں پر لے گئی تھی جب میں اپنی دادی کے کھیتوں پر تا حدِ نظر پھیلے ہرے کچور سبزے پر گنگناتی اس آواز کو سنتی۔ قلانچیں بھرتے پرندوں کو دیکھتی اور یہ کبھی نہ جان پائی کہ یہ بُلبل ہے، کوئل ہے یا کوئی اور پرندہ۔

جب موسم اَبر آلود ہو۔ کبھی کبھی بوندا باری ہو۔ گھنے جنگل، اُن میں سانس لیتا کوئی گھر، سردی، آتش دان اور خوشبو اڑاتے قہوے کا تصور ہو۔ تو ذرا سوچئے کون یاد آ سکتا ہے؟

اے حمید نے یاد آنا تھا اور وہ آیا۔

میں ہلکے سبز رنگ کی ایک ایسی سمفنی میں تیر رہی تھی جس کا کہیں کوئی اختتام نہیں تھا۔ من موجی سی گاڑی کبھی رُکتی کبھی چل پڑتی۔

تبھی بڑبڑاتی مہرالنساء آ کر اپنی برتھ پر بیٹھی۔

''اللہ ماری باوا آدم کے زمانے کی ٹونٹیاں سمجھ ہی نہ آئے کہ کھولوں کیسے۔ باقاعدہ دھینگا مُشتی کرنی پڑی۔ تب کہیں جا کر ڈسکوری ہوئی۔''

میں چپ چاپ بیٹھی کھڑکی سے باہر ہریالیوں میں گُم تھی۔

عین اسی وقت انیڈنٹ بوائے نے قہوے کا گلاس میرے ہاتھ میں پکڑایا۔

''کاش کچھ اور مانگا ہوتا'' بے اختیار ہی زبان سے نکلا۔

''کیسا ناشکرا انسان ہے جس کی طلب ہو وہ فوراً مل جائے تو شکر کی بجائے ہل من مزید کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔''

چھوٹی سی چسکی نے منہ میٹھے سے بھر دیا تھا۔ اُس وقت نہ میں نے سوچا کہ منہ نہیں دھویا اور دانت صاف نہیں کئے۔ یہ موسم، یہ ماحول، اس میں جو کچھ میرے ہاتھ میں ہے بس وہی غنیمت ہے اور سب ٹھیک ہے۔

سامنے والی سنگل سنگل برتھوں پر بیٹھے نوجوان لڑکے کھانے پینے میں جُتے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے مجھے چاکلیٹ والے بسکٹ پیش کئے۔

محبت سے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے اُن کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا۔ اُزبک ہیں۔ جس نے میری تواضع بسکٹوں سے کی تھی۔ وہ آزور تھا۔ میڈیکل کا سٹوڈنٹ۔ مناسب سی قامت پر اچھے نین نقش والا لڑکا۔ اُس کے ہاں رُوسی اور اُزبک کے ساتھ فارسی کا بھی تھوڑا سا گذر گذارہ تھا۔ انگریزی بہت اچھی بولتا تھا۔

دوسرا لڑکا پولات ابراہیم تھا۔ ماسکو یونیورسٹی میں روسی لٹریچر پڑھتا تھا۔ اونچا لمبا بہت خوبصورت نوجوان۔

اب پتہ نہیں میرے ساتھ کیا مسئلہ تھا کہ واڈکا کی بوتلیں اُن کے ہاتھوں میں دیکھتے ہی میری ممتا کیوں پھڑکنے لگی تھی۔

''ہائے ہائے نہار کلیجے۔ یہ لڑکے کیسے باؤلے ہوئے جاتے ہیں۔ اور دیکھو مسلمان بھی

ہیں۔

اللہ ایک تو یہ میری بے عملی سی مسلمانیت کہیں سے ملنے نہیں دیتی ہے مجھے۔ وہاں دیس میں کیا ہوتا ہے۔ بڑے گھروں کے بچوں کی ابھی مَسیں بھی نہیں بھیگتیں کہ بوتل سے شغل کرنے لگ پڑتے ہیں۔ بڑے نامی گرامی مسلمانوں کی آل اولادیں۔

میں نے سوویٹ ریاستوں کے علیحدہ ہونے پر ازبکستان کے بارے میں اُس کی رائے جاننا چاہی۔

لڑکا تو جیسے بھرا بیٹھا تھا پھٹ سے بولا۔

''ٹھیک نہیں ہوا۔''

ٹوٹی پھوٹی فارسی میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر انگریزی بولی کہ کہیں لڑکے کو مغالطہ تو نہیں ہوا۔

پر نہیں جی۔ لڑکے نے میرے سامنے انگریزی میں دلائل کے ڈھیر لگا دیے تھے۔

اُسے چنگیزی روایات کے پُروردہ خوانین کی آمرانہ حکومتوں کی ذلالتوں کے سارے قصے ازبر تھے۔

ازبک بہت پس ماندہ تھا۔ گھاس کے میدانوں والا جن میں غریب ازبک بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔ خیموں میں رہتے تھے اور انتہائی غربت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

کیمونسٹ حکومتوں نے زراعت کو فروغ دیا۔ کپاس کی پیداوار کو تکنیکی بنیادوں پر کاشت کر کے سوت کاتنے اور کپڑے بنانے کے کارخانے بنائے۔ صرف تاشقند میں ساڑھے تین سو کارخانے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں، ہسپتال، ریلوے کا جال۔

رُوسی انقلاب نے ازبکستان کو بہت عروج دیا۔

یہ سب سنتے ہوئے میں بولے بنا نہ رہ سکی۔

''پر دیکھو ناتشدد بھی تو بہت ہوا ہے۔ اُس تہذیب کا بیج مار دیا جس پر وسط ایشیا نازاں

تھا۔ رسم الخط کی تبدیلی اور رُوسی زبان کے تسلط نے فکر و آگہی اور علم و ادب کے کھلے راستوں کو بند کرنے کی سعی کی۔ پاکستان بننے کے بعد ہمارے ایک وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ان ریاستوں کا دورہ کرنا چاہا تو سٹالن نے اجازت نہیں دی تھی۔

آپ نے شاید ازبک تاریخ نہیں پڑھی۔ مسلمان خوانین کا کردار شرمناک تھا۔ آمر تھے، خود جاہل تھے اسی لئے قوم کو بھی جہالت کے اندھیروں میں رکھا ہوا تھا۔ کمیونسٹوں نے مسجدوں کو اگر تالے لگائے تو گرجے کونسا محفوظ رہے۔ مذہبی تخصیص پر کسی اقلیت کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہوا۔ اور حق علیحدگی بھی ریاستوں کے پاس محفوظ تھا۔

میں تھوڑی سی خوفزدہ تھی۔ بات دھیمے لہجے میں دبک کر کرتی تھی پر لڑکا بڑا دبنگ تھا۔ منہ پھاڑے بولے چلے جارہا تھا۔

پولات ابراہیم ڈبے میں سے نوڈلز نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ پھر دفعتاً اُس نے آزور کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بکواس کئے جارہا ہے۔ پچاس ملین سے زیادہ مسلمان جو سوویت کی آبادی کا تقریباً چھٹا حصہ ہیں۔ زاروں کے زمانوں سے سوویت تک صرف دبائے ہی نہیں گئے بلکہ اسلام کو ایک دقیانوسی مذہب سمجھتے ہوئے مسلمانوں کو سوویت معاشرے میں اُس طرح مدغم نہیں ہونے دیا گیا جو اُن کا حق تھا۔ ہزاروں مسلمانوں کو اجتماعی پیداواری زراعت میں ختم کر دیا گیا۔ اُن کی زمینیں چھین لی گئیں۔ انہیں گھروں سے نکال دیا گیا۔ قازقستان کی ایک تہائی آبادی اس ظلم کا نشانہ بنی۔ ترقی ضرور ہوئی مگر ریپبلکوں کی معیشتوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھا۔

پرانے سسٹم میں اگر رُوسی شاونزم کو اُبھارا گیا تھا تو آج کی بورژوا حکومت بھی چھوٹی قومیتوں کے مفادات کو اہمیت نہیں دیتی۔ ریپبلکیں گو آزاد ہیں پر رُوس کے ساتھ تجارت کے لیے مجبور ہیں۔ اپنی معاشی طاقت کے بل بوتے پر رُوس کا جب جی چاہے اُن کا ناطقہ بند کر دیتا ہے۔ اُنہیں ذلت آمیز دفاعی معاہدوں پر مجبور کرتا ہے۔ فوج کشی کرتا ہے۔ چیچنیا کے ساتھ کیا

ہوا؟ بہت تباہی اور جانی نقصان ہوا۔ پر چیچنیا نے بھی رُوس کو سبق پڑھا دیا۔

تبھی گاڑی کی خاتون اٹینڈنٹ ایک انگریزی بولنے والے لڑکے کو ساتھ لے کر آئی۔

لڑکے نے ہم سے پوچھا تھا کہ ہمیں ناشتے کیلئے کچھ چاہیے؟

مہرالنساء، کنگھی پٹی اور میک اپ سے فارغ ہو کر سکون سے اپنی جگہ پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، اور کہا جو اُسے پسند ہے جا کر آرڈر کرے۔

یہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے والا مترجم الیگزینڈر الیکسی تھا۔ جو ہمارے پاس بیٹھا۔ ہم سے بات چیت کی۔ ہوٹل کی بکنگ سلپ دیکھ کر انہیں موبائل سے مطلع کیا۔ ایڈریس سمجھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

''گھبرانا نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ٹیکسی میں آپ کو خود بیٹھاؤں گا۔''

آزور نے بھی پیشکش کی۔ آزور کا بڑا بھائی پیٹرز برگ میں رہتا تھا۔ اُس کا ذاتی کاروبار تھا اور وہ چھٹیاں گذارنے اُس کے پاس جا رہا تھا۔

خاتون اٹینڈنٹ نے مجھے ابھی تک کمبل میں بیٹھے دیکھ کر کہا تھا۔

''ایک گھنٹے بعد ہم پیٹرز برگ پہنچ رہے ہیں۔ واش روم آدھ گھنٹہ پہلے بند کر دیا جاتا ہے۔''

واش رُوم کی حالت بڑی ناگفتہ بہہ تھی۔ پتہ نہیں کس صدی کی ٹونٹیاں تھیں جنہیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ کتنی دیر دھینگا مشتی ہوتی رہی۔ پھر کہیں جا کر اُس کے اسرار کھلے۔ ٹھنڈے ٹھار پانی کے چھینٹوں سے میں نے اپنی آنکھوں اور منہ کو فراخ دلی سے نہلاتے ہوئے اُسے تر و تازہ کرنے کی اپنی پوری کوشش کی۔ پر نہیں جی۔ پسنجر ٹرین کے گیارہ گھنٹوں کے سفر کی مشقت کو کوئی جوانی تھی جو خندہ پیشانی سے جھیل جاتی۔ چہرے مہرے پر اُسی کیفیت کے عکس دوڑتے پھرتے تھے جن کے لئے کہا جاتا ہے۔

''اگوں بتو سوہنی تے پچھوں سُتی اُٹھی۔'' (پہلے ہی خیر سے بتو بی بی کوئی حسین تھی اُوپر

پیٹرز برگ

رُوس کی ایک جھلک

ونٹر پیلس
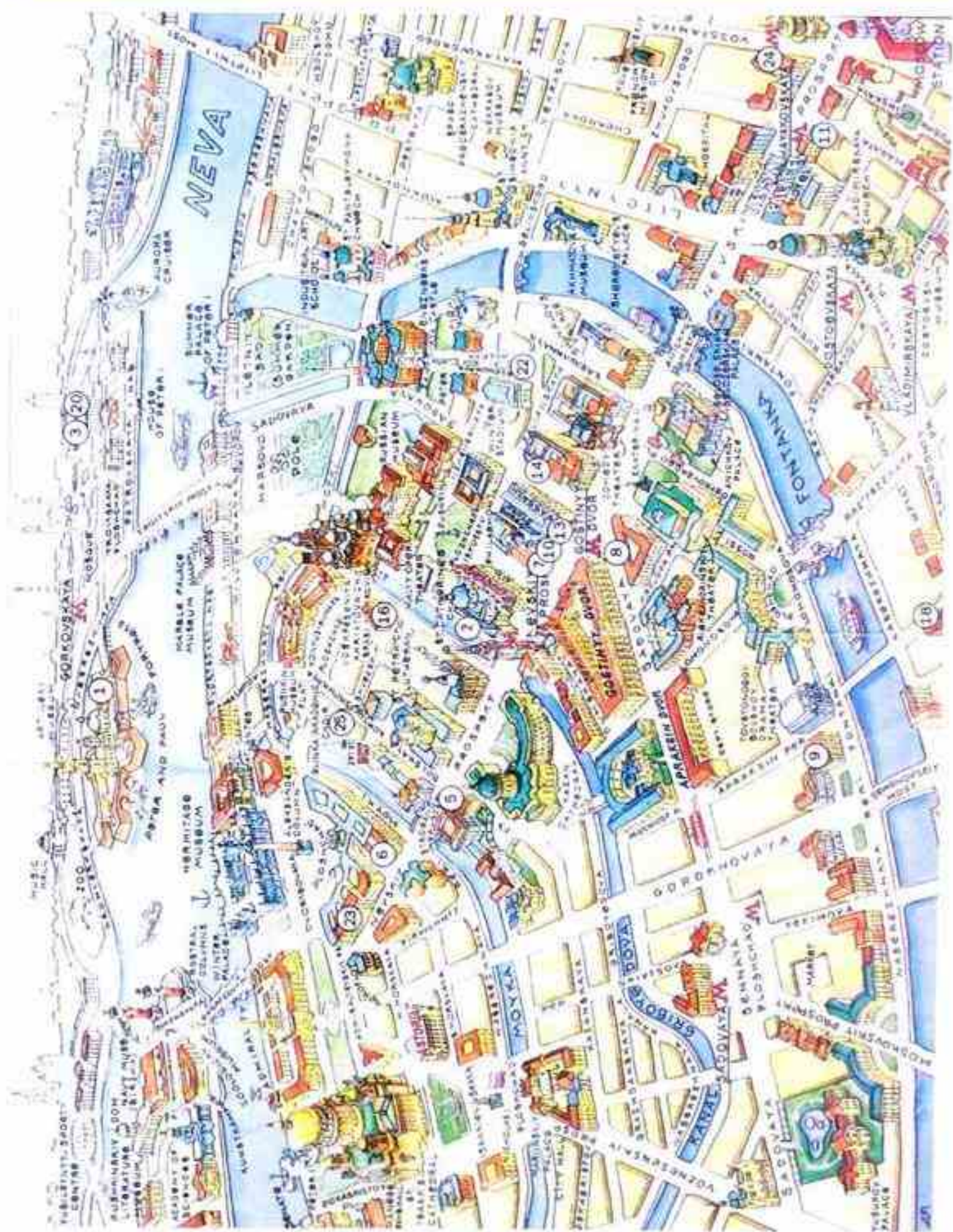
مینیژ سکوائر (ماسکو)

ماسکو تھیٹر سکوائر

گریبوڈ و وکینال پر مہر النساء اور مصنف

کریملن میں کیتھڈرل آف ڈورمیشن

سے سو کر اُٹھی ہے۔تو صورت کا خود ہی اندازہ لگا لیجیے)

شہر کے مضافات کا آغاز ہو رہا تھا۔وہ مخصوص سے منظر جو بڑے شہروں سے وابستہ ہوتے ہیں نظروں میں آنے لگے ہیں۔ایک دو جگہ بے ربط سے زنگ آلود ٹین کی چھتوں والے گھر دکھائی دیئے۔

رنگ روڈ، فلائی اوور برج، قبرستان، وسیع وعریض عمارات، چھوٹے چھوٹے مکان۔ ریلوے لائنوں پر کھڑے ٹرین کے ڈبے۔چلتی گاڑیاں، کارخانوں کی چمنیاں۔

ٹرین دھیرے دھیرے آہستہ ہو رہی ہے۔میں نے پل بھر کے لئے آنکھیں بند کر کے خود سے کہا۔

''تو میں پیٹرزبرگ پہنچ گئی ہوں۔مقام حیرت ہے نا۔''

باب
11

ایڈمرل ہوٹل کی کارستانیاں • کازان کیتھڈرل کی قصہ خوانیاں
رُوسی مارکسزم کے افسانوی کردار پلیخانوف سے اِک چھوٹی سی ملاقات

Хитрост,Гостинится Адморола.
Сказок Казанский Церков.
Руссеий Марксизм его Выдумнником
И Витреча Плихановам.

گاڑی سے اُتر کر شیڈ والے پلیٹ فارم پر چلتی ہوئی میں ویٹنگ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ وسیع وعریض لاؤنج کے عین وسط میں پیٹر اوّل کے سیاہ مجسمے اور چھت کے منفرد انداز کو دیکھتی ہوئی جونہی آگے بڑھی۔ میرے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدموں کو بریک لگ گئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی آرٹ گیلری میں داخل ہوگئی ہوں۔ چھت کی فسوں خیز پینٹنگ نے میری نظروں کو ذرا ڈھیلا کیا تو میں دیواروں کی جانب متوجہ ہوئی جو سنگ تراشی کے خوبصورت مجسموں سے بجی عُروسی چھپرکھٹ پر بیٹھی اُس چاند چہرے جیسی دلہن کی طرح لگی تھیں جس پر ارمانوں سے بھرے دل والا دولہا نظر ڈالتے ہی وجود کے اگلے سارے حُسن سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ نظر جہاں تک جاتی تھی واپس لوٹتے ہوئے یہ کہتی ہوئی آتی تھی۔ یہ تو سیپی میں موتی ہے۔ گوہر آبدار ہے۔

پر کرتی کیا۔ ضرورت تو رُکنے کی تھی۔ لیکن ٹیکسی کا بھاؤ تاؤ کروا کے اس میں بیٹھانے کا وعدہ کرنے والا رُوسی نوجوان ایلکسی اپنے مالٹا کے دوساتھیوں کے ساتھ بیرونی دروازے پر کھڑا منتظر نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس لئے نگاہیں چرا کر انہیں ایلکسی پر فوکس کرتے ہوئے قدموں کو تیز کر دیا تھا۔

ٹیکسی سُرمئی سڑک پر تیزی سے بھاگتی سکرین پر چلتی ہوئی کسی خوبصورت فلم کی طرح ایک سے ایک بڑھ کر منظر سامنے لا رہی تھی۔ ہر عمارت رنگ و رُوپ اور طرز میں منفرد تھی، خوبصورت تھی۔ سڑک کے بیچوں بیچ بہتی نہریں، اُن پر بنے پُل، اُن کی ریلنگ اور اُسے سجاتی آرٹ کی فنکاری بنانے والوں کے بلند تخیل کی آئینہ دار تھی۔

گاجری رنگ کی ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے ٹیکسی رُک گئی۔

سرعت سے ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ خوب پلے ہوئے تن و توش والے وجود پر دھرے غصیلے اور نخوت سے لبریز چہرے پر رعونت کے تاثرات بکھیر کر اُس نے فی الفور ہمیں اُترنے کو کہا۔ ہاتھ ہماری طرف بڑھایا۔ چار سو روبل دینے کیلئے اشارے دیتے ہاتھ اور چہرہ کچھ ایسا تھا کہ جیسے چیخ چیخ کر کہتے ہوں، جلدی کرو وگرنہ ابھی چھری تلے تمہاری گردن رکھ دوں گا۔

بلڈنگ کا باہر سے تو کچھ گذارہ تھا پر سیاہ جالیدار آہنی گیٹ سے اندر کا منظر بڑا خوفناک تھا۔ ہوٹلوں والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ ریسپشن روم تو گُجا یہاں تو کوئی آدم نہ آدم زاد۔ گھبراہٹ سی گھبراہٹ تھی۔ اوپر سے لال بھبھو کے چہرے اور غصیلی آنکھوں والا ڈرائیور جو ہمارے ہاتھوں میں پکڑے روبل جھپٹا مار کر چھین لینا چاہتا تھا۔

میں نے مہرانساء سے کہا۔ ''پیسے اسے ابھی نہیں دینے۔''

اُس نے چیخ کر عمارت کی پیشانی پر لٹکتے بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر انگریزی میں ''ایڈمرل'' لکھا تھا۔

میں نے بھی لاک گیٹ کی طرف انگشت شہادت کرتے ہوئے واضح سگنل دیا کہ یہ بند

ہے اور ہم اس کے اندر کیسے جائیں گے؟

شاید اُس کے بھیجے میں میری اشاروں کی زبان پڑ گئی تھی۔ اُس نے بورڈ پر کچھ دیکھ کر موبائل کے بٹن دبائے۔ اور جب وہ زور و شور سے کسی سے بات کرتا تھا میں اندر کی جانب دیکھتی تھی، جہاں نیم تاریک ٹھنڈی ڈیوڑھی سے آگے چھوٹا سا تکونی صحن اس میں کھڑی نوح کے زمانے کی ایک گاڑی اور ایک خستہ حال بلڈنگ نظر آتی تھی۔

اب دیوار میں لگی پلیٹ پر چند بٹن اُس نے سرعت سے دبائے۔ دروازے کو دھکا دیا۔ ایک جھٹکے سے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھل گیا۔ برق کی سی رفتار سے اُس کا ہاتھ پیسوں کیلئے بڑھا۔ ہم نے بھی فوراً دینے میں عافیت جانی کہ گلا کٹنے کا ڈر تھا۔

اندر داخلہ ہوا۔ آنگن میں ہوحق ہو جیسی کیفیت۔ دل دہلانے والا منظر تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے تین اور چار منزلہ خستہ حال عمارتیں کھڑی تھیں ان کے داخلی دروازے کون سے ہیں؟ کچھ سر پیر کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ اوپر جھانکتا تکونا نیلا آسمان اور نیچے کہنہ سال عمارتوں سے گھرا یہ پُر اسرار سا باڑہ۔

پھر اُنیسویں صدی کے برٹش لارڈز کی مخصوص پکار ''کوئی ہے، کوئی ہے'' کا انگریزی ترجمہ فضا میں گلا پھاڑ کر اُچھالا۔ لوہے کے ایک دروازے کو دھڑا دھڑ پیٹ پیٹ کر بے ہنگم شور مچایا۔ تالیاں بجا بجا کر ہتھیلیوں کو حنائی رنگ دیا تب کہیں تیسری منزل کی ایک کھڑکی سے ایک چاند چہرہ جھانکا۔

''بے غیرتے، فٹے منہ تیرا۔'' اپنی پنجابی میں لتاڑ دی۔ جی تو چاہتا تھا تبرّوں سے تواضع کروں۔

بغلی سمت ایک لوہے کے دروازے کی طرف اشارہ ہوا۔

''کچھ شرم کرو بے حیاؤ۔'' یہ جملہ مادری زبان میں اور ''کسی کو بھیجو کہ ہمیں گائیڈ کرے'' انگریزی میں ادا ہوا۔

پھر ایک طرحدار لڑکی کا نزول ہوا۔ بغلی سمت کا دروازہ کھلا۔

تنگ وتاریک سیلن زدہ چھوٹی سی جگہ۔ جہاں شاید زمانوں سے سورج کی کسی کرن کا گذر نہیں ہوا تھا۔ دیواروں کے نچلے حصے خستگی کے مارے ہوئے۔ بالائی یونہی سیمنٹ سے تھپے ہوئے۔ کوئی نفاست نہیں تھی اُن پر۔ سیڑھیاں ٹوٹی پھوٹی۔ اور سب بڑھ کر ایک ناگوار سی بو نتھنوں میں زبردستی گھستی ہوئی۔

تو ہمارے ایجنٹ نے ہمیں اپنا ہاتھ دکھا دیا ہے۔ اس ماحول میں ایسی سوچ کا در آنا تو قدرتی بات تھی۔

لفٹ کے بارے کچھ پوچھنا انتہائی احمقانہ تھا کہ پنڈ کا پتہ روڑیوں سے لگ رہا تھا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر رُکے۔ کالا گیٹ ایک آواز پر کھلا۔ آگے ایک چھوٹی سی راہداری جس کے ایک طرف پانچ کمروں کی لمبی قطار تھی۔ سامنے بند دیوار کے ساتھ ایک کیبن سا تھا جو یقیناً ریسیپشن رُوم تھا کہ وہاں کھڑی ایک عورت ہمیں دیکھتی تھی۔

کمرہ بس ٹھیک تھا بغیر الماری اور باتھ روم کے۔ نیلی پیلی چادروں اور رضائیوں سے سجا ہوا۔

''یہ کیا رنگوں کا مینا بازار لگایا ہوا ہے'' مجھ سے یہ چیخم دھاڑ برداشت نہیں ہو رہی تھی۔''

''اسی (80) ڈالر میں فائیو سٹار چاہتی ہیں۔ جتنا گڑ ڈالیں گی اُتنی ہی مٹھاس ہوگی۔''

کمرے میں موجود لڑکی انگریزی میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی ہی پٹاخہ قسم کی تھی۔

اب اُسے قصۂ دردِ دل سنانا تو ضروری تھا۔ لاکھ ہماری اوقات فائیو سٹار چھوڑ تھری سٹار والی بھی نہ تھی۔ پر وہ تو دیس میں تھی نا۔ بدیس کیلئے تو گڑ چوکھا ڈالا تھا۔ پر قسمت دیکھو، غریبی میں روزے رکھے اور دن بڑے آئے۔

اب پتنگے تو لگنے تھے۔ جو ڈیڑھ سو ڈالر بھرا بھی تو سکھ پھر نصیب نہ ہوا۔

شوشا سے بھی گئے۔ اور ڈینگیں بھی گئیں، سچ کہا کسی نے، جیسا منہ ہوتا ہے ویسی ہی چپیڑ (تھپڑ) پڑتی ہے۔

اب ضرورت تھی مصالحت کی۔ کچھ نرمی ہم نے دکھائی کچھ اُس نے۔

چلو سفید بیڈ شیٹ تکیوں کے غلاف اور رضائی کے کور اُن کے فراہم کرنے پر ہم لوگوں نے خود ہی تبدیل کر لئے۔

باتھ روم میں نہانے کیلئے کھڑا تھا۔ ہمارے گاؤں میں یہ سیمنٹ کے ہوتے ہیں یہاں رنگین ٹائیلیں تھیں، چوکڑی مار کر بیٹھنا ذرا مشکل تھا۔ پر کیا کرتے جی۔ بیٹھے۔

ظہر کی نماز پڑھی۔ کاروباری اصول کے مطابق ناشتہ دینے کا کوئی جواز تو نہیں تھا۔ پر ہمارے کہنے پر دے دیا گیا۔ باورچی خانے میں بالکل گھریلو اور ممتا بھرے ماحول میں۔

کونے میں دھری دیودار کی لکڑی کی چھوٹی میز اور ارد گرد رکھی چار کرسیاں اتنی نئی نکور تھیں کہ جیسے ابھی ابھی ترکھان کے رندے تلے چِھل چھلا کر کوری صورت کے ساتھ آئی ہوں۔

لڑکی نے پلیٹ میں کُرکُرے سے ٹوسٹ رکھے۔ اُبلے انڈے مکھن جیم پنیر کی ایک لیئر چھوٹا سا دہی کا ڈبہ اور سیلون کی بہترین چائے۔

''چلو سب اچھا ہے۔ اگر چائے اچھی ہے''۔ میں نے خوشدلی سے سوچا اور چند لمحوں قبل والی تلخی کو بھلا دیا۔

یہ دراصل گیسٹ ہاؤس تھا۔ پچھتر سالہ خاتون نتالیہ اور اس کے بھائی کا جسے انہوں نے تھوڑی بہت رینویشن کے بعد گیسٹ ہاؤس میں بدل دیا۔ انگریزی بولنے والی لڑکی میونخ سے تھی۔ یونیورسٹی میں لسانیات پر ریسرچ کر رہی تھی۔ اور یہاں پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہوئے تو نوابی انداز سے اُٹھ آنے کی بجائے سوچا۔

''یار برا لگتا ہے، برتن دھو دیتے ہیں۔''

سارے برتن دھوئے۔ سلیقے قرینے سے انہیں ان کی جگہوں پر رکھا اور اپنے آپ سے کہا۔

''کیا یاد کرے گی لڑکی بھی کہ کتنی اچھی پاکستانی خواتین سے واسطہ پڑا ہے اُس کا۔''

اب گائیڈ بک لی۔ نقشہ لیا۔ ہوٹل کے کارڈ بیگ میں رکھے۔ سدوایا (Sadovaya) دہرایا۔ گیٹ اور دروازے کھولنے کے نمبر یاد کیے اور انہیں لکھا بھی۔

باہر دُھوپ پھیکی پر ہواؤں میں تیزی اور ٹھنڈی تھی۔ آسمان نیلا کچور تھا اور (Griboedov Canal) گریبوڈوونہر اونچی دیواروں کے اندر سست روی سے بہتی تھی۔ کونے پر پُل تھا اور پُل کی راہداری پر نصب سنہری پروں والے گرفن (ایک افسانوی مخلوق جس کے پَر اور سر شیر جیسے ہوتے ہیں) لگتا تھا جست لگائیں گے اور آپ کا تیہ پانچا کردیں گے۔ اُن کی فنکاری سراہتے، گدلے پانیوں کو دیکھتے، آسمان کو تکتے ہوئے، کتنی دیر تو یہی سوچتے رہے کہ پیٹرز برگ آنا کسی معجزے سے کم نہیں۔

شہر کی مرکزی شاہراہ نوسکی پراسپکٹ تو دو ہاتھ پر تھی۔ پر اس سے پہلے کازان کیتھڈرل دیکھنا پڑا۔ نیم دائرے میں بے شمار ستونوں پر کھڑی یہ عمارت شوخ رنگوں کی بوچھاڑ سے سجے آرتھوڈکس گرجاؤں کے برعکس ایک مضروب، شکست خوردہ اور اُداس سے تاثر کو نمایاں کرتی تھی۔

پر جب اندر گئے۔ عبادت جاری تھی اور رنگوں کی شگفتگی پھولوں کی طرح کھلی ہوئی بیرونی تاثر کو زائل کرتی تھی۔ وسیع و عریض ہال میں لوگ بکھرے کھڑے تھے سرخ چمکیلے طلائی کڑھائی اور بند کیوں سے سجے گاؤن اور ٹوپیاں پہنے، پادری لوگوں کی خاص کمرے سے ہال میں دعائیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ آنے اور جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ یقیناً عبادت کا کوئی حصہ تھا۔

جہاں میں کھڑی تھی اُس کے عین سامنے مقدس مریم اور بیٹے کی بے حد باریک اور بے حد نفیس منبت کاری میں چھوٹی چھوٹی سی تصویریں تھیں جو ائی کون آرٹ کی نمائندہ تھیں۔

وسیع و عریض ہال میں کہیں بیٹھنے کا انتظام نہیں تھا۔ کوئی پون گھنٹے سے تو باقی لوگوں کے ساتھ ہم بھی مسلسل کھڑے تھے۔ اور یہ بھی میرا اپنے آپ سے ہی سوال تھا کہ اگر آرتھوڈکس

عیسائی عقیدے میں بیٹھنے کی ممانعت ہے تو بھی یہ بڑی مشقت والی عبادت ہے۔

اب کم از کم میں نے تو اس امکان کے پیشِ نظر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائی تھیں کہ کہیں کوئی خالی جگہ ہے جہاں میں ہلکی سی ٹیکی لے سکتی ہوں۔ اور جب میں عقبی سمت کی ایک چھوٹی سی بالکونی میں دھری سنگ مرمر کی سلیب کی طرف بڑھتی تھی مجھے سری لنکا کا شہر نگمبو یاد آیا تھا جس کے ایک کیتھولک چرچ میں قدیم رُومی تماشا گاہ کی طرز پر بنی قطاروں میں میں نے لوگوں کو مزے سے بیٹھے عبادت کرتے دیکھا تھا۔ میں بھی جا کر پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئی۔ یوں ایک تو تھکن دُور ہوگئی اور دوسرے سمجھ نہ آنے کے باوجود سُریلی موسیقی میں ڈوبی آوازوں سے لُطف اُٹھایا۔

تبھی ڈیشنگ قسم کا ایک لڑکا دھان پان سی لڑکی کے ساتھ آیا اور سلیب کی دوسری سمت بیٹھ گیا۔ لڑکی برٹش یا امریکن دِکھتی تھی۔ لڑکے کے چہرے پر پھیلی کوفت اور بیزارگی جو تھی سو تھی پر لہجہ اُس سے کہیں سوا تھا۔ وہ لڑکی سے انگریزی میں مخاطب تھا۔

اب اگر میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا اور میری ماں نے بھی میرے باپ کی موت کے بعد ایک دو شادیاں کر لی ہوتیں تو یوں مجھے اُسے ہفتے میں ایک بار اس چرچ لانا نہ پڑتا۔ یہاں میں اُسے زبردستی لا رہا ہوں کہ یہ کم از کم کھلا تو ہے۔ ہمارے گھر کے قریب والا چرچ بہت چھوٹا اور تاریک سا ہے۔ نیم روشن کمرے میں بندے پر بندہ چڑھا ہوتا ہے۔ ایک میری ماں کا بڑھاپا، دوسرے اُس کا قد چھوٹا، اُوپر سے ماشاء اللہ پادری کو مسلسل دیکھے بغیر اُس کی عبادت نامکمل۔ پنجوں کے بل کھڑی ہونے کی کوشش میں پاؤں کا بھُرتہ بنالیتی ہے۔

ہماری رُوسی زبان کی ایک کہاوت ہے۔

''رُوسی کرسچین چرچ تکلیف بھی دیتا ہے اور ذلیل بھی کرتا ہے۔

''ہم تو بھئی بڑے مزے میں ہیں۔ اول تو چرچ جاتے ہی نہیں۔ اور اگر جائیں بھی تو انجوائے کرتے ہیں۔''

لڑکی ہنسی تھی اور ہنستے ہنستے یہ بولی تھی۔

یہ بڑی مزے کی گفتگو تھی جسے میں نے لُطف لیتے ہوئے سُنا۔

اور جب ہم چرچ کے اندر گھومتے تھے۔شمالی حصے میں فلیڈ مارشل میخائل (Mikhail) کا مقبرہ اعزازی نشانوں کے ساتھ نظر آیا۔نپولین کی مہم جوئی کے دوران مارشل میخائل کی قیادت میں رُوسی افواج بہت جواں مردی سے لڑیں۔نپولین نے شکست کھائی اور میخائل قوم کا ہیرو بنا۔

کازان کیتھڈرل میں اُسے دفن کرنا اُس کے لئے وہ اعزاز تھا جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔

بڑی خوبصورت لڑکیاں مشعلیں جلا رہی تھیں جنہیں دیکھ کر میرا بھی جی چاہا تھا کہ میں بھی جلاؤں۔

بس تو دو موم بتیاں خریدیں۔ایک بچوں کی تندرستی، صحت و زندگی کے لئے جلائی دوسری اپنے وطن کی سالمیت امن اور خوشحالی کے لئے جلائی۔ پھر مجھے اپنے مرحوم والدین کی ہُڑک اُٹھی۔میں کارنر پر پھر گئی۔ان کے لئے موم بتی لائی اور جلائی۔

کیتھڈرل سے باہر پھولوں بھرے حاشیے سے آراستہ لان تھا۔اطراف میں بینچوں کی لمبی قطاریں تھیں۔فوارے سے پانی اُچھل اُچھل کر خفیف سی بوچھاڑ کی صورت چہرے کو نم کرتا تھا۔

سامنے سنگی چبوترے پر فیلڈ مارشل میخائل اپنی پوری قامت سے کھڑا ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں چھوٹی راڈ پکڑے گویا چیلنج کرتا ہو کہ ہے کوئی جو رُوس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔

تیکھے خدوخال والا ایک حسین جوڑا شاہی زمانوں کا لباس پہنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتا سیاحوں کو اپنے ساتھ تصویریں کھنچوانے پر مائل کرتا تھا۔ابھی رنگین شیڈوں کے نیچے کافی اور ڈرنک بار پر لوگوں کا جمگھٹا نہیں لگا تھا۔

سفید بینچ پر بیٹھ کر کافی کے چھوٹے چھوٹے سِپ لیتے کیتھڈرل کے مرکزی گیٹ کی سیڑھیوں کو دیکھتے ہوئے مجھے کچھ یاد آیا تھا۔

تو یہی وہ سیڑھیاں ہیں جہاں چھ دسمبر 1876ء کے کُہر آلود دن وہ اکیس سالہ نوجوان پلیخا نوف چڑھا تھا اور جس نے اس قطعہ زمین پر جہاں میں اس وقت بیٹھی دھوپ سینکتی ہوں پر بکھرے سینکڑوں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے ''زمین کسان کی ہے اور شوشلسٹ انقلاب زندہ باد'' کے دُھواں دھار نعرے لگائے تھے۔

اور تاموف کے علاقے سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان آنے والے وقتوں میں ایک نظریاتی دیوثابت ہوا۔ بے حد دلیر، جی دار، غصیلا۔ رُوسی مارکسزم کا ایک ایسا افسانوی کردار جس کی زندگی کا ایک حصہ خطرناک زیرزمین سرنگوں اور جلاوطنی میں گزرا۔

مجھے یاد تھا۔ پلیخا نوف پر پڑھتے ہوئے اُس کے زیرزمین زندگی گزرانے ہمہ وقت برچھی اور پستول سے لیس ہونے اور مظلوم لوگوں کی مشکلات میں اُن کی مدد کرنے پر مجھے وہ اُن کرداروں جیسا ہی لگا تھا جن کے بارے میں پڑھتے ہوئے میں نے ہمیشہ ایک سنسنی خیز احساس کے ساتھ ساتھ اپنے دل میں محبت واحترام کے جذبات بھی محسوس کئے تھے۔ میرے وطن کے اُن ڈاکوؤں جیسا جنہیں حالات کا جبر کبھی ڈکیت اور کبھی اسمگلر بنا دیتا ہے۔ پر جن کے دلوں میں بیوائیں، یتیم اور غریب بستے ہیں۔ پلیخا نوف بھی ایسا ہی تھا۔

باب

12

نوسکی پراسپکٹ کے اُتار چڑھاؤ • الیگزینڈر دوم کے بہتے خون پر گرجا

سمر گارڈنز کی سحر آفرینیاں • فیلڈ آف مارز و شہدا کا مدفن

Подём И Спуск Невекий Проспект.
Устроиества Церкве Тикущи Алексендр II
Создающий Устрение Лета
Магила Неизвестных Слдатов

نوسکی پراسپکٹ پر ٹریفک کا دھواں دھار ریلا حد درجہ تمیز دار اور منظم تھا۔

پاؤں پاؤں چلنے والوں کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ چوک پر کھڑی میں چہار جانب خوبصورت منظروں کی زد میں تھی۔

سامنے گریبوڈوو (Girboyedov Canal) اپنے مٹیالے پانیوں اُن میں تیرتی کشتیوں دو رویہ خوبصورت عمارتوں اور سڑکوں کے ساتھ بہت دور تک چلی گئی تھی۔ جہاں نظر بلاک ہوتی تھی۔ وہاں پُل اور پھر کتنے رنگوں والا چرچ آن دی سپلڈ بلڈ (Church on the spilled blood) بہار دکھاتا تھا۔ دائیں طرف تیر کی طرح جاتی نوسکی شاہراہ پر انسانوں کا ایک رنگا رنگ اژدہام اُمنڈا پڑا تھا۔ خوبصورت عمارتیں اپنے تعمیراتی حُسن اور کم و بیش ایک سے تناسب کے ساتھ باوقارانہ انداز میں کھڑی تھیں۔

عمارتوں کے ایک حد میں رہنے کی بڑی وجہ وہ نادر شاہی حکم تھا جس کے تحت کوئی پتھر کی عمارت زاروں کی رہائش گاہ ونٹر پیلس سے بلند نہیں ہو سکتی تھی۔

ہر تہذیب ہر زمانے اور ہر جگہ کی شاہی ایلیٹ کی ایک ہی نفسیات رہی ہے کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے۔

پیٹرز برگ کی اس بے حد اہم شاہراہ کی آغاز کی صورت گری بہت سست روی سے ہوئی۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں تو جنگلی جانور بھیڑیئے اور سُور جب جی چاہتا مست خرامیاں کرنے اس پر آ نکلتے۔ سیلاب کے دنوں میں کشتیاں بھی چلتیں۔ یہ بیچاری بھی کیا کرتی۔ ٹاؤن پلانرز تو نیوا کے کناروں اور ویسلیفسکی (Vasilievsky) آئی لینڈ کو بنانے سنوارنے میں لگے ہوئے تھے۔ اُنیسویں صدی کے اختتام پر اسے وہ تجارتی اہمیت ملی جس میں آئے دن اضافہ ہوا۔

چوک میں ہلکے زہر مہرہ رنگی دیدہ زیب عمارت کی چوٹی پر مجسموں کا گروپ دھات اور شیشے کا ایک گلوب ہاتھوں میں پکڑے کھڑا ہے۔ یہ خوبصورت کاریگری مشہور سنگر سلائی مشین کی جانب سے تھی جو دنیا بھر میں ان کی مصنوعات کے پھیلاؤ کا ایک اظہار تھا۔

نوسکی پراسپکٹ ایڈمیریلیٹی سے شروع ہو کر کسی نازنین کے سیاہ بالوں کے درمیان چمکتی مانگ کی طرح سیدھی چلتی ہوئی ماسکو سٹیشن پر خفیف سا خم کھا کر آگے بڑھتی موسکوا ہوٹل سے نیوا کے ساحلوں پر دائیں بائیں نئے ناموں والی شاہراہوں میں گُم ہو جاتی ہے۔ یہ نیوا کے دونوں کناروں کے درمیان شمالاً جنوباً اور نیوا ہی کے بطن سے نکلی چھوٹی چھوٹی نہروں پر بستے خشکی کے ایک بڑے قطعے کی ہی نہیں بلکہ سارے پیٹرز برگ کی ابتدائی مرکزی اور تاریخی شاہراہ ہے۔

موجودہ نام اسے 1760ء میں ملا۔ پیٹر اعظم کے زمانے میں یہ بگ پراسپکٹ تھی۔ اُس کی موت کے بعد یہ نیوا پراسپکٹ بنی۔ جب کمیونسٹ آئے اس شاہراہ کے ساتھ اُن کی بہت سی تلخ و شیریں یادیں وابستہ تھیں۔ ان کے بعض تاریخ ساز خطابات اس کی چند عمارات اور جگہوں پر

ہوئے۔ اس شاہراہ نے انقلابیوں کے جلسے جلوسوں کے بوجھ، اُن پر چلتی گولیوں کی خوفناک آوازوں کی دھمک۔ اُن کے ارزاں خون سے رنگتے اپنے وجود کے ٹکڑوں اور خود پر گرتی لاشوں کے کرب کو بھی سہا۔ اس نے قیمتی اور خوبصورت ملبوسات میں ایلیٹ کلاس کے مرد عورتوں کو محنت کشوں کی پٹائی کرتے ہوئے اور بالشویکوں کے خلاف انہیں گالیاں نکالتے ہوئے بھی دیکھا اور سُنا۔

بالشویکوں کے اقتدار میں آنے پر اسے ''پچیس اکتوبر ایوینو'' کا نام ملا۔ پر یہ نام عوامی پذیرائی حاصل نہ کر سکا اور جونہی انقلاب کے اثرات ختم ہوئے اسے نوسکی پراسپکٹ کہا جانے لگا۔ ایک خوشحال شہر کی نمائندہ شاہراہ۔

گریبوڈوو کینال (Griboevdov Canal) کے ساتھ ساتھ چلتے ہم نے شام کی سنہری کرنوں میں نہاتے نہر کنارے کھڑے ایک بوڑھے سے کلارنٹ سُنا۔ کیا خوبصورت انداز اور انہماک تھا۔

گتار بجاتے نوجوان لڑکوں کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ کر گتار کی دلنواز تانوں سے خود کو دیر تک محظوظ کیا۔

شام چرچ کے چرنوں میں چڑھائی۔ پیازی رنگ کی جھلکیاں مارتا چھوٹی اینٹ سے بنا موزیق آئی کونسٹوں (Mosaics iconostasis) اور گنبدوں کی انوکھی وضع سے سجا یہ چرچ ایک تاریخی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ آرٹ کا بھی نمائندہ تھا۔

نام کیسا عجیب وغریب سا تھا۔ ''بہتے خون پر گرجا''۔

The church on the spilled blood. تاریخ نے تو شاید ٹھان لی ہے کہ اس نے اپنا دامن پورب ہو یا پچھم، اُتر ہو یا دکن ہولناکیوں سے ہی بھرنا ہے۔

زار الیگزینڈر دوم اس جگہ بم بلاسٹ کے نتیجے میں قتل ہوا۔ اس خونیں واقعے کی یاد میں اسے تعمیر کیا گیا۔ قتل کی وجہ بیرونی صیہونی طاقتیں تھیں جو یہاں انقلاب لانے کے درپے تھیں۔ کریمین جنگ میں رُوس ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر اقتصادی طور پر دیوالیہ ہو گیا تھا۔ نچلا

طبقہ پس رہا تھا۔ ابتر معاشی حالت سے دوچار تھا۔

تخت نشینی کے ساتھ ہی الیگزینڈر دوم نے بہت اہم اصلاحات نافذ کیں جن میں پہلی ''کسان غلامی'' کے قانون کا خاتمہ تھا۔ اس کے ساتھ فوج، میونسپل تنظیموں، انصاف کی فوری فراہمی، عدالتوں، سینسر شپ کے قوانین پر نظر ثانی، یونیورسٹیوں کی خودمختاری، مقامی اور صوبائی سطح پر منتخب اسمبلیوں جیسی اصلاحات کے نفاذ نے اُن سب کمیونسٹ اور فری میسنز ی تحریکوں کو مضطرب کر دیا تھا۔

خارجہ پالیسی میں تبدیلی کی طرف اس کی فوری توجہ نے ملک کو پرانے بحران سے نکالنے میں مدد دی۔ اُس نے سلطنت کو مزید پھیلانے کی بجائے بارڈروں پر دھیان دیا۔

وہ انقلابیوں سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ رُوسی نقادوں کا یہ کہنا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا اور اس کی نافذ کردہ اصلاحات پر عمل ہوتا تو رُوس میں بیسویں صدی کا انقلاب کبھی نہ آتا۔

یہ صیہونی طاقتوں کی سازش تھی کہ ایسے حالات پیدا کرنے ہیں کہ جنگ وجدل کے سامان ہوں۔ مشیت ایزدی بھی شاید یہی ہے کہ انسان ہنگاموں میں ڈوبا اور خون میں نہاتا رہے۔ جنگ کے طبل بجتے رہیں اور میدان انسانی لاشوں سے پٹتے رہیں۔

خلاف معمول یہ یکم مارچ 1881ء کی چمکتی سہ پہر تھی۔ الیگزینڈر دوم بگھی میں سوار گریبوڈوو (Gribye Dov) کینال کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ اُس کے چہرے پر طمانیت اور شادمانی کی لہروں کا رقص سا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل اُس نے اُس منشور پر دستخط کیے تھے کہ جس کی رُو سے ایک مضبوط قومی مشاوراتی اسمبلی وجود میں آئی تھی۔

بگھی کی رفتار آہستہ ہوگئی تھی۔ یہاں اُس نے کوساکوں (بھگوڑے کسان غلاموں کی اولاد جو زار کی وفادار فوج تھی) کے ایک اجتماع سے خطاب کرنا تھا۔ تبھی برف جیسا ایک گولا اس کے قریب آکر پھٹا۔ بھگدڑ سی مچی۔ وہ خفیف سا زخمی بھی ہوا تاہم خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ خطاب کے لئے نیچے اُتر آیا۔

مجمع میں سے ایک تیز اور وحشت سے لبریز آواز گونجی۔

''ابھی خدا کا شکرادامت کرو۔''

اس کے قدموں میں ایک اور بم پھٹا۔ یہ Nahrdodnayavolya پیپلز وِل کا ایک دہشت گرد طالب علم آئی گرینوٹسکایا(Grinevitsky) تھا۔ صرف گھنٹے بعد زار مر گیا تھا۔

پہلے تو ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلتے اسی سمت کے ایک دروازے سے اندر جا گھسے، روکے گئے، ہمارا تھوڑا سا اصرار کہ اب آ گئے ہیں تو جانے دو۔ پر وہاں مظبوط انکار۔ پھر اوپر کی سمت سے ٹکٹ گھر تک آئے۔ تین سو روبل کا ٹکٹ خریدا۔ ساتھ میں لٹریچر بھی لیا۔ گائیڈ کرنے پر اندر گئے۔ ایک عجیب سی سیلن زدہ باس استقبال کے لئے آگے بڑھی تھی۔ کیمونسٹ دور میں جب عبادت گاہوں کو تالے لگا دیئے گئے تو زمانوں کی گھٹن نے اپنے اثرات تو چھوڑنے تھے۔ یہ بیچارہ تو اور بھی تشدد کا شکار رہا کہ یہاں آلوؤں کو سٹور کیا جاتا تھا۔

میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ مذہب کی دنیا بھی اپنے اندر کتنے رنگ اور کتنے جہان سموئے ہوئے ہے۔ عقیدے اور عقیدتوں کے مارے لوگ کہیں ظالم اور کہیں مظلوم۔ ایک جہان یہاں آباد تھا فن کاری کا۔ بہت دیر تک چپ چاپ کھڑی میں Iconostasis دیکھتی رہی۔ عبادت کی یہ رنگی صرف یُونان اور رُوس کے آرتھوڈوکس گرجاؤں میں ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ کیتھولک چرچوں میں ان کا رواج نہیں۔ آئی کون دراصل مذہبی شخصیات کی بہت چھوٹی تصویر کشی ہے۔

مرکزی گنبد نے بھی نگاہوں کو دیر تک جکڑے رکھا۔ اگر میری گردن نہ دُکھنے لگتی میں نے سر نہیں جھکانا تھا۔ چرچ کی تعمیر و آرائش پر چوبیس 24 سال لگے۔ روسی ماہرین کے ساتھ ساتھ غیر ملکی فرموں کے ماہرین اور آرٹسٹوں کی کثیر تعداد نے محبت، لگن اور جانفشانی سے اس کی دیواریں اور گنبدوں کو بائبل کی مختلف آیات کے مرکزی خیال کی پینٹنگ اور پچی کاری سے رعنائی دی۔

"The kiss of Judas" اور "The last supper" کے بارے میں بہت پہلے کہیں پڑھا تھا۔ اب یہاں مرحلہ وار اُس کی تصویر کشی، خوبصورت رنگ آمیزی کے ساتھ

دیکھنے کو ملی تو میں نے گہری دلچسپی سے اُس کا مطالعہ کیا۔

"The Eucharist" (آخری طعام) کے بعد یسوع کا اپنے حواریوں کے سامنے آخری خطاب۔

''تو گویا یہ زیتون کی وہ پہاڑی ہے جس پر اُن کا آخری ایڈریس تھا۔ اور یہ یقیناً قدرون کا نالہ ہوگا۔''

اُن کا باغ میں بیٹھنا، پیروکاروں کا سو جانا، مشعلوں کے ساتھ بہت سارے لوگوں کا ہجوم۔

بچی بات ہے جیسے کوئی معمہ حل کرتے ہوئے بندہ تکّے لگاتا ہے تو کچھ ایسا ہی حال میرا تھا۔ یسوع کے گال پر بوسہ دینے والا تو یقیناً Judas Iscariosti ہی ہوگا۔

حضرت عیسیٰ کا پسندیدہ حواری جس نے صرف تیس طلائی سکوں کے عوض یہودیوں کے چیف کاہن Caiaphas کے ساتھ مسیح کی شناخت اور انہیں پکڑوانے کا سودا کیا تھا۔

میں نے اپنے حافظے اور تصویروں سے اس کہانی کو پڑھتے ہوئے لطف اٹھایا تھا۔

چرچ کوئی اکیاسی میٹر اُونچا اور 1642ء اسکوئر میٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔

قتل کی جگہ بلڈنگ کے مغربی حصے میں گھنٹی کے نیچے ہے۔ اس حصے میں چوکور ستونوں کی ساخت نے مجھے بے اختیار مصر کی ملکہ نفرتیری کے مقبرے کی یاد دلا دی تھی۔ چھوٹا سا چیمبر فرش کے لیول سے تھوڑا سا نیچے ہے۔ یہاں بگھی اور ریلنگ کا وہ حصہ جو خون آلودہ ہوا رکھے ہوئے ہیں۔ اس حصے میں کسی پینٹنگ کا نہ ہونا بھی اس ماحول کو افسردگی دیتا ہے۔

پر ایک بات ضرور تھی جو نمایاں طور پر لکھی گئی تھی کہ پیروکاروں کی وفاداریاں اور محبتیں 1930ء میں انتہا پسندوں کے ہاتھوں گرجا کو بند کرنے سے نہ روک سکیں۔ یوں خدا کی محبت نے بھی اسے تباہ ہونے سے بچا لیا جب اس کے گنبد پر بم پھینکا گیا اور وہ پھٹا نہیں۔

چرچ میں کم وبیش دو ڈھائی گھنٹے تو گذر ہی گئے تھے۔ خیال تھا کہ باہر نکلیں گے تو ڈھلتی شام کا حسن سامنے آئے گا۔ پر جب دیکھا تو لگا کہ جیسے دھوپ کے پاؤں میں تو کسی نے زنجیریں

پہنا دی ہیں۔ جہاں چھوڑ کر گئے تھے وہیں ساکت ہوئی کھڑی ہے۔

سمر گارڈنز (Summer Gardens) کی سیاہ سنہری آرٹ کی فنکاری سے مالا مال دس فٹی اونچی ریلنگ کی دیوار نے کسی مقناطیس کی طرح ہمیں کھینچ لیا تھا۔

جس دروازے سے داخل ہوئے، اُس پر موٹی تازی خوبصورت عورتوں کے ایک بڑے سے جتھے کا قبضہ تھا۔ اندر داخل ہونے کی دیر تھی کہ میز کرسی پر بیٹھی دو عورتوں نے روک لیا کہ ٹکٹ لو۔

''اللہ ان کے باغوں پر بھی ٹکٹ ہیں''۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔

اور ابھی ہم حیرت زدہ سے گومگو کی کیفیت میں ڈوبے کھڑے تھے۔ جب ایک عمر رسیدہ عورت نے ہاتھ سے اشارہ دیا کہ جاؤ۔

غالباً یہاں کسی پروگرام کے سلسلے میں کچھ ہونے والا تھا۔ ہم نے چاہا کہ جانیں پر اتنے بڑے مجمع میں مجال جو کسی کو انگریزی سمجھنی یا بولنی آتی ہو۔

یہ انگریزی کا فوبیا صرف ہم ہندو پاک کے لوگوں کو ہی ہے۔ دنیا کی قومیں کہاں اس کمپلکس میں مبتلا ہیں۔ میں نے بے اختیار ہی سوچا تھا۔

باغ کیا تھا بہشت بریں کا ٹوٹا تھا۔ ہرے کچور درختوں، سرسبز لانوں، کشادہ روشوں، لبالب بھری نہروں اور خوبصورت نسوانی مجسموں سے سجا۔

گھاس خاصی لمبی تھی۔ جگہ جگہ رکھے بینچوں پر اکا دکا لوگ بیٹھے تھے۔ گھاس پر بیٹھنے کا شاید رواج نہیں یا اجازت نہیں۔

باغ کو جگہ جگہ سنگی چبوتروں پر دھرے مجسموں نے کمال کی خوبصورتی دے رکھی تھی۔ یہ پیٹرز برگ کے اٹھارویں صدی کے تعمیر شدہ باغوں میں سے سب سے پرانا اور خوبصورت ترین ہے۔ ابتدا میں تو اس کے کنارے نوسکی پراسپکٹ کے گلے تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن شہر پھیلنے اور مرکزی جگہ کے کمرشل ہونے کے ساتھ زمین کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافوں نے اس کے

پھیلاؤ کو قدرے کم اور حدود کو تھوڑا اسمیٹ دیا۔

اس کی ریلنگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی ریلنگ اس کے مقابلے پر نہیں اس دعویٰ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ جس پریت اور لگن سے فنکاروں نے آرٹ کے شہ پاروں سے اس کے حسن کو دوچند کیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

ابتدا میں اطالوی فنکاروں کے کوئی دوسو بیس (220) مجسمے تھے۔ اب صرف یہاں نوے (90) کے قریب ہیں۔

باغ کے شمال مشرقی کونے میں پیٹر اول کا سمر پیلس بھی نظر آیا تھا۔ دومنزلہ۔ عقب میں نیوا کے پانی تھے۔ بہت دیر تک ہم پانیوں کو طلائی پیرہن پہنے دیکھتے رہے۔

دخانی کشتیاں فراٹے بھرتی شور مچاتی گذر رہی تھیں۔ دور پانیوں میں کھڑی چند عمارتیں نظر آئی تھیں۔

پھر ہمیں سمر گارڈنز کے اُس گیٹ سے نکلنے کو کہا گیا تھا جسکے دروازے اُس کشادہ سڑک پر کھلتے تھے جہاں سے مویا کا کینال دور نیوا کے وسیع پانیوں سے گلے ملتی نظر آتی تھی۔ سامنے وسیع وعریض قطعہ زمین کٹاؤ دار گھاس اور سرخی مائل براؤن ٹکڑوں میں بٹا دلفریب سا نظر آیا تھا۔

''یہ کونسی جگہ ہے؟''

میں رُک گئی تھی۔ پاس سے گذرنے والے ایک دو تین چار راہگیروں کو روکنے کا کچھ فائدہ نہ ہوا تھا۔ وہ مونڈھے مارتے بے نیازی سے آگے بڑھ گئے۔ پر جب بندہ ڈھیٹ بن جائے اور تُل جائے کہ اُس نے کچھ لے کر ہی ٹلنا ہے تو پھر دھیلے پولے کی خیرات پھیلے ہوئے کشکول میں پڑ ہی جاتی ہے۔

دولڑکیاں ہتھے چڑھیں۔ ایک پر تو وہ مثال صادق بیٹھتی تھی کہ پہروں دیکھو اور جی نہ بھرے۔ کوہ قاف کی بلندیوں سے ہی اُتری ہوگی۔ دوسری ٹھیک ہی تھی۔ رنگ گورا تھا۔ رنگ کا گورا ہونا بھی تو کسی کمال سے کم نہیں۔ ماڑے موٹے نقوش بھی ڈھنپ جاتے ہیں۔

''یہ فیلڈ آف مارز ہے۔''(The Field of Mars)

میرے تفصیل پوچھنے پر حسینہ عالم نے سٹائل سے کندھے اُچکائے۔ غالباً سوال تو اُس کے پلے ہی نہیں پڑا تھا۔ انگریزی ہیلو ہائے سے آگے نہیں جاتی تھی۔ پر دوسری نے تھوڑا سا بتایا کہ یہاں شہیدوں کی قبریں ہیں۔

''کون سے شہیدوں کی؟''

اس سے لاعلمی کا اظہار اسکے پاس بھی تھا۔

''فیلڈ آف مارز'' ذہن کا دریچہ کھل گیا تھا۔

پال اول کے زمانے میں یعنی اٹھارویں صدی کے وسط تک یہاں ملٹری پریڈ ہوتی تھی۔ کھلے موسموں میں پبلک تھیٹر اور دوسرے اجتماع ہوتے۔ پانچ سو میٹر شمال سے جنوب اور تین سو میٹر مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی یہ جگہ خوبصورت نظر آ رہی تھی۔

سڑک پار کر کے اس میں داخل ہو گئے تھے کہ آگے نیوا کے نیلے پانیوں کی وسعتوں نے نظروں کو عجیب سا سحر آشنا کیا تھا۔

اُس کا نک نیم پیٹرز برگ سہارا (Sahara) بھی ہے۔ 1917ء کے فروری انقلاب میں ہزاروں انقلابیوں کی لاشوں کو چھکڑوں گاڑیوں میں لاد کر یہاں پھینکا گیا تھا۔ انقلاب کی تاریخیں بھی کیسی خوفناک ہوتی ہیں۔ گراؤنڈ کے عین وسط میں رُک کر ہم نے گمنام شہدا کیلئے دعائے خیر کی۔

کچے راستے پر چلتے ہوئے نیوا کے ساحل پر آ گئے۔ سامنے پیٹرو گراڈ سکائے آئی لینڈ پھیلا ہوا تھا اور پُل پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ ہمارے بائیں ہاتھ ماربل پیلس تھا۔ سکوائر میں ہم ایک سمت بیٹھ گئے تھے۔ فطرت کا بکھرا ہوا حُسن اور انسانی دماغ و ہاتھوں کی کاریگری و رعنائی کے نمونے باہم دست و گریبان تھے۔

نمبر ون کون ہے؟ فیصلہ مشکل تھا۔

باب

13

ہرمیٹیج • ونٹر پیلس • مارشل • سینٹ جارج
• وائٹ و آرموریئل ہالز • گولڈڈ رائنگ • میلاچی رُومز

سیمن چارڈن(Simeon Chardin)

لیون جروم اور جوشا رینالڈز(Joshua Reynolds) سے ملنا

Зимни Дворец Маршал, Сент Джрдж, Бели Арморил Хали, Мелачи Зал.
Встреча с Чардина, Левон Джроммом И Джоша Реннолдом.

ریسیپشن کاؤنٹر پر کھڑی پونے چھ فٹی قامت والی لڑکی کی صراحی دار گردن پر جو سر ٹکا تھا اُس پر ایک گلاب چہرہ سردیوں کی چاندنی راتوں کی طرح سنجیدہ اور اُداس سا جھلملاتا تھا۔ ایک تو مجھے ان رُوسی لڑکیوں کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ کمبختیں مسکراہٹوں کو سات تالوں میں کیوں قید رکھتی ہیں؟ اس پر کیا زور خرچ ہوتا ہے؟ پر انہیں کون بتائے کہ باچھوں کو ذرا سا کھول دینے سے اُن کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

ہاتھ میں پکڑی گائیڈ بک میں نے کاؤنٹر پر رکھی۔ اور اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ یہ بھی

مقامِ شکر تھا کہ انگریزی کا دال دلیہ کر لیتی تھی۔ اُس نے نقشہ کھول کر میرے سامنے رکھا۔ ایڈمرل کی نشان دہی کی۔ گریبوڈو کینال (Griboedov Canal) کو لکیر سے کھینچتے ہوئے اُسے چوک تک لے گئی۔ نوسکی پراسپکٹ (Novskiy Prospket) مرکزی شاہراہ کو نمایاں کیا۔ چوک سے قلم کا رُخ بائیں طرف موڑا۔ تھوڑا سا آگے جا کر دائیں ہاتھ مڑ گئی۔ پیلس سکوائر، سامنے ونٹر پیلس اور ہرمیٹیج (Hermitage) ہیں۔ لیجئے! پل جھپکتے میں سب کچھ واضح ہو گیا۔

پنڈے پر پانی ڈالنے کی ازلی چور۔ کل خیر سے آنے کے ساتھ اشنان کر لیا تھا۔ سو اب نہانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ کپڑے بدلنے کا بھی تردد مجھے نہیں کرنا تھا۔ ہاتھوں کی چند اُلٹی سیدھی ماریں ان کی جھریوں اور شکنوں کے بل کس کیا نکالتیں۔ پر دل کی تسلی کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ سو ایسا کیا۔ میری کنگھی پٹی بھی بس ایک منٹ کی مار تھی۔ کون سا پھول تارے ٹانکنے تھے مجھے سر میں۔ تنقیدی نظر سے خود کا جائزہ لے کر کہا۔

''ٹھیک ہے جی۔ ہمیں کس نے دیکھنا ہے؟''

تڑکے سے پیٹ میں پانی کی بھرائی اور نکاسی کا سلسلہ جاری تھا۔ اب ناشتے سے اس کی ٹھونسم ٹھونسی کی فکر تھی۔

ناشتہ انہی مخصوص چیزوں پر مشتمل تھا جو ہم نے کل کھائی تھیں۔

بیرونی دروازے سے نکل کر اور سیڑھیاں اُتر کر ہم نے کارڈ پر درج کوڈ نمبروں کے مطابق دیوار میں نصب نمبر دبائے اور ''کھل جا سم سم'' کے کرشمے دیکھے۔

راستہ کل والا مانوس سا تھا۔ کازان چرچ سے نوسکی پراسپکٹ کے بائیں ہاتھ نیم دائرے میں بنی زردئی عمارتوں کے عین وسط میں اُونچی محرابی گزرگاہ سے آگے وسیع، عریض میدان میں بلند و بالا الیگزینڈر کالم اور اُس سے آگے ہریالی آبی رنگی عظیم الشان سہ منزلہ عمارت طلائی لشکاروں سے نظروں کو خیرہ کرتی بصارتوں کی زد میں آئی تھی۔ جون کی دُھوپ ہماری جنوری کی روشن دوپہر جیسی نرم گرم اور حدت سے لبالب بھری ہوئی تھی۔

الیگزینڈر کالم کے پاس رُک کر اُوپر نگاہ کی۔ کالم کی چوٹی پر تاج شاہی کا فرشتہ ایک ہاتھ میں صلیب تھامے دوسرے ہاتھ کو آسمان کی جانب اٹھائے اور سانپ کو پیروں سے لپٹائے گردن کو خود پر مرکوز رکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ کتنے ہی لمحے دید کی اس عشق و عاشقی میں گزر گئے۔

پیلس سکوائر کو موجودہ نام اٹھارویں صدی کے وسط میں اُس وقت دیا گیا جب رُوسی زاروں نے دریائے نیوا کے شمالی کناروں پر اپنی شاندار رہائش گاہیں ونٹر پیلس تعمیر کیں۔ جن کے توسیعی سلسلے بعد ازاں مختلف میوزیموں کی صورت میں تعمیر ہوئے۔

میرے سامنے شاندار عمارتوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ جن کی چھتوں پر شاہکار انسانی مجسمے مختلف صورتوں میں جابجا کھڑے اور بیٹھے حیرت زدہ کرتے تھے۔

دی سٹیٹ ہرمیٹیج (The State Hermitage) دنیا کے عظیم عجائب گھروں میں سے ایک ہے۔ پانچ تاریخی عمارات جن کا ایک حصہ ونٹر پیلس بھی ہے۔

پیلس سکوائر میں دھڑا دھڑ لوگوں کی آمد یہ بتا رہی تھی کہ وہ والی مثال ''انا شوقین تے گارے وچ لتاں'' ہم پر ہی صادر نہیں آتی تھی بے شمار اور بھی اس کا شکار تھے کہ نو بجے سے ہی چکروں پر چکر کاٹ رہے تھے جبکہ ٹکٹوں کا سلسلہ تو ساڑھے دس بجے شروع ہونا تھا۔

''چلو خیر جب تک گھومتے پھرتے ہیں'' ایک دوسرے سے کہا گیا۔

عقبی سمت کا حسن تو ہوش اُڑانے والا تھا۔ جب ہم سمال ہرمیٹیج (Hermitage Small) کے سامنے سے گزر کر اولڈ ہرمیٹیج (Old Hermitage) کو عقب میں چھوڑتے ہوئے ونٹر کینال پر بنے پہلے ونٹر برج پر آ کر کھڑے ہوئے تو دریائے نیوا کا ایک دلرُبا منظر سامنے تھا اور دُور اُس کے پانیوں پر فواروں سے اٹھتی بلند و بالا آبشاریں منظر کو دُھندلا کرتی تھیں۔

ویسلیو سکائے آئی لینڈ (Vasilevsky Island) کو جانے والے پُل پر ٹریفک کا ریلا تند و تیز موجوں کی طرح بہتا چلا جا رہا تھا۔ پُلوں کے نیچے سے سٹیمر اور کشتیوں کا آنا جانا جاری تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ میری یادداشتیں مجھے اٹھا کر استنبول لے گئی تھیں۔ دریائے باسفورس کے کنارے عثمانی سلاطین کا دولما باشی محل ونٹر پیلس سے کس قدر مشابہ تھا۔

''بھئی آخر کیوں نہ مشابہ ہوتا میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ہمسائیگی تھی۔ زاروں اور سلطانوں کے درمیان محبتوں کے اظہار کے لئے تحفے تحائف کا لین دین تھا اور کبھی کبھار توسیع پسندی کے عزائم کے تحت ایک دوسرے کی سرحدوں میں منہ ماری کر لینے میں بھی کچھ ہرج نہ سمجھا جاتا۔''

نیو ہرمیٹیج کا مرکزی دروازہ اسی سمت تھا۔آگے پیلس چرچ تھا۔ ہم رُک گئے تھے۔ دریائے نیوا کے نظاروں سے آنکھیں سینکنے لگے۔ سڑک پر بھانت بھانت کے لوگوں اور فضاء میں ان کی بھانت بھانت کی بولیوں کا شور تھا۔

ہر منظر خوش کن تھا۔اور ہر لمحے میں مسرّت اور تحیر تھا جسے کشید کرنے کا ایک اپنا لطف تھا۔ سامنے دُھواں اڑاتی آبشاریں دراصل پیٹر اینڈ پال فورٹریس کی تھیں۔

کسی سے وقت پوچھا اور دس بجے کا سن کر پیلس سکوائر کی طرف بھاگے کہ ٹکٹوں کے لئے انسانوں کی لمبی قطاریں چیونٹیوں کی لمبی لمبی قطاروں کو بھی مات دیتی تھیں۔

نفیس ڈیزائن دار سیاہ آہنی گیٹ جس کے دونوں سروں پر رُوس کا قومی نشان دی سٹیٹ ایگل آف رشیا(The state eagle of Russia) بیٹھا تھا۔

ماسکو کے قدیمی شہنشاہ اور زار بازنطینی جاہ وحشمت اور توہمات کے اسیر تھے۔اُن کے قومی نشان،اُن کے پرچم سبھوں میں بازنطینیوں کی تقلید تھی۔ دومونہے عقاب کے ساتھ تین تاج شامل کئے گئے۔ بڑا تاج ماسکو کا اور دوسرے دو تاج قازان اور استراخان کی ریاستوں کے تھے۔ جو تاتاریوں سے جنگوں کے بعد واپس لئے گئے۔

اندر داخلہ اُس باغیچہ نما چار دیواری میں ہوا،جس کے مختصر سے لان میں فوارے کا پانی اُونچے اُونچے اُچھلتا تھا اور جس کی سبز دیواروں،سفید ستونوں اور کھڑکیوں کی محرابی چوٹیوں پر

انسانی بچوں اور بڑوں کے سنہرے مجسمے عمارت کے حسن کو چار چاند لگاتے تھے۔

اگلے گیٹ میں مجھے خود سے آگے کھڑی نیویارک کی ایک امریکن خاتون کے یہ جاننے پر کہ ہم پاکستان سے ہیں، خوشی کے بے اختیاری اظہار پر ہنسنے کے ساتھ ساتھ یہ سوچنے پر بھی مجبور کیا تھا کہ اس پڑھی لکھی امریکن کو یقیناً اپنے حد درجہ وفادار غلام مُلک کے باشندوں کو اس اجنبی سرزمین پر اچانک دیکھ کر بے حد خوشی کا احساس ہوا ہے۔ جس کا برملا اظہار اس نے پوری بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے کیا ہے۔

شیشے کے کیبنوں میں خود کار مشینوں پر بیٹھی کھٹ کھٹ کرتی لڑکیاں بھی مشینوں سے کیا کم تھیں۔ چھ سو روبل جب آگے بڑھائے اور دو کا اشارہ انگلیوں سے کیا تو اس نے ماتھے پر چار تیوریاں ڈالتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اور آنکھیں نچائیں۔ اُنگلیوں کا حرکاتی انداز اور آنکھوں میں نمایاں کوفت بھرا احساس مجھ جیسی کوڑھ مغز کے پلّے کوئی مفہوم کب ڈالتا؟ اب جانے میری بلا۔ ہونقوں کی طرح سُن وٹہ بنی کھڑی تھی۔ اس نے کاغذ پر تیرہ سو لکھا اور میرے آگے کر دیا۔

مہرالنساء سے ہزار روبل کا نوٹ لینے اور دینے کے مرحلے میں میرے بھونڈے پن نے بڑی کوفت پھیلائی۔ لڑکی کا تو جیسے مُومُو چِلا رہا تھا۔ بُن دفعہ ہو۔ پرے مرجا کے۔ (اب دفع ہو جاؤ کہیں اور جا کر مرو)۔ چار ٹکٹوں اور بقیہ دو سو روبل نوٹوں کو تیزی سے پرس میں سنبھالتی ایک طرف ہوئی۔

ایک ٹکٹ ونٹر پیلس اور دوسرا Treasure Galleries کا تھا۔ برآمدے میں رکھے گئے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے میں نے پیشانی پر لرزاں خفت بھرے احساس کو ہاتھ سے پُونچھا۔ لمبی سانس کھینچ کر ’’بڑیاں واہیا تاں‘‘ نے (بڑی فضول ہیں) خود سے کہتے ہوئے اپنے آپ کو نارمل کیا۔

بڑے دروازے سے سہ رویہ محراب دار عظیم الشان ہال میں قدم دھرا۔ ابھی دوسرا قدم

باہر ہی تھا کہ کڑی چیکنگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ خلافِ توقع فربہی مائل خوبصورت عورتوں کا رویہ خاصا ہمدردانہ سا تھا۔ یہاں کھڑے ہوکر ہم دونوں نے چار گھنٹے بعد اکٹھے ہونے کی جگہ طے کی۔ اور آگے بڑھ گئے۔

مرکزی راہداری بچوں اور بوڑھوں کے قد آدم ننگے مجسموں سے سجی تھی۔ آرٹ کے یہ شاہکار یونانی مجسمہ سازوں کے فن کا بڑا خوبصورت اظہار تھے۔ پر جب پہلی منزل کے لئے سرخ مخملیں قالین بچھی کشادہ سیڑھیاں چڑھ کر ابھی وسط میں ہی پہنچی تھی کہ بس یوں لگا جیسے کسی طلسمی دنیا میں داخل ہو رہی ہوں۔ سچی بات ہے یہ تو کوئی پری خانہ تھا، کوئی انوکھی دنیا تھی۔ مجھے تو یہی سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں دائیں دیکھوں یا بائیں دیکھوں، چھت پر نظریں کروں یا نیچے کے حُسن سے خود کو الجھاؤں۔ بھونچکی سی سحر زدہ دیوار کے پاس کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح کھڑی تھی۔

میں آبی رنگے لبادوں میں لپٹی میزان ہاتھ میں تھامے گسے ہوئے دودھیا پستانوں والی انصاف اور عقل و دانش کی دیویوں کے نرغے میں تھی۔ بلند و بالا طلائی نقش و نگار سے سجی کھڑکیوں کی محرابی خلاؤں میں سجے دیوتاؤں کے حصار میں تھی۔ ونٹر پیلس کی تیسری منزل کی بلندی جتنی اُونچی چھت پر یونانی دیوتاؤں تھیسلے (Thessaly) اور میکیڈونیا (Macedonia) کا اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں کے ساتھ جنت کی روح پرور فضاؤں میں اڑانیں اور ان مناظر کے ایک لامحدود تاثر کی عکاسی کرتے احساس کی گرفت میں تھی جو یقیناً اٹھارویں صدی کے مصور کا فن کمال تھا۔

یہ جو کچھ میرے سامنے تھا یہ 1837ء کی آتشزدگی سے بعد کا تھا۔ پہلے اسے حسن و جمال کا پیرہن پہنانے والا ریسٹرلی (B. Rastrelli) تھا اور موجودہ رنگ دینے والا ویسلی (Vasily Stasov) ہے۔ پہلے اس کا نام سفارتی زینہ تھا کہ غیر ملکی شخصیات کا استقبال یہیں ہوتا تھا پر اب یہ جورڈن ہے۔ دھیان میں رکھیئے کہ اس کا اُردن سے کوئی تعلق نہیں۔ جورڈن دراصل نیوا کے پانیوں پر برف کا وسیع قطعہ ہے۔ ہر سال Epiphany Day پر ایک جلوس سیڑھیاں اُتر کر مارچ پاسٹ کرتا ہوا نیوا کے مقام جورڈن تک جاتا ہے۔

میں اب سیڑھیوں کی دوسری سمت جا کر ایک پوڈے پر بیٹھ گئی تھی۔ شاید نہیں یقیناً میں ابھی اُس کے طلائی ملمع کاری سے سجے گرینائٹ کے ستونوں اور فن کی باریکیوں کو ذرا اور تفصیل سے مشاہدہ کرنے کی خواہش مند تھی۔

میں ابھی ایک ایسے پنڈ کے باہر کھڑی تھی جس کے بیرونی حسن و جمال نے ہی مجھے چت کر دیا تھا۔ پنڈ میں تو ابھی داخل ہونا تھا۔ پر اس منظر نامے نے رُوسی شہنشاہوں کے دبدبے و طاقت اور رُوسی سلطنت کی عظمتوں اور امارتوں کی داستان مجھے سُنا دی تھی۔

دائیں بائیں کی سیڑھیاں اوپر جا کر ایک کشادہ سے ٹیرس میں بدلتی تھیں جس کے ایک کونے میں کتابوں کی خوبصورت سی شاپ پر نوجوان لڑکیاں سرگرمی سے گاہکوں کو نپٹانے میں مصروف تھیں۔

آرام دہ بینچ پر بیٹھ کر میں نے کتابوں کی پھولا پھرولی کی۔ سو ڈالر کا نوٹ اُسے دیا اور ساتھ ہی دُعا بھی لبوں پر رکھ لی کہ اب عزت تیرے ہاتھ ہے۔ نوٹ کسی چھوٹے موٹے نشان پر رد نہ ہو۔ چلو شکر کہ عزت رہ گئی۔ چار سو روبل کی کتاب خرید کر اماماً اُن کے حوالے کی کہ اب اس تین کلو کے بوجھ کو اٹھا کر پھرنا کونسا آسان تھا۔

طلائی مینا کاری سے پور پور سجے اُونچے لمبے دروازے سے اندر جانے کی بجائے جانے میں کیوں دوسری سمت کے دروازے سے ایک ایسے ہال میں داخل ہوگئی جو فیلڈ مارشل ہال کہلاتا ہے۔ شاید میں مارشل لاؤں سے زیادہ مانوس تھی۔ رُوس کے ممتاز ترین فاتح فیلڈ مارشل دیواروں پر تمغوں سے سجے پوٹریٹوں میں مقید شجاعتوں کی کہانیاں سناتے تھے۔ دیواری طاقوں میں چھ پوٹریٹ سجے ہوئے ہیں۔ دو کی جگہ خالی ہے۔ موجودہ آرمی کمانڈروں کو احساس دلانے کے لئے کہ اگر انہوں نے کوئی تیر مارا تو پھر ان کی جگہ یہاں ہوگی۔ ماضی کی کولڈ وار میں بے چارے ناکام و ناشاد ہوئے۔ آرائش و زیبائش کے لحاظ سے یہاں سادگی تھی۔ پر ایک زندہ دلچسپ منظر بھی قابلِ توجہ تھا۔

سرخ اور نیلے یونیفارم پہنے، سفید پروں والی ٹوپیاں سروں پر سجائے، سات جوان ایک قطار میں، ایک دوسرے کی پشت سے پشت جوڑے ایک دوسرے کے سامنے مجسموں کی مانند کھڑے تھے، بے حس و حرکت۔ رُک کر انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا بڑا دلچسپ شغل تھا اور پورے دس منٹ تک میں نے اس سے لطف اٹھایا۔

1837ء کی خوفناک آگ بھی اسی جگہ بھڑکی تھی۔ معمار اور مزدور سموک پائپوں کو اینٹوں سے بند کرنا بھول گئے اور آگ یوں بھڑکی کہ اس کے شعلے پچاس میل تک دیکھے گئے۔

کتنا نقصان کتنی تباہی۔ پر کہیں اس کا کوئی اثر؟ روسی زاروں کے خزانے اُچھل اُچھل کر باہر گرتے تھے اور زار بھی اپنی عظمتوں اور سطوتوں کے نشان ثبت کرنے کے لئے مرے جاتے تھے۔ تو پھر مشکل کیا تھی نئی عمارتیں کھڑی کرنے اور انہیں ہار سنگھار پہنانے میں۔ وسیع و عریض گیلریاں اور اُن میں لگی پینٹنگز دامن دل کو کھینچتی تھیں۔ پر میں ان کے سحر سے دل کو بچاتی پیٹر ہال میں داخل ہو گئی۔

پیٹر دی گریٹ۔ پیٹرزبرگ کا خالق۔ اسے رنگ و آہنگ اور تہذیبی پیرہن پہنا کر شہروں کی تاریخ میں ممتاز کرنے والا۔ خود گوناگوں صفات اور تضادات کا مجموعہ۔ مختلف علوم پر مہارت کا وہ عالم کہ خود علوم اس کے سامنے پانی بھریں۔ ایسی نابغہ شخصیت۔

ظاہر ہے دل میں جوش و جذبے کا ہونا تو قدرتی بات تھی۔ پر قدموں میں تیزی بھی تھی اور آنکھوں میں شوق و تجسس کی جوت بھی۔

طلائی نقش و نگاری سے سجے سفید چار کالمی ستون اُوپر جا کر محراب بناتے ہوئے اُس گنبد نما چھت کو بہت نمایاں کرتے تھے جو سونے کی مینا کاری سے سجی ہوئی تھی اور جس کی مشرقی دیوار کے عین وسط میں دو کالموں کے درمیان منقش پوٹریٹ میں بیس (20) بائیس (22) سالہ پیٹر اعظم کھڑا تھا۔ لبوں پر مونچھیں، لال گال چہرہ اور بھرپور جوانی دیکھ کر بخدا مجھے مشہور پاکستانی فلم ہیر رانجھا کا اعجاز دُرّانی یاد آ گیا تھا۔ پیٹر کے ساتھ کھڑی عقل و دانش کی قدیم دیوی مینروا

(Minerva) ہماری جنٹ ٹمپار فردوس جیسی ہی تھی۔ اطالوی آرٹسٹ جیکو پو (Jacopo) نے ہیر کو لاچا پہنا دیا تھا۔

پیٹر کے ہاتھ میں پکڑے چھوٹے ڈنڈے کو میں مُرلی اور میزوا کے ہاتھ میں تھامی بڑی سی روڈ کو ڈانگ سمجھتے ہوئے اور اپنا ایک تہذیبی ناطہ ان کے ساتھ جوڑتے ہوئے خوش ہو سکتی تھی۔ پر فضاؤں میں ٹھمکتا ہوا وہ چھوٹا سا بچہ اپنے ہاتھ میں مرصع تاج پکڑے پیٹر اعظم کے سر کی طرف بڑھتے اطالوی مصور جیکو پو (Jacopo) کے کس خیال کا نمائندہ تھا۔ میں نہیں جانتی تھی۔

ہال کی دیواریں عنابی مائل سُرخ ویلوٹ پر سلور کڑھائی کے پھولوں اور پیٹر اعظم کے دو موبہ عقاب والے مونو گرام سے بجی تھیں۔ منقش کُرسی اور اس کے سامنے دھرا منقش پائیدان کسی کے بیٹھنے اور پاؤں دھرنے کے منتظر تھے۔

جی تو میرا چاہتا تھا۔ میں بیٹھوں اور تصویر بنواؤں۔

''پر ہر خواہش پہ دم نکلے''۔ گنگناتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

الیگزینڈر ہال اپنے در و دیوار کی سادگی، چھت کی محرابی وقوسی ڈیزائن داری کے ساتھ ساتھ فرنچ آرٹ سے سجا ہوا تھا۔ اٹھارویں صدی کا فرنچ آرٹ۔

کیوپڈ ہال میں فالکونٹ (Falconut) کا سفید ماربل کا مُنا سا پروں والا اندھا کیوپڈ اپنی پوری معصومیت سے اُنگلی منہ میں دبائے بیٹھا تھا۔ دیواروں پر شاہکار پینٹنگ کے نمونے تھے۔

ہر تصویر ہی شاہکار تھی پر سیمن چارڈن (Simeon Chardon) کی A washer woman نے مجھے دیر تک روکے رکھا۔ میری آنکھوں کو نم کر دیا۔ میرے بچپن کے وہ مانوس سے منظر سامنے لا کھڑے کیے۔ میں چھوٹی سی چوکی پر دھرے چوبی ڈرم میں کپڑے دھوتی عورت اور پیڑھی نما کُرسی پر بیٹھا اُونی کپڑوں میں ملبوس گل گوتھنا سا لڑکا لمبی سی نلکی منہ سے لگائے صابن ملے پانی سے بڑے بڑے بُلبلے بناتا ہوا دیکھتی تھی۔

اللہ میرے بچپن کا بے حد مانوس بے حد اپنا سا منظر۔ میری ماں غسل خانے کے سامنے

پیڑھی پر مجھے لنڈے کے بے سُرے سے سویٹروں میں لپیٹ کر بٹھا دیتی۔ سلور کے کٹورے میں صابن گھلا پانی اور نلکی ہاتھوں میں پکڑا دیتی۔ میں بُلبلے بناتی رہتی اور وہ کپڑے دھوتی رہتی۔

یہ یادیں بھی کتنی ظالم ہوتی ہیں۔ کہیں ذرا سی مماثلت پر کیسے آنکھوں کو بگھو ڈالتی ہیں۔ میں نے پوروں سے اُنہیں صاف کیا اور تصویر پر پھر نظریں جمائیں۔

دروازے کے باہر تار پر کپڑے پھیلاتی عورت کی پرچھائیں کونے میں دھری چوبی سیڑھی جس کے ڈنڈوں پر دھرے کپڑے تھے اور زمین پر بیٹھی کالی بلی آنکھیں پھاڑے دیکھتی تھی۔

محل کے جنوبی حصے میں اُنیسویں اور بیسویں صدی کے بے شمار شاہکاروں کو دیکھتی ہوئی میں لیون جروم (Leon Gerome) کے The sale of a slave girl کے سامنے ٹھٹھک کر رُک گئی تھی۔

معاشروں کی تہذیبی بے حُرمتی کا ایک منظر میں نے اسے قدیم یونانی اور رومن پس منظر میں نہیں دیکھا۔ میرے سامنے تو قدیم وجدید انسانی رویے تھے۔

''اللہ'' دُکھ اور کرب سے لبالب بھری ہوئی آہ تھی میری۔

دُودھ جیسے رنگ والی سڈول دلکش نوخیز لڑکی الف ننگی داہنا بازو غالباً شرمندگی وخجالت سے آنکھوں پر رکھے کھڑی تھی۔

روم کی غلام مارکیٹ کا ایک منظر۔ سلون ماسٹر لال کناروں والی بسنتی چادر اوڑھے چوبی ٹیرس پر کھڑا بولی لگاتا تھا۔ نیچے مردوں کا ایک ہجوم تھا۔ بوڑھے ادھیڑ عمر اور نوجوان رالیں ٹپکاتے ہوئے آنکھوں کے لینز میں سے سامنے کھڑے وجود کے ایکسرے کرتے اور ہاتھوں کی انگلیوں سے اُس کی قیمت لگاتے ہوئے۔

ذرا دُور فاصلے پر سیاہ چادر میں لپٹی عورت چھوٹے سے بچے کو ہاتھوں میں پکڑے غم واندوہ کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ غالباً ماں تھی۔ قریب ہی ایک اور ننگ دھڑنگ نوعمر لڑکی چہرہ

بازوؤں کے ہالے میں لئے گوڈے پر ٹھوڑی ٹکائے جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ چوبی زینے پر بندھی زنجیر کے عقب میں انسانوں کا ایک اور ہجوم اور لمبے سے ڈیسک پر بیٹھے دو کلرک نما نوجوان بولی کے خاتمے پر سودا طے پانے بڑ کارروائی کرنے کے منتظر۔

اور اس کے بعد چراغوں میں غالباً روشنی نہ رہی تھی۔ میں وان گو (Van Gogh) جیسے عظیم فنکار کو دیکھے بغیر باہر آ گئی تھی۔

آرموریئل (Armorial) ہال، سینٹ جارج ہال، وائٹ ہال اور گولڈ ڈرائنگ روم نے میری آنکھیں پھاڑ دی تھیں۔ یہ اس درجہ فسوں خیز سا ماحول دلوں میں ہلچل تو مچاتا ہے۔ اب جو مزدور طبقہ یہاں کام کرتا تھا۔ ان کے دلوں پر کیا کیا قیامتیں گذرتی ہوں گی۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی سی خواہشوں کے لئے اُن کا سسکنا، تڑپنا اور ردعمل کے طور پر کسی بڑی تخریبی کارروائی میں ملوث ہونا سمجھ آتا ہے۔

میری ٹانگیں چل چل کر شل ہوگئی تھیں پر میری آنکھوں کی پیاس بڑھتی جاتی تھی۔ آرموریئل ہال بھی آتش زدگی کا شکار ہوا تھا۔ پر ویسلے (Vasily) نے اُس کے تعمیری حسن کو ایک نئی اور مختلف جہت دیتے ہوئے اسے وہ اُٹھان دی کہ انسان پلکیں جھپکنا بھول جاتا ہے۔ ایک تو ستونوں کی انفرادیت، اُوپر سے اُن پر سونے کا گوڑھا میک اپ اُس پر طرۂ نقشین پٹرس کی چھت کو چھوتے اُن کے طلائی مینا کاری والے سروں کی کیا بات تھی۔

بیچاری آنکھیں کیا کرتیں۔ مرنے والی ہوگئی تھی۔ ٹشو اور بیگ میں دھری بوتل سے انہیں غسل دے کر تازہ دم کیا۔

اب سائبیریا کی برفانی بیرکوں میں بیڑیاں پہنے وہ بے شمار لوگ کیسے نہ یاد آتے جنہوں نے بھوک غربت اور ناانصافی کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ ہزاروں رزق خاک ہوئے اور ہزاروں کا مقدر بیڑیاں ٹھہریں۔

سینٹ جارج ہال میں بھی سُرخ پوشش سے ڈھنپی سجی مرصع کرسی نے کیسے میرے دل کو

چھا ڈال کر کہا تھا کہ کیا ہے؟ اُوپر چڑھ اور کُرسی پر بیٹھ کر تصویر تو بنوا۔

میں نے سیاحوں کی ایسی بے سُری خواہشوں کو لگام ڈالنے والی حد بندیوں کو دیکھا۔ موٹی تازی نگران کو گھورا اور چپکے سے آگے بڑھنے میں ہی عافیت جانی۔

چرچ میں تو یونہی جا گھسی تھی۔ پر اندر جا کر احساس ہوا کہ اچھا ہی ہوا۔ یہ رُخ بھی دیکھنے کو ملا۔ شاہی خاندان کے آخری تاجدار نکولس دوم کے بیاہ کے سین دیواروں پر سجے تھے۔ وائر پینٹنگ میں شہزادے، شہزادیوں، ملکاؤں، امراء اور نائینس کے کرّ وفر جو تھے سو تھے پر پادریوں کے لبادوں، اُن کے رنگ روپ اور سنہرے پن نے بھی ایک قیامت ڈھا رکھی تھی۔

گولڈ ڈرائنگ روم نے تو وہ طوفان اٹھایا تھا کہ مجھے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھنا پڑا تھا۔ یہ تاج شاہی کے وارث کا رہائشی حصہ تھا۔ الیگزینڈر دوم اور اس کی بیوی ماریا کے لئے جس کا ایک داخلی دروزاہ پیلس سکوائر سے بھی نکالا گیا تھا۔ اس کی دیواروں سے لے کر چھتوں تک سونے کی جو آرائش تھی اُس کا تعلق صرف دیکھنے سے تھا۔ ماریا کے نام کا ''ایم'' اور الیگزنڈر کے نام کا ''اے'' اس کے مونوگرام کے ساتھ کمرے کی دیواروں میں کندہ کیا گیا ہے۔

آبی، عنابی، سنہری رنگوں کی آمیزش سے ایک ماورائی تصور اُبھرتا تھا۔

میں نے تھوڑی دیر کے لئے لمبے لمبے سانس بھرتے ہوئے خود سے کہا تھا تو میرے بچپن کی ہر وہ کہانی جو بادشاہ سلامت اور اس کے محلوں کی شان میں قصیدہ گو تھیں سو فیصد سچ تھیں۔

بھاری بھرکم طلائی دروازے کھلتے اور نیا رنگ طلسمی کیفیت کے ساتھ سامنے آتا۔ آنکھوں کو خیرہ کرتے شینڈ لیرز کی چھتر چھاؤں میں سفید نسوانی مجسمے دیوار میں ٹنگے اپنے گول گول پستانوں کے ساتھ آپ کی جانب اُمنڈتے نظر آتے ہیں۔ شکر تھا کمرے نچلے حصوں نے طلائی پیرہن پہن رکھے تھے۔ اگر وہ بھی نہ پہنے ہوتے تو میں نے یقیناً بیس منٹ اور وہاں لگانے تھے۔

نیم قوسی میزوں کے نیچے سونے کے شیر دھاڑتے تھے اور میزوں پر ہشت پہلو شوکیسوں

میں میلاچی اور سونے کی آمیزش سے خوبصورت گل دان، نسوانی مجسمے اور کینڈل سٹینڈ بہار دکھاتے تھے۔ ملکہ کے پسندیدہ ترین کمرے کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے میں باہر آ گئی تھی۔

میری ٹانگیں درد کر رہی تھیں۔ میرے اندر بھوک کا طوفان تھا۔ اور مجھے باتھ روم جانے کی بھی حاجت تھی۔ اور میں کہاں تھی؟ مجھے کچھ نہیں پتہ تھا۔

میں نے بیٹھ کر نقشے کھولے۔ جائزہ لیا، باتھ روم کہاں تھا؟ علامتی نشان چیک کرنے کے بعد میں نے قریب سے گذرتے ایک نوجوان سے وقت پوچھا۔

اور دو کا سن کر حیران رہ گئی۔

یہاں تو اتنا کچھ تھا کہ اسے دیکھنے کے لئے دن نہیں ہفتے درکار تھے۔

طویل و عریض راہداریاں جورُوسی کلچر کے نمائندوں سے بجی تھیں۔ انہیں تو میں نظر انداز کرتی ہوئی بھاگ بھاگ کر شاہوں کے رہائشی حصوں کو دیکھنے میں گھائل ہوتی رہی۔ اور دیکھے میں نے کتنے تھے؟ چند۔ پر فرش سے چھت کو چھوتے وہ سینکڑوں ڈیزائن دار پتلے قالین جن میں رُوس کی تمدنی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی فنکارانہ بُنت ہوئی تھی۔ انہوں نے زبردستی مجھے گھسیٹ کر داد و تحسین وصول کر لی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے دو گیلریوں کے بعد تیسری میں قدم دھرنے سے اجتناب کیا تھا۔

پر جب میں نیچے کے لئے اُس راستے کی تلاش میں تھی جو نقشے نے مجھے ''میرے قریب کہیں ہے'' کا بتایا۔ چند مناظر پھر قریبی کمروں میں لے گئے۔

یہاں سولہویں سے لے کر اُنیسویں صدی کے برٹش آرٹسٹوں کے فن کمال کی جھلکیاں تھیں۔ جن میں بہت نمایاں تھامس گینز برو (Thomas Gainsborough) اور جوشا رینولڈ (Joshua Reynolds) تھے۔

تھامس کا A Portrait of a lady in blue حقیقتاً پورٹریٹ پینٹنگ کا ایک شاہکار تھا۔ نوجوان خاتون کے گرے بالوں کا ہلکے نیلے مجرز کے ساتھ شاندار سٹائل تھا۔ گہرے

گلے کا لباس، مخروطی انگلیوں کا اس پر دباؤ اور چہرے پر بکھرے شاہانہ اثرات کے ایک ایک خم کی آرٹسٹ کے برش نے بہت خوبصورتی سے عکاسی کی تھی۔

انگلش اکیڈمی آف آرٹس کے صدر Joshua Reynolds کی پینٹنگ میں کلر سکیم کی اثر آفرینی حد درجہ خوبصورت تھی۔ وینس کا شرارت بھرا انداز اس کی مسکراہٹ اور کیوپڈ کا اس کے کمر کے گرد بندھی پٹی کا کھینچنا اور کھولنے کی کوشش کرنا سب دلچسپ تھے۔

یہاں تو فن کا جہاں آباد تھا۔

''کسے دیکھوں اور کسے چھوڑوں۔''

''سب کو چھوڑ دو صرف مجھے دیکھو'' پیٹ نے چلا کر کہا تھا۔ اور میں نے اسی کے کہے پر عمل کیا تھا۔

باب

14

ونٹر پیلس کی نگرانوں سے ذرا سی "تُو تُو میں میں" • میلاچی پیلس

Резкой Разговор С Комадентом Земнои Мелачи Паласа.

خیال نہیں مجھے پختہ یقین تھا کہ طے کردہ جگہ پر مہرالنساء میری جان کا سیاپا کر رہی ہوگی پر جب میں اُس کے قریب گئی وہ چیکنگ کے عملے میں سے ایک منحنی سی لڑکی کے پاس بیٹھی کاپی کھولے لینگوئج کلاس لے رہی تھی۔ میرا فضیحتا کرنے کی بجائے اُس نے اپنا چہرہ اُوپر اٹھایا۔ سرشاری کی پھوار میں بھیگا چہرہ۔ ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا اور اُونچی آواز میں قدرے چلاتے ہوئے بولی۔

"دیکھو میں نے رُوسی حروف تہجی سارے کے سارے نہ صرف سیکھ لئے ہیں بلکہ اُردو میں لکھ بھی لئے ہیں اور یہ کہ اب اُسے بل بورڈز اور نیون سائنز پڑھنے میں ذرا دُشواری نہیں ہوگی۔"

"چلو یہ تو بڑا معرکہ مارا ہے تم نے۔" میں نے مُسکا لگایا۔

نلوونا سے میرا تعارف کرواتے ہوئے مہرالنساء نے بڑے تاسف سے بتایا۔

"تنخواہوں کا تو رُوس میں بھی مسئلہ ہے۔ دیکھو نہ ذرا کتنی اچھی انگریزی بولتی ہے۔ صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک ڈیوٹی اور اُجرت صرف چھ ہزار روبل۔

عام رُوسی لڑکیوں کے برعکس نلوونا حد درجہ دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ سینئر سکولنگ کے بعد اُس نے انگریزی کے بہت سے کورس کر لئے اور گذشتہ سال سے وہ ہرمیٹیج کے اس مرکزی حصے ونٹر پیلس میں مترجم کے طور پر کام کر رہی تھی اور اپنی ملازمت سے شاکی بھی تھی۔

''تمہارا نام بہت خوبصورت اور بہت خاص ہے۔ اس کے پسِ منظر سے کچھ آ گاہی ہے تمہیں؟''

چھوٹا سا خوبصورت سرنفی میں ہلا۔

میکسم گورکی کے ناول ''ماں'' کے مرکزی کردار کا نام ''نلوونا'' ہے۔

وہ ہنس پڑی۔

''میں نے ابھی گورکی کو نہیں پڑھا۔''

کینٹے میریا اور باتھ رُوم دونوں کے بارے میں جو معلومات اُس سے ملیں انہوں نے میری میپ ریڈنگ کی صلاحیت کو ٹھیک ثابت کرتے ہوئے میری کمر ٹھپکی۔

''بلّے بلّے بھئی تیرا تو جواب نہیں۔''

میں فائیو سٹار باتھ رُوموں کے مزاجوں سے تو آشنا ہوں پر چھ اور سات سٹاروں سے قطعی واقف نہیں اور یہ بات سو فیصد یقین سے کہی جا سکتی تھی کہ وہ باتھ روم چلو سات چھوڑو چھ سے تو کسی طور کم نہیں تھے۔

کینٹے میریا پر بڑا رش تھا۔ لمبی سی راہداری تھی۔ ہم نے بھی ڈٹ کر عیاشی کا سوچا۔ رشین سلاد لیا۔ مچھلی کے کٹلس، کلباسا اور سویٹ ڈش کے طور پر چوسنے والی آئس کریم لی۔

چھوٹے چھوٹے نوالوں کے ساتھ مزے لیتے اور تھکن کو اس میں حلول کرتے ہوئے کھایا، چائے پی۔ سچ تو یہ تھا اُس وقت جی لم لیٹ ہونے کو چاہ رہا تھا۔

پر نہیں جناب۔ بیگ سے دوسرا ٹکٹ نکالا۔ دل نہیں چاہتا تھا Treasure Gallery

جانے کو، پر کیا کرتے مجبوری تھی، تین سو کا ٹکٹ لئے بیٹھے تھے۔

لیکن ٹکٹ گیلری میں پہنچ کر ٹکٹ دکھانے کی دیر تھی کہ ظالم شکاری والا سلوک ہوا جو اُڑنے کیلئے پَر تولنے سے پہلے ہی پرندوں کے پروں کو قینچی کے ایک زبردست وار سے اُن کے لیتھڑے اُڑا دیتے ہیں۔

رعونت بھرے لہجے میں جانے کیا کیا بولا جا رہا تھا۔ پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا گیا کہ اس حصے میں غیر ملکیوں کا داخلہ صرف دن کے ساڑھے گیارہ بجے ہوتا ہے۔

ساڑھے گیارہ کا سُن کر تو جیسے میں غصے کے کھولتے کڑاہے میں دھم سے گر پڑی تھی۔

''کسی مترجم کو بلاؤ۔''

میری آواز میں غصہ، تیزی اور تلخی بھی کچھ تھا۔

اور مترجم تو وہی تھی۔ نلوونا۔ جو بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ میں نے دونوں ٹکٹ نکال کر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرائے۔ تیرہ سو روبل کا بتایا۔

''پیلس کے رہائشی حصے میں داخلہ ساڑھے دس۔ بتاؤ مجھے۔ یہ ونٹر پیلس ایک گھنٹے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ چار گھنٹوں میں ہم نے اس کے چند کمروں کو ایک طرح ہاتھ لگا کر چھوا ہی ہے۔ آپ لوگوں کے بھیجے میں عقل نہیں، بولیں، بتائیں ہمیں یہ دو ٹکٹ اکٹھے کیوں دیئے گئے؟''

نلوونا نے سنجیدہ صورت تین خواتین کو جو اپنے اپنے کیبنوں میں اٹن شن کھڑی میری اونچی آواز اور غصیلا چہرہ دیکھتی تھیں بتایا۔

اب ٹیلیفون پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ کبھی ایک پر بات ہوتی، کبھی دوسرے پر، ایک بڑی باوقار سی عورت بھاگ کر سامنے والے حصے میں گئی۔

تھوڑی دیر بعد اُسی طرح بھاگتی واپس آئی۔

''آپ کا گائیڈ؟'' پوچھا گیا۔

''گائیڈ کو ماریں گولی۔ ہمیں گائیڈ کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے نقشوں اور کتابچوں کا ڈھیر اُس کے سامنے لگا دیا۔

''ہم پڑھتے ہیں، گائیڈوں کی اُلٹی سیدھی باتیں نہیں سنتے۔''

ان کی کمزوری مجھے سمجھ آ گئی تھی۔ اسی لئے تڑاخ تڑاخ بول رہی تھی۔

''یہ وقت رُوسیوں کیلئے مخصوص ہے'' بے چاری عاجزی اور مسکینی سے بولی۔

''بھاڑ میں جائیں رُوسی، اس وقت پانچ بجنے والے ہیں اور چھ بجے میوزیم بند ہو جائے گا۔ ایک گھنٹے میں رُوسی زاروں کے یہ سونے اور جواہرات کے ذخیرے کیسے دیکھے جاسکیں گے؟ کوئی جن ہیں ہم لوگ۔''

یقیناً وہ دراز قامت دُبلے پتلے وجود پر مہربان سا چہرہ رُوسی مزاج کے برعکس گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بہت سے صلاح مشورے ہوئے۔ پھر رسیدیں مانگی گئیں۔

میں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔ دنیا بھر کی خرافات سے اَٹے اس پرس میں سے رسیدیں ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ خیر سے میں تو ہوں بھی اول نمبر کی بھلکڑ۔ اب کسی اندھے کی لاٹھی کی طرح ہاتھ اس فضول ڈھیر میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

''کیا پتہ ہاتھوں ہی میں رکھ کر کچھ دیر بعد مروڑیاں سی بنا کر کہیں کسی کونے کھدرے میں پھینک دی ہوں۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

مجھ سے ایسی تمام فضول اور بے تکی چیزوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔

دو ٹکڑے نکال کر دکھاتی ہوں۔ اُن کے چہروں پر نفی کے آثار پا کر سر کو پھر بیگ میں گھسیڑا۔ اب جو ہاتھ آیا وہ بڑھایا۔ خدا کا شکر تھا۔ وگرنہ ایک فی صد امید نہیں تھی۔ چہرہ اُس وقت خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ چھ سو روبل کوئی چھوٹی رقم بھی نہ تھی۔

''چلو کل ہرمیٹیج کے دوسرے حصوں کا بندوبست ہو گیا۔'' میں چہچہائی تھی۔

روبل گن کر مہرالنساء کے حوالے کئے۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ چار سو روبل خرچ کر کے میں

نے جو کتاب خریدی تھی وہ تو جورڈن سیٹرز سے ملحقہ بک شاپ پر ہی ہے۔ ونٹر پیلس کی بھول بھلّیوں میں سے کچھ زیادہ خجل ہوئے بغیر نکل آنا اتنا آسان نہ تھا۔ میری آدھی رات تو مطالعہ میں گذری تھی۔ ونٹر پیلس والوں نے جو گائیڈ بک دی تھی وہ خاصی مددگار ثابت ہوئی۔ اُس پر طرّہ ہماری حد سے زیادہ مستقل مزاجی کہ ہر کمرے کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی نگران خاتون سے پوچھنا اور سمجھنا ضرور ہے۔

''اب کیا ہو'' میرے غَل غپاڑے نے یقیناً مجھے خاصا ہائی لائٹ کر دیا تھا۔ مانیں گی بھلا کبھی۔ میں نے تذبذب سے سوچا۔

''چلو تو کوشش کرنے میں ہرج ہی کیا ہے؟''

نلو ونا نگولائی بڑے ہال کے دروازے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ صورت حال سے اُسے آگاہ کیا۔ اُس نے اندر والیوں کو بتایا اور خلاف توقع گرین سگنل کا اشارہ ہو گیا۔

مہر النساء کو وہیں کوریڈور میں صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ اور خود میں خوشی سے ناچتی گاتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''تو اب اگر میں دوبارہ یہاں داخل ہو گئی ہوں تو پھر میلا چی رُوم دیکھنے ہیں۔''

میں نے خود سے کہا۔

صبح تو چل سو چل کے چکر میں پھنسی رہی۔ ایک کے سحر سے نکلتی تو دوسرے میں پھنس جاتی۔

کتاب کا شاپر پکڑا، نقشے پر نگاہ ڈالی، میلا چی رُومز کے بارے میں شاپ کی شوخ و شنگ انگریزی بولنے والی لڑکیوں سے مزید سمجھا۔

میلا چی پیلس کا سب سے خوبصورت اور قیمتی حصہ ہے۔ ملکہ الیگزینڈرہ فیدورونہ Alexandra Fidorvna نکولس اول کی بیوی کے اپارٹمنٹ میں ڈرائنگ روم کے طور پر 1830ء میں اسے شامل کیا گیا تھا۔

Titian میری میگدلین

فرانسسکو (Francisco) ورجن میری کا بچپن

ریمبراں کا شاہکار فلورا (Flora)

The Lute Player - Merisida

لیونارڈو دونچی : میڈونا اور بچہ

جان سٹین کے شاہکار

میرے قدموں میں غیر معمولی تیزی تھی۔ ماسکو کے تجربات میرے سامنے تھے، وقت سے پہلے ہی ائی آنکھوں چہرے اور ہاتھوں کے جھلار میں خفگی اور ڈانٹ ڈپٹ کی مار دھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔

منظر کوئی ایک تھا. یہاں تو ان کے ڈھیر لگے پڑے تھے۔ نیوا کے پانیوں اُن میں اٹھکیلیاں کرتی کشتیوں اور کنارے کی بلند و بالا عمارتوں کے حُسن کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر اندر آ کر آنکھوں میں گھسے جاتے تھے۔ اور ادھر اُدھر سر کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے اور وقت کی کمی سانسوں کو پھلائے دیتی تھی۔

میلا چی Malachite جیسے قیمتی پتھر کا کس بے دردی سے استعمال ہوا ہے۔

گہرے تاسف کی جھلک تھی میرے لہجے میں۔ لیکن فوراً ہی میں نے خود کو لعن طعن کی۔

''میرے جیسی کم مایہ عورت کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ بے دردی سے استعمال کا کہے۔

بھئی وہ تو شہنشاہ وقت تھے، اَن داتا تھے. لوگوں کی حیات و ممات کے وارث و مالک تھے، انہیں روکنے ٹوکنے والا کون، رعایا کی کھلڑی کے جُوتے بنوا کر پہنیں، انہیں کولہو میں پسوائیں یا انہیں نوازشات سے مالا مال کریں۔''

یہ قیمتی پتھر یورالز Urals کی کانوں سے لایا گیا۔ بڑے ہنر مند لوگ تھے جنہوں نے اپنے دماغ اور توانائیاں صرف کیں اور اس کی کٹائی رگڑائی اور چسپائی سے محل کے کمروں کو جگمگا دیا۔

فن کی باریکیاں تہہ در تہہ نظر آتی تھیں۔ ایک کو سراہتے ہوئے آنکھ ابھی فارغ نہیں ہوتی تھی کہ اس میں سانس لیتے دوسرے عجوبے توجہ کھینچ لیتے تھے۔

جو یہاں رہتی تھی اور جس کے لئے یہ سب بنایا گیا تھا وہ بھی بڑی توپ شے تھی۔ وہ اکیلی کیا یہاں رہنے والیاں سبھی بڑی طرّم خانیاں تھیں۔ ذات ملوک اتنی قصوروار نہیں ہوتی جتنی رہت ملوک۔ اس فسوں خیز ماحول میں سانس لینے والوں کا اُس حقیر بے توقیری مخلوق سے

بھلا کیا ناطہ تھا جو کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین کے سینے پر رینگتی رہتی ہے اور جس کا نام عوام ہے۔

تاریخ کے صفحات پھڑ پھڑائے تھے اور وہ ورقہ میرے سامنے آ گیا تھا جسے پڑھتے ہوئے میں دم بخود ہو گئی تھی۔

یہ 1906ء کا بڑا گرم دن تھا۔ مئی کا پہلا ہفتہ اور پہلی ریاستی ڈوما (ملک کے مختلف حصوں کی نمائندہ لوگوں پر مشتمل پارلیمانی کونسل) کا پہلا اجلاس سٹیٹ ہال میں منعقد ہو رہا تھا۔ سٹیٹ ہال کی چھت کے نیچے ایک عجیب سا منظر تھا۔ سامنے مرصع صوفوں پر مادر زارینہ ماریا فیدورونا اس کی بہو الیگزینڈرہ اور دیگر معزز خواتین، ہال کے دونوں اطراف پر کھڑے ڈیوک اور کورٹ ایلیٹ اپنے سینوں پر شاہی امتیازی تمغے سجائے شاندار ملبوسات پہنے کھڑی تھی۔ کرسیوں پر بیٹھے رُوس کے مختلف حصوں سے آنے والے عوامی لوگ اپنے عجیب وغریب حلیوں اور لباسوں سے ایک ایسا منظر تخلیق کر رہے تھے جو رنگین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اس تناظر میں بے محل سا نظر آتا تھا۔ لمبے لمبے کالے کوٹ پہنے کسان تھے۔ فراک نما کوٹ پہننے والے بوڑھے تھے۔ شانوں پر لہراتے لمبے بالوں والے انٹیلکچوئل تھے جنہوں نے مونوکل لگا رکھے تھے۔ پولینڈ کا پادری گہرے پرپل کپڑوں میں تھا۔ مڈل کلاسیے جن کی ڈھیلی ڈھالی قمیصیں اور کچھ ایسے جو بغیر کالروں کے، چند لوگ Poole کے لباس میں تھے۔ دو صدی قبل کے ڈیزائنوں والے ڈریس پہنے لوگ بھی نظر آتے تھے۔ پولینڈ کے ایک ممبر نے ہلکے نیلے رنگ کا ڈانسرز کا ڈریس زیب تن کر رکھا تھا اور ہیس (جرمنی کا ایک شہر) کے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔

یہ کس قدر خوش آئند بات تھی کہ رُوسی سوسائٹی کے تمام طبقے اپنی اپنی کلاس اور علاقے کی نمائندگی کے لئے موجود تھے۔

پر نہیں حکمران زار کی ماں زارینہ ماریا کے لئے اُن گھٹیا لوگوں کو برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

سونے اور میلاکچی سے آراستہ جب وہ اپنے ان کمروں میں آئی اُس کی طبیعت متلا رہی تھی۔ اُس کے سر میں درد تھا۔

تین دن اس کی طبیعت خراب رہی۔ چوتھے دن اُس نے اپنے وزیر مالیات سے کہا۔

''یہ کیسی ڈوما ہے۔ اتنے گھٹیا لوگ۔ میرے لئے انہیں برداشت کرنا مشکل ہورہا تھا۔''

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے پل بھر کے لئے آنکھیں بند کیں۔ پھر اُنہیں کھولا اور اپنے آپ سے کہا۔

''زارینہ ماریا فیدورونا، تمہارا اور تمہاری سوچوں کا بھی کچھ قصور نہیں۔ اس تناظر میں وہ بھی ٹھیک، پر جب تمہارے اس ونٹر پیلس میں انہی خوبصورت کمروں میں جن پر چڑھا سونا اور آرائش آنکھوں کو چندھیاتی ہے۔ خالتوران نے اسے بم دھماکے سے اُڑانے کو ایک مقدس فرض سمجھا تھا۔ نادرن یُونین آف رشین کا ایک معمولی کارکن جو عام رُوسی کی حالت زار پر کُڑھا کرتا تھا۔ جو جیالا تھا۔ دلیر تھا۔ ایک اعلیٰ بڑھئی کی حیثیت سے ونٹر پیلس میں مرمت کے کام پر معمور ہوا۔ اس درجہ معاشرتی تفاوت کو ہضم ہی نہ کرسکا۔ خود پھانسی پر چڑھ گیا پر تم جیسے شیشے کے گھروں میں رہنے والوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کرگیا۔ اور ہاں زارینہ ماریا فیدورونا اُنہی گھٹیا لوگوں جنہیں دیکھ کر تمہاری طبیعت متلائی تھی نے صرف بارہ سال بعد تمہاری ساری آل اولاد کو تہ تیغ کردیا تھا۔

اس ظلم اس تشدد پر مجھے بھی افسوس ہے پر معاشروں کی اس درجہ اُونچ نیچ ہمیشہ ایسے ہی المیوں کو جنم دیتی ہے اور یہی تاریخ ہے۔

باب

15

پیلس سکوائر • فادر گاپون • 1917 کا پہلا انقلاب
شب کی چند ساعتیں جوزف سٹالن کی صحبت میں

Площад Паласа, Священник Гапон.

Не Сколько Могновения, Джзаф Сталином Мочью

Случайе Изобратис Револусие 1917 Года.

رات کے دو بجے تک ''ہرمیٹیج'' پر پڑھتے پڑھتے جب میں نے تیسری بار نرم گرم رضائی سے نکل کر کھڑکی کے سفید پردوں کو ہٹا کر پیٹرز برگ کے آسمان کو دیکھا تو اُپر ابھی بھی جھٹ پٹے کا سماں تھا۔

پیلس سکوائیر میں شام سات بجے جب ہم الیگزینڈر کالم کے نیچے بیٹھے سردی سے ٹھٹھرتے، آئس کریم کھاتے، پیلس کی خوبصورت چھتوں کے بنیروں اور پیلس سکوائر کے وسیع میدان کے سینے پر بکھری بوڑھی پر مستعد رُوسی خواتین کیطرح نرم گرم دھوپ میں لمبی ٹانگیں پسار کر چہرے اور وجود کو دُھوپ میں نہلاتے اور تھکن کو دھوپ کے وٹامن ڈی سے تازگی اور توانائی دینے کی بھرپور کوشش میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ گپیں ہانکنے، ''ہرمیٹیج'' تھیٹر پر کام کرتے

مزدوروں کو جو صرف شارٹس پہنے ننگے بدن ٹھنڈی ٹھار ہواؤں میں مست کام میں جُتے تھے پر تبصرے کرتے، اردگرد گھومنے پھرنے والوں کے خدوخال اوراُن کے ملبوسات پر رائے زنی جیسے دلچسپ شغل میں مصروف تھے۔ اوراس انتظار میں بھی کہ غروب آفتاب ہو جائے تو اُٹھیں۔ پر سورج کو تو کوئی جیسے جھپا مارے بیٹھا تھا۔

سورج کا ڈوبنا مجھ جیسی سیلانی کیلیے تو ایک نفسیاتی تاثر کا حامل ہے، پرندوں کے اُن غولوں کی طرح جو غروب آفتاب کے ساتھ ہی قطاروں کی صورت اُفق کے سینے پر اپنے ٹھور ٹھکانوں کی جانب پرواز کرتے ہیں۔ پر یہاں سورج کا ڈوبنا اور میرا گھر جانا شاعر کے اُس احساس کا عکاس بن گیا تھا

کہ پھول مسکرائیں کیسے بہار تو ابھی کسی موڑ پر رُکی ہوئی ہے۔ میں بھی گھر کیسے جاؤں کہ رات تو جانے کہاں گم ہے؟

آخر کار مجھے اپنے اُس عارضی گھر جانے کے لئے اُٹھنا پڑا تھا کہ بدن بستر کی خواہش کے لئے بے حال ہو رہا تھا۔ راستے میں گریبوڈووا سٹریٹ (Gribeoyedova street) کی ایک دکان سے قیمے والے پیروشکی خریدے۔ جو دراصل روسی سموسے ہیں۔ سیب اور کیلے بھی لیے۔

ہم نے تو ڈرتے ڈرتے ''چائے مل سکتی ہے۔'' کا پوچھا تھا اور وہاں کوہ قاف کی پری کے لبوں پر راج کرتی سنجیدگی نے کہا تھا۔

''کیوں نہیں۔ کچن میں جا کر بنا لیجیے۔''

لیجیے۔ مزے ہو گئے۔ چائے اور پیروشکی کے ساتھ ڈنر کیا اور جب کچن کی کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکا۔ دھوپ ابھی بھی بلند و بالا عمارتوں کے بنیروں پر دھرنا مارے بیٹھی تھی۔

''اس نے پٹہ لکھوا لیا ہے یہاں رہنے کا۔'' میں خود سے کہتی ہوئی غڑاپ سے بستر پر گری اور پل بھر میں کسی نوزائیدہ بچے کی طرح جو ماں کا پستان منہ میں لیتے ہی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

میری بھی پلکیں آنکھوں پر گر گئی تھیں۔

گیارہ بجے جب آنکھ کھلی۔ مہرالنساء دریچے کے پاس کھڑی کھڑکی سے باہر خلاؤں کو دیکھتی تھی۔ مجھے جاگتے دیکھ کر بولی۔

''اُف آج تو تمہارے خراٹوں نے انتہا کر دی۔ مجھے تو سونا دوبھر ہو رہا تھا۔''

میں نے مزے سے کھلے بالوں کو کیچر میں سمیٹا۔ انگڑائی لی۔ ٹیبل پر دھری کتاب اُٹھائی۔ سرہانے کی لائٹ جلائی اور بولی۔

''چلواب تمہاری باری ہے۔ جی بھر کر خراٹے لینا۔''

یہ سفید راتیں رُوس کی طویل بے کیف اور اُکتا دینے والی سردی کے اختتام پر قدرت کا وہ انعام ہے جسے رُوسی مئی سے جولائی تک بھرپور طریقے سے مناتے اور لُطف اُٹھاتے ہیں۔ سال کا لمباترین دن اکیس جون جب ''سورج کی اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے'' کی جمالیاتی کیفیت کو دیکھنے کے لیے نیوا کے ساحلوں پر سیاحوں کے پُرے شوق دید میں پاگل ہو رہے ہوتے ہیں۔ جب سورج نہیں ڈوبتا اور لوگ نہیں سوتے اور جب پشکن جیسا عظیم شاعر اس وقت کو سنہرے بادلوں کی روشنی کہتا ہے اور اپنی نظم میں ان راتوں کا ذکر محبت بھرے جذباتی انداز میں کرتا ہے۔

''آنا تو تھا ہی۔ میں نے بے اختیار ہی لمبی سانس بھری تھی۔ 30 مئی کی بجائے بیس 20 جون کو آ جاتے۔''

پھر میں نے لائٹ بجھائی۔ کتاب تکیے کے نیچے رکھی اور خود سے کہتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔

''بڑی ناشکری عورت ہو۔ جو ملتا ہے اُس پر قانع ہونے اور شکر ادا کرنے کی بجائے اُلٹا گلے شکووں سے مُنہ اور دل کا ذائقہ خراب کرنے میں جتی رہتی ہو۔''

پر ڈھیر سارا سوچنے کے بعد مجھے محسوس ہوا تھا، جیسے نیند ابھی کہیں بہت دُور نیوا کے پانیوں پر تیرتی دُخانی کشتیوں پر سوار جھولے لیتی نامعلوم جزیروں کی طرف رواں دواں ہے اور

ہر گز ہر گز مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر مائل نہیں۔ تو اب کتاب کی دُنیا میں گھونے کے سوا کیا چارہ کار تھا؟ پس توکل کی خریدی ہوئی کتابیں پاس ڈھیر کرلیں۔ میں پیلس سکوائیر میں تھی۔ گذرے ہوئے وقت میں تھی۔

تاریخ کتنی ظالم تھی۔ خود کو بے نقاب کرنے کے لئے مری جارہی تھی۔ میرے سامنے ظلم میں ڈوبے سیاہ اوراق پھڑ پھڑانے لگے تھے جو خُون میں نہائے ہوئے تھے اور جنہوں نے وقت سے اپنی قیمت وصول کی تھی۔

1917ء جنوری کا بے حد سرد اور بے مہر سا دن۔ وہی دن جس نے درحقیقت انقلاب اکتوبر کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اسمبلی آف رشین ورکرز کا نمائندہ فادر گاپون پیٹرز برگ کی ایک فلاحی شخصیت تھی۔ کارخانوں، فیکٹریوں اور ملوں کے مزدوروں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں وہ بہت بار تحریری درخواستیں حکام کو پیش کر چکا تھا۔ مگر شنوائی نہ ہونے پر اُس نے ایک خاموش احتجاج کی صورت زار نکولس کو عرضداشت پیش کرنے کا پروگرام ترتیب دیا۔ لینن اور پلیخانوف کی پارٹی سوشل ڈیموکریٹک کے دونوں دھڑے بالشویک اور منشویک اس خاموش مظاہرے میں شامل تھے۔

سکوائر خاموش مظاہرین سے پُر تھا۔ احتجاجی امید افزا نظروں سے پیلس کی کھڑکیوں کے شیشوں کو دیکھتے تھے اور بہت پُراُمید تھے کہ اُن کا باپ (زار) اِس بار ہرگز اُن کی درخواست ردّ نہیں کرے گا۔

سہ پہر کے قریب شہر کے مختلف حصوں سے آنے والے لوگوں نے راستوں میں رکھی رکاوٹیں ہٹانے کی کوششیں کی اور گولی چلی۔ پھر پیلس سکوائر پر بھی بوچھاڑ ہوگئی اور میدان لاشوں اور خون میں نہا گیا۔

زار نکولس دوم نے اپنے محل کی بالکونیوں کے شیشوں میں سے پیلس سکوائر کے اس خوفناک منظر کو دیکھتے ہوئے کیا صرف ایک لمحے کے لیے اپنے بارے میں بھی کسی ایسے ہی منظر کا

سوچا ہوگا۔ ہرگز نہیں۔

یقیناً نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے اُس نے کہا ہوگا۔ ''یہ ایسے ہی انجام کے مستحق تھے۔''

ہمارے حکمران ٹولوں کی طرح جو اپنی کرسیوں کی سلامتی کا سودا معصوم بچوں کی لاشوں پر کرتے ہیں۔ ڈالروں کے عوض اپنے لوگوں کو سی آئی اے کے حوالے کرتے ہیں اور امریکہ جیسے بدمعاش کے لئے اپنے معصوم لوگوں پر بموں کی بارش کرواتے ہیں۔

رُوس کے سادہ لوح مزدوروں نے چند گھنٹوں میں ہی وہ سبق پڑھا جو عام معروضی حالات میں انہیں پڑھنے میں سال لگتے۔ کمیونزم کی تنظیموں کے لوگ جنہیں ابھی عام رُوسی عوام کے صدیوں پرانے زار سے متعلق سکول آف تھاٹ رکھنے والے حلقوں میں پذیرائی نہیں مل رہی تھی انہوں نے پیٹرز برگ کی گلیوں میں روتے بلکتے مزدوروں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر انہیں اُس فریم آف تھاٹ سے نکال لیا تھا۔

مارکس کا یہ کہا ہوا سچ ثابت ہوا تھا کہ کبھی کبھار انقلاب کو آگے بڑھانے کے لئے ردّ انقلاب کے چابک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور حکمرانوں کی حماقتوں اور کم از کم اُس رات 4600 لوگوں کی موت نے یہ چابک فراہم کر دی تھی۔

یہ زاروں کا زمانہ تھا۔

تھیلے میں سے دوسری کتاب نکالی "Stalin's Russia"۔ میں کمیونسٹوں کے دور میں تھی۔ 1928ء کے ایک گاؤں کا گھر جہاں نو دس سال کی بچی اور ایک باریش مرد بجلی کا بلب پہلی بار جلاتے ہوئے جس مسرت سے ہم کنار ہو رہے تھے وہ اُن کی آنکھوں سے ہویدا تھی۔

مجھے 1954ء یاد آیا تھا۔ صدر بازار لاہور کے اُس گھر کا وہ کمرہ یاد آیا تھا جہاں پہلی بار ہمارے کمرے میں بلب جلنے پر میری آنکھوں میں وہی تحیر اور خوشی تھی جو میں تصویر میں دیکھتی تھی۔

ورق پلٹے تھے۔ سٹالن کی ایک تقریر تھی اور کیا خوب تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔

رُوس کی پرانی تاریخ بہت شکستہ پا ہے۔ یہ بیچاری کبھی منگول خانوں، کبھی ترکوں، سویڈش فیوڈلسٹوں، پولش لتھوئین جنٹری، فرانسیسی سرمایہ داروں اور جاپانی نوابوں سے مار کھاتی رہی۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ کمزور اور پس ماندہ تھی۔ ہم ترقی یافتہ ممالک سے سو سال پیچھے ہیں اور ہمیں یہ فاصلہ صرف دس سال میں طے کرنا ہے۔ صرف دس سال میں۔

''کیا بات ہے؟'' میں خود سے کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ اگلے دو ورق اُلٹ دیئے تھے۔ کلکوز (Kolkhoz) (اجتماعی فارمنگ)۔ کارل مارکس انقلاب برپا ہونے کے بعد زمین پر قبضے کا کہتا ہے۔ لینن نے ایسا چاہا پر رُک گیا۔ ملک جنگ عظیم اول سے نڈھال تھا۔ 1918ء سے 1922ء تک سول وار میں اُلجھا رہا۔ امن و امان کی بحالی جیسا بڑا چیلنج سامنے تھا، اُوپر سے موت نے آن لیا۔

پر سٹالن تو جیسے اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ پہلی فرصت میں توے چڑھا دیئے۔

اگلے چند صفحات اجتماعی فارمنگ پر دلچسپ رپوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔

سال 1929ء تھا۔ ایک رُوسی امریکہ سے سالوں بعد کرکوف (Kharkov) شہر کے قریب واقع اپنے گاؤں یکم (Yekim) میں آیا۔ بیچارے نے ابھی بوٹ بھی نہیں اُتارے تھے کہ گاؤں کا گاؤں اُمنڈ اپڑا۔ غریب کلکوز کے بارے میں بات کرنے کے لیے جیسے بھرے بیٹھے تھے۔

گاؤں کا لوہار لگیان بولا۔

''ہم پہلے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے اور انسان تھے۔ اب ہم کولاک (بہت امیر کسان)، سریدنکی (Seredniaks) (درمیانہ زمیندار)، بیدنکی (Bedniaks) (تھوڑی سی زمین والا) اور بتراک (Batraks) (اُن کے پاس زمین نہیں ہوتی) بن گئے ہیں۔ کلاس وار میں اُلجھا دیا ہے ہمیں۔''

لگیان پل بھر کے لیے رُکا۔ جب گروم باچا وسکی نے بولنا شروع کر دیا۔

''چلو اسے بھی چھوڑو۔ اب یہ کہا جانا کہ اپنی زمین، اپنا ڈھور ڈنگر، اپنے اوزار، اپنے ڈیرے، سب اُنہیں دے دو۔ اکٹھے کام کرو۔ ہر چیز ایک دوسرے کے ساتھ تقسیم کرو۔ ارے ایک اپنا خاندان بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی بات پر اُلجھ پڑتا ہے۔ لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور یہاں ہمیں دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک فیملی کے طور پر کام کرنے اور مل بانٹنے کو کہا جارہا ہے۔''

بورس نے لقمہ دیا۔

''ہم کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوں پھر بھی ہمارے پاس اپنے آلو ہیں، اپنا دودھ ہے، پنیر ہے، اپنے کھیرے ہیں اور ہم اتنا جانتے ہیں کہ ہم بھوکے نہیں مریں گے۔''

نسکو (Nisko) سے صبر نہیں ہوا۔ چلانا شروع ہوگیا۔

''یہ کلکوز والے چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس کچھ نہ رہے ہم اُن کے محتاج ہو جائیں۔ پرانے زمانے کے سرف (کسان غلام) بن جائیں۔ بھلا سرف بننا کون چاہے گا؟''

لینا کسی سے کیوں پیچھے رہتی۔

''اب دیکھو ایک عورت کے دس بچے ہیں۔ ایک کے پانچ اور ایک کا ایک۔ دس بچوں والی کو دس کے حساب سے دودھ ملے گا۔ پانچ والی کو پانچ کے اور ایک والی کو ایک کے مطابق۔ کام تینوں نے ایک جیسا کرنا ہے۔ بتاؤ یہ کیسا انصاف ہے؟''

اسی دوران کلکوز کا نمائندہ بھی آ گیا اور اس بحث مباحثے میں شامل ہوگیا۔

''مجھے بتاؤ سالوں سے تم زمین کے اِن چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو لئے بیٹھے ہو جو تم میں اور تمہارے بچوں میں تقسیم ہو ہو کر گھٹتی چلی جارہی ہے۔ کاشت کاری کے جدید آلات تم لوگ استعمال نہیں کر سکتے کہ بٹے اور منڈیروں سے تیری میری حد بندیاں کررکھی ہیں۔ نئے رجحان، نئے انداز اپنانے سے تم خوف زدہ ہو۔

تمہارے بچوں کے لئے سکول بنایا۔ اب ہم کہتے ہیں کہ فائر اسٹیشن اور بہترین پُل بننے چاہئیں۔ کیا ہم غلط کہتے ہیں؟ ہم تمہیں فرٹیلائزر استعمال کرنے کا کہتے ہیں۔ کیا ہم غلط ہیں؟

دیکھو یہ وقت اپنی ذات کے لیے سوچنے کا نہیں۔"

لوگوں کے ہجوم نے چلا کر کہا تھا۔

"یہی طریقہ رہ گیا ہے اصلاحات کا؟ سکول، پُل، فائر اسٹیشن بنانا حکومت کا کام ہے۔"

اور کلکوز کے منتظم نے بھی جواباً چلا کر کہا تھا۔

"ہمیں بھی طریقے آتے ہیں تم سے نپٹنے کے۔ ہم تو تمہیں زمین کے چہرے سے یوں پونچھ ڈالیں گے جیسے ماتھے سے پسینہ پونچھا جاتا ہے۔"

میں نے کتاب اپنے سینے پر رکھ لی تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

اگلے صفحات پر سٹالن کی صنعتی پالیسی سے متعلق پانچ سالہ منصوبوں کی تفصیلات تھیں۔ پندرہ سال کا ٹارگٹ تھا۔ رُوس کی عورت قابل رشک تھی۔ ہر جگہ مستعد اور چوکس۔ ڈانگری پہنے تھریشر کی ٹرالی پر چڑھی ڈنڈے سے غالباً پرالی کی دُھنائی کر رہی تھی۔

اگلے صفحات نے مجھے دُکھی کر دیا تھا۔ The Great Purge
(تطہیری عمل۔ معاشرے کو پاک کرنے کا نام دے لیجیے)۔

1936ء سے 1939ء تک کا زمانہ سیاست دانوں، جرنیلوں، کرنیلوں، موسیقاروں، لکھاریوں، کسانوں، ڈاکٹروں اور صنعتی کارکنوں، جرنلسٹوں، سبھوں کو کولہو کے بیل میں پیس دینے کا زمانہ تھا۔ خوف و دہشت کی فضا پروان چڑھا دی گئی تھی۔

ٹراٹسکی کی موت والی تصویر نے آنکھیں گیلی کر دیں۔ میکسیکو میں اُس کی خواب گاہ میں برف توڑنے والا لمبا سوءا ہسپانوی نوجوان رمن مرکیڈر نے اُس کی کھوپڑی میں گھسیڑ دیا گیا اور عجیب سی بات کہ اُس کا لہواُن کاغذات پر گرا جو وہ اُس وقت لکھ رہا تھا اور یہ سٹالن پر اُس کی کتاب کا ایک باب تھا۔

کتاب میں بنے کارٹونوں نے بہت ہنسایا تھا۔

Visit the USSR's Pyramids.

سٹالن انسانی کھوپڑیوں کے اہراموں کے پاس کھڑا تھا۔اُن کی کھوپڑیاں جو معاشرے کی صفائی ستھرائی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

لیبر کیمپوں کی تفصیلات رونگٹے کھڑے کرنے والی تھیں۔ چند ایک کو پڑھ کر میں آگے بڑھ رہی تھی۔ جب رُکی۔ کولی ما Kolyma کے قیدیوں کی ایک نظم نے میرے دُکھی دل کو چھولیا تھا۔کولی ماقطب شمالی کے قریب دنیا کی سرد ترین جگہ ہے جہاں لیبر کیمپ کے قیدی گایا کرتے۔

Kolyma, Wonderful Planet

Twelve Months Winter, The Rest Summer

کتاب میں دو سوال اُٹھائے گئے تھے۔

پہلا آخر اس اتنے وسیع پیمانے پر تطہیری عمل کیوں ہوا۔

مشہور تاریخ دان رونلڈ ہنگلے کے مطابق تین چوتھائی ملین لوگوں کا قتل اور سات سے چودہ ملین لوگوں کو لیبر کیمپوں میں سزائیں۔کیا وہ ایک جنونی سیاست کا مارا ہوا عفریت تھا۔

نجارن (پولٹ بیورو کا ممبر) ٹراٹسکی ،خروشیف اور سوتلانہ (Svetlana) (سٹالن کی بیٹی) کے اقتباسات کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

نجارن اُس سیاست اور جنونیت کے ساتھ ساتھ اُس کا خود کو عظیم تر سمجھنے کو اُس کا غیر صحت مندرویہ قرار دیتا تھا۔کوئی اُس سے برتر ہے۔سٹالن پہلا اور سب سے بہترین نہیں۔ یہ ناقابل برداشت تھا۔تنگ نظر اور کینہ پرور۔انسان نہیں ایک شیطان۔

ٹراٹسکی کی تحریر نے اُس کی اذیت پسند شخصیت کو بہت نمایاں کیا تھا۔

آذربائیجان کے کیپٹل سٹی ''باکو'' کی جیل میں سٹالن کا سیل پڑوسی ایک دفعہ انقلاب سے متعلق کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں خون کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔'' سٹالن نے یکدم خلاف توقع اُس سے پوچھا تھا۔

ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ جب ایک جھٹکے سے سٹالن نے اپنے جوتے میں چھپا چاقو باہر نکالا۔ اپنی پتلون کو اُوپر کرتے ہوئے ٹانگ ننگی کی اور چشم زدن میں ایک گہرا زخم اُس پر لگا دیا۔ فوارے کی طرح خون کو دیکھتے ہوئے اپنے سیل ساتھی سے بولا۔

''لو دیکھو تمہیں اس کی ہڑک اُٹھ رہی تھی۔ دیکھ لو۔ خون دیکھ لو۔''

سوویت کی ایک معزز ترین شخصیت بن جانے پر بھی وہ اپنے گاؤں کے گھر میں بھیڑوں کے گلے کاٹا کرتا اور چیونٹیوں کے بلوں اور ڈھیروں پر کیروسین آئل ڈال کر آگ لگایا کرتا۔

یہاں دو تحریریں تھیں اُس کی بیٹی سوتلانہ کے خطوط جو اُس نے اپنی دوست کو لکھے۔ یہ کتابی صورت میں اُس وقت چھپے جب وہ رُوس سے چلی گئی۔ سادہ سی اس تحریر میں کچھ خاص پہلو آشکارہ ہوتے تھے۔

''لوگ جانتے ہیں کہ میں ایک اچھی بیٹی نہیں تھی اور میرا باپ بھی کوئی اچھا نہ تھا۔ لیکن وہ جیسا بھی تھا مجھے پیار کرتا تھا اُسی طرح جیسے میں اُس سے کرتی تھی۔ اس گھر میں جہاں ہم رہتے تھے۔ کوئی اُسے ایک دیوتا یا سُپر مین، ایک غیر معمولی فطین یا شیطان یا کوئی بدرُوح نہیں سمجھتا۔

وہ سب اُسے پیار کرتے تھے، اُس کی عزت کرتے تھے۔ اُس کی اُن عام انسانی خوبیوں کی بنا پر جنہیں ملازموں سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اپنی اگلی کتاب ''Only One Year'' میں وہ لکھتی ہے۔

اُس کی ڈکٹیٹر شپ کو خون ریزی کا نام دیا گیا اور یہ صحیح بھی ہے۔ وہ جانتا تھا وہ کیا کر رہا ہے؟ وہ پاگل نہیں تھا۔ دیوانہ بھی نہیں تھا اور کوئی اُسے گمراہ بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اپنی طاقت کو مضبوط رکھتا اور اس ڈر میں رہتا تھا کہ یہ اُس سے چھن نہ جائے۔ دُنیا میں اُسے سب سے زیادہ ڈر اور خوف اسی بات کا رہا۔ ہمیشہ اُس کی پہلی ترجیح اپنے دشمنوں اور حاسدوں سے نجات کی ہوتی۔

سٹالن کا اپنی بیٹی کے نام خط بہت دلچسپ اور اُس کی شخصیت کی کچھ مزید پرتیں کھولتا تھا۔

کہیں 1930ء اور 1932ء کے درمیان کا وقت تھا۔

''تم نے اپنے لٹل پاپا کو کتنے دنوں سے کچھ لکھا ہی نہیں۔ شاید تم نے اُسے بھلا دیا ہے۔ تم کیسی ہو؟ بیمار تو نہیں؟ تمہاری گڑیاں کیسی ہیں؟ میرا تو خیال تھا کہ مجھے تمہاری طرف سے جلد ہی فرمائش وصول ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ کتنی بری بات ہے۔ تم اپنے لٹل پاپا کو تکلیف پہنچا رہی ہونا۔ چلو خیر کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں کِس کرتا ہوا اور اُمید کرتا ہوں کہ جلد مجھے لکھو گی۔

''تمہارا لٹل پاپا۔''

تاہم سٹالن کے ساتھی اور جانشین خروشیف کی یہ تحریر بہت کچھ کہتی اور بتاتی تھی۔

''کم آن سوتلانہ، ایک راؤنڈ اور۔ تم میزبان ہو۔ ڈانس کرو۔''

سوتلانہ جو اُس وقت بال روم میں قدرے دور کرسی پر بیٹھی تھی، بولی۔

''پاپا میں تھک گئی ہوں۔ میں نے بہت ڈانس کیا ہے۔ اب میرا دل نہیں چاہتا۔'' بات تو بس اتنی سی تھی۔ سٹالن تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔ بڑی بے رحمی سے اُس کے ماتھے پر جھولتے بالوں کو اپنے مٹھی میں پکڑا اور کھینچا۔ خروشیف لکھتا ہے۔

''میں اس کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو منڈلا رہے تھے اور وہ اسی طرح کھینچتا اور گھسیٹتا اُسے ڈانسنگ فلور پر لے آیا۔ وہ اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتا تھا مگر اس طرح کے گجر وا اور گاؤدی رویے اُس کی شخصیت کا ایک حصہ تھے۔

سوتلانہ کی یہ تحریر بڑی معنی خیز تھی۔

''موت کی اذیت بڑی کربناک تھی۔ جیسا کہ ہم اُس کے پاس کھڑے دیکھتے تھے۔ اُس کا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ ایسے ہی لمحوں میں اُس نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں اور کمرے میں موجود ہر ایک پر ڈالیں۔ یہ کیسی نظریں تھیں؟ اُف میں بھول نہیں سکتی اور میں تو اُن کا تجزیہ بھی نہیں کر پاتی۔ اُن میں دہشت تھی۔ پاگل پن کے عکس تھے۔ ناراضگی تھی اور موت کا خوف بھی تھا۔ ابھی ہم لوگ اس نظر کے خوفناک طلسم سے نکلے بھی نہیں تھے کہ ایک خوفناک بات

اور ہوئی۔ اُس نے اچانک اپنا بایاں ہاتھ اُوپر اُٹھایا جیسے کہ وہ اُوپر کسی کو کچھ اشارہ دیتا ہوا اور پھر وہ اُسے نیچے لایا اس انداز میں جیسے ہم سبھوں پر لعنت بھیج رہا ہو۔ اُس کے جسم نے ناقابلِ فہم اور خطرے سے بھرپور کسی عجیب سے احساس کی غمازی کی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کس لئے اور کس بات کا اشارہ ہے؟ میں آج تک نہ اُس منظر کو بھول سکی ہوں اور نہ سمجھ سکی ہوں۔ اگلے لمحے اُس کی رُوح اُس کے جسم سے نکل گئی تھی۔''

کس قدر سنسنی خیز تحریر تھی۔ شاید وہ طبعی موت نہیں مرا تھا اُسے قتل کیا گیا۔ اُس کے موت کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے۔ میں نے خود سے پوچھا تھا۔

''تو کیا یہ کسی ایسی سمت کی طرف نشان دہی تو نہ تھی؟''

اب میں کٹہرے میں کھڑی تھی۔ مجھے اپنا فیصلہ سنانا تھا۔ کیونکہ کتاب کے اختتام پر کتاب کے مصنفین مارٹن ڈکنسن اور جان جونز نے پڑھنے والے سے کہا تھا کہ وہ بھی اپنی رائے کا اظہار کریں۔

میں تاریخ کی طالبہ رہی ہوں اور ہوں۔ اقتدار کا خون سفید، بے رحم اور رشتوں سے بلند ہوتا ہے۔ اگر کہیں کوئی تعلق چلتا ہے تو صرف وفاداری کا۔ میری اگر آنکھیں بھیگی تھی تو عام لوگوں پر۔

بہرحال میں نے اُس کا ہر خون معاف کر دیا تھا۔ ایک بھوکے، غربت میں دھنسے، پس ماندہ، نیم خواندہ، صنعتی وزراعتی میدانوں میں کمتر، جنگوں میں برباد، شازشوں اور بغاوتوں میں اُلجھے، وسیع وعریض ملک کو اُٹھا کر پچیس سالوں میں دُنیا کی دوسری بڑی طاقت بنا دینا معجزہ نہیں تھا اور یہ معجزہ اُس نے سرانجام دیا تھا۔

اب بھلا مجھے اپنا ملک اور وہ تینوں جرنیل کیوں نہ یاد آتے؟ تیس اکتیس سال کی مطلق العنان بادشاہت، خون ریزیوں کے بھی ڈھیر اور ملک پاتال میں۔

باب

16

نیو ہرمیٹیج • پال رابنز (Rubens) • ریمبر اں (Rambrandt)
رافیل (Raphael) • لیونارڈو ونچی (Leonardodavinci) کے ساتھ چند گھنٹے

Новы Эрмитаж, Хап РаБин, Рамбрандт,
Рафел Лионанда Винситом Вистреча.

میرے وجود میں نیو ہرمیٹج کیلئے ونٹر پیلس سے زیادہ جوش وجذبہ تھا۔ رات یہی زیر مطالعہ رہا تھا۔ کیتھرائن دی گریٹ نے ونٹر پیلس میں رہائش کا آغاز کرنے کے بعد سمال، اولڈ، نیو ہرمیٹج اور ہرمیٹج تھیٹر کی شاندار اضافی عمارتیں بنا کر اور انہیں آرٹ کے شاہکاروں سے سجا کر پیٹرز برگ کی قامت اور شان میں کچھ نئے چاند تارے ٹانک دیئے۔ دنیا بھر کے آرٹ کے زندہ شاہکار یہاں سینکڑوں نہیں ہزاروں میں موجود ہیں۔ سنگ تراشی، اپلائیڈ آرٹ کی چیزیں، تعمیراتی حُسن اور اُس کے نمونے سکوں، میڈلز اور زیورات کی گیلریاں۔

نوسکی پراسپکٹ پر چلتے ہوئے میں قدرے اضطراب کا بھی شکار تھی۔ کہ ایک ہزار ستاون ہالوں اور کمروں پر مشتمل جسمیں تین ملین آرٹ کا کام بکھرا ہوا ہے۔ پندرہ ہزار پینٹنگ، بارہ ہزار مجسموں، چھ لاکھ پکچر گرافک شیٹز (Sheets)، چھ لاکھ آثار قدیمہ کی نایاب اشیاء، اپلائیڈ آرٹ کی دو لاکھ چوبیس ہزار چیزیں، ایک لاکھ ملین سکوں اور میڈلز کے ان خزانوں کے سامنے

اگر ایک ایک منٹ رُکوں تو سب چیزیں دیکھنے کیلئے مجھے پانچ سال چاہیں۔

''ہائے وے میریا ربا۔ میں کدر کدر جاواں گی۔ تے پھردی پھردی مر جاواں گی۔''

سچی بات ہے وہاں مرنے والی بات ہی تھی۔فن کی بلندیوں کو دیکھتے اور گھومتے ہوئے۔

چل میرے مولا تیری خیر ہووے۔ میں تو بس فرنچ، فلیمش، ڈچ اور اٹالین آرٹ ہی دیکھوں گی۔ننھا منا سا میرا بھیجا انہی کا بوجھ اُٹھا لے تو تیری عنایت ہوگی۔

تین سو پچاس روبل فی کس کا ٹکٹ خریدا۔

پورٹیکو میں ہی لیون (Leovon) کے شاہکار انسانی مجسمے سنگی چبوتروں پر یوں کھڑے تھے کہ جیسے انہوں نے چھت نہیں اساطیر کے اطلس دیوتا کی طرح آسمان تھاما ہوا ہو۔

مرکزی گزرگاہ سے زینے کے راستے قدیم پینٹنگ کی گیلری کی طرف جاتے ہوئے کالموں کی قطاریں، خوبصورت سیاہ ریلنگ، موزائق کی ٹاپ والے میزوں، چھت کی انفرادیت اور سفید ماربل کی سیڑھیوں کو نظریں دادو تحسین دیتے دیتے بار بار رُک کر اُن رنگین پتھر کے عجیب وغریب ساخت کے گلدانوں پر پڑتی ہیں جو بنانے والے کی فنکاری پر عش عش کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اینڈری (Andrei) نے کانسی کے مجسموں کو متحرک ہونے کے بڑے انوکھے اور نرالے سے انداز دیئے۔اُن کے سروں پر رکھے گلدان کی اطراف سے نکلے سنہرے بالوں والے انسانی چہرے اور اُن چہروں پر بکھرے تاثرات بھی فی الواقع کمال کے تھے۔

راستہ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے سنگ تراشی کے لاجواب مجسموں سے سجا ہوا تھا۔ قدیم پینٹنگ سے سجی گیلری کی دیواروں کا رنگ، اُس پر کی گئی خوبصورت نقاشی، اپنی کلر سکیم پینٹنگز اور مجسموں کے ساتھ کیا خوب تھیں۔ یہاں یونانیوں کے دیوتا ایروز (Eros) کی محبوبہ اپنے تتلی نما پروں کے ساتھ کیوپڈ پر جھکی ہوئی تھی۔

آ واخر اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے آغاز کی سنگ تراشی کا یہ سارا کمال ڈنمارک کے مشہور مجسمہ ساز برٹل (Bertel) اور اطالوی انتونیو (Antonio) کا ہے۔

فلیمش آرٹ (Flemish Art) کو دیکھنے کے لیے میں بہت بے تاب تھی۔ نیو ہرمیٹیج کے بہت سے ہال آرٹ کے ان خزینوں کے لیے وقف تھے۔ کمروں کی اندرونی زیبائش کو رنگین پتھروں سے رُوسی کاریگروں نے حُسن وخوبصورتی بخشی تھی۔ یہاں جذبات واحساسات کا ایک بہاؤ تھا۔ یہاں زندگی کے تلخ وشریں رنگ تھے۔ یہاں کہانیاں تھیں۔ جنہیں مصوروں کے قلم نے زبانیں دی تھیں۔ میں پائیٹر پال رابنس (Pieter Paul Rubens) کے شاہکار کے سامنے کھڑی تھی۔ پال رابنس فلیمش پینٹنگ سکول کا ہیڈ تھا۔ اُس کی پینٹنگ کا مرکزی فوکس عہد رفتہ کی کلاسیکل میتھالوجی تھا۔

Roman Charity کے نام سے اس پینٹنگ کا نقطہ خیال رومن لٹریچر سے لیا گیا۔ جیل کی کوٹھری میں آہنی زنجیروں سے بندھا، بھوک سے سزائے موت پانے والے بوڑھے سیمسن کو اس کی نوجوان بیٹی پیرو (Pero) اپنا دودھ پلاتی ہے۔ سیمسن کی ایک ایک ہڈی، چہرے اور آنکھ میں زندگی کی بجھتی ہوئی جوت، بیٹی کی ایک بانہہ کے کلاوے میں سمٹا ہوا باپ، دوسرا ہاتھ پستان کی نپل کو باپ کے منہ میں ٹھونستا ہوا، دُکھ سے سُتا ہوا خوبصورت چہرہ، لباس بالوں کا انداز اور اس کا حُسن آرٹسٹ نے گویا صدیوں پرانے وقت اور کرداروں کو زندہ کر کے انہیں لافانی بنا دیا تھا۔

The Union of Earth and water رابنز کا ایک ایسا شاہکار تھا۔ جسے میں نے دیر تک کھڑے ہوکر دیکھا اور سمجھا۔ یہ ایک اور علامتی استعارہ تھی۔ نیپچون (Neptune) سمندروں یعنی پانی کا دیوتا اور Cybele زمین کی دیوی۔ زندگی کی طاقتور توانائی کا ان عناصر کی یکجائی سے وجود میں آنا. پینٹنگ کا لب لباب یہی خیال تھا جسے جذبات واحساسات کے رنگوں سے نمایاں کیا گیا۔

واہ کیا بات تھی نیپچون اور سیبلی کی۔ مرمری بدن والی ننگی سیبلی کس والہانہ انداز میں گٹھے ہوئے بدن والے باریش نیپچون کو دیکھتی تھی دونوں کا ایک دوسرے کی طرف جھکاؤ اور انہماک

بڑا خطرناک تھا۔ چوڑے مُنہ کے گھڑے سے پانی کی موٹی دھار نیچے گرتی تھی جس میں سنہری بالوں والے معصوم بچے نہاتے تھے۔ تخلیق کی جذباتی عکاسی کا ایک خوبصورت نمونہ۔

The Descent from the cross میں رابنز کی فنکاری اپنے بام پر پہنچی ہوئی تھی۔ کرائسٹ کے خوبصورت چہرے پر موت کے باوجود جس عظمت اور شانتی کی گھمبیرتا تھی اس کا تعلق صرف دیکھنے سے تھا۔

موالیوں کے چہروں پر رنج و غم کے بادلوں، آنکھوں سے چھلکتے غم کے سایوں، خوبصورت رخساروں پر منجمد آنسوؤں کی لڑیوں کی کیفیت سب میں کمال فن کا عروج تھا۔

تصویروں میں اتنی زندگی تھی کہ آنکھ کی پیاس نہیں بجھتی تھی۔ اور دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ ہرمیٹیج میں آویزاں پینٹنگ کا یہ شاہکار ہوبہو اس کی نقل تھی جو Antwerp کیتھڈرل میں آج بھی موجود ہے۔

کہاں کہاں رُکتی؟ کیسے کیسے دیکھتی؟ بس بھاگنے والی بات تھی۔ سٹل لائف کے عظیم خالق Frons پر ایک نظر ڈالتی آگے بڑھ گئی تھی۔

کمروں کا پھیلاؤ اندر ہی اندر بڑھتا چلا جاتا تھا۔ ہر کمرہ نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ سامنے آکر حیرتوں کے نئے در وا کر رہا تھا۔ اور اب میں گیلری میں دھرے صوفے پر بیٹھی صرف یہ سوچ رہی تھی کہ مجھے ڈچ آرٹ میں صرف ریمبراں (Rembrandt) کو دیکھ کر آگے بڑھ جانا ہے۔ اصل میں سارا لیونارڈو ونچی اور پکاسو کا تھا۔

آرٹ سے اتنی سُوجھ بوجھ نہ رکھنے کے باوجود ان شہ پاروں کو دیکھ دیکھ کر میرا جو حشر ہوا اور دل و دماغ جس جس انداز میں گھائل ہوا اُس سے تو میں بخوبی واقف تھی۔ پر مجبوری تو وقت تھا۔ طاقت اور توانائی تھی۔

باوجودیکہ میں نے کمروں میں بیٹھی ایک نہیں دو نگران خواتین سے ریمبراں (Rembrandt) کے ہال کا پوچھا تھا اور چاہا تھا کہ اِدھر اُدھر کی بجائے سیدھی ٹارگٹ پر پہنچ جاؤں، پر کرتی کیا۔

پاؤں گلابوں سے بھرے ایک ایسے قطعے کی دلدل میں پڑا کہ وہ اندر دھنستا چلا گیا۔

یہ ٹینٹ روفڈ ہال (Tent Roofed Hall) تھا۔ ہال کی چھت خیمے کی طرز پر تھی۔ درمیان سے اُبھری اور اطراف سے ڈھلان، مستطیل خانوں میں بٹی ہوئی جن کے اندر کی زیبائش بھی قابل دید تھی۔ میلاچی کے گلدانوں اور رُوسی طرز تعمیر کی خوبصورتیوں سے مزّین اِس ہال میں آویزاں بورڈوں پر سترہویں صدی کے سمال ڈچ ماسٹرز اپنے چھوٹے سکیل کی پینٹنگز کے ساتھ کتنی کہانیاں سُنا رہے تھے۔

کچھ تصویروں نے بہت متاثر کیا۔ بوڑھی عورت کتاب کھولے پڑھتی ہوئی۔ کتاب یقیناً بائبل ہوگی کہ خاتون نے سر کو موٹے کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کا لباس، ناک کی پھُنگی پر دھری عینک، اُس کے چہرے پر پھیلی جھریاں اور پڑھنے کا انہماک۔

پر حد درجہ محظوظ کرنے والی پینٹنگ جان سٹین (Jan Steen) کی تھی۔ یہ ایک غریبانہ سے گھر کا منظر تھا۔ دروازے پر آدھا لٹکتا پردہ پڑچھتی پر دھری چند چیزیں، طاق میں سجا گلدان۔ برتن بھانڈے دیوار سے جڑی چھوٹی الماری پر ہنڈیا دھری تھی۔

شوہر آرٹسٹ ہے اور یہ آرٹسٹ جان سٹین خود ہے۔ جس کی حسین اور نوعمر بیوی میز پر بازو رکھے سو رہی ہے، ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرا جوتا فرش پر پڑا تھا۔ لمبے بالوں والا فربہی بدن آرٹسٹ ہاتھ میں برش پکڑے کس اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ زندگی سے بھرپور چھوٹی سی تصویر۔

ڈچ سمال ماسٹرز کی یہ تصویریں روزمرہ زندگی، زمینی حقیقتوں، مادی چیزوں، انسان کی خوشی وغم کے جذبات اور انسانی کرداروں کے مختلف طور طریقوں کی بڑی خوبصورت عکاس تھیں۔ سچ تو یہ ہے انہیں دیکھ کر میں نے لطف اُٹھایا، اور ڈچ آرٹسٹوں کو خراج تحسین پیش کیا۔

مصوری کے یورپی امام ریمبراں (Rembrandt) کے کام کو جس حُسن وخوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ چھت اور چوبی فرش کتنے خوبصورت تھے۔

چھوڑیئے اُنہیں۔ سبز دیواروں کا بھی ذکر نہ کریں۔ پر آٹھ فٹ لمبے اور آٹھ فٹ ہی چوڑے لکڑی کے سنہری فریموں کے سبز پس منظر میں اُس کے شاہکار جیسے اندھیرے آسمان پر ستاروں کی طرح جھلملاتے تھے۔

سترھویں صدی کے اس عظیم فنکار کا کام مختلف ادوار میں مختلف اصناف کا نمائندہ ہے۔

تین دور زیادہ اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہ رنگوں کے نمایاں فرق سے واضح ہوتے ہیں۔

میں انتہائی میٹھے اور دیدہ زیب رنگوں اور پھولوں کو سر پر سجائے اور ہاتھ میں سبز بیلوں سے بجی چھڑی کو پکڑے جس نوجوان لڑکی کو دیکھتی تھی وہ فلورا (Flora) تھی، مصور کا ایک ماسٹر پیس، انتہائی قیمتی اور شاہانہ لباس جسکی بُنت کی ایک ایک بوٹی، ایک ایک چنٹ، نمایاں تھی۔ موہ لینے والا چہرہ، یہ یونانیوں کی بہار کی دیوی تھی، مصور کی تصوراتی پیشکش، یہ پینٹنگ اُس وقت بنائی گئی تھی جب ریمبراں (Rembrandt) نے سسکیا (Saskia) سے شادی کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دیوی کی شباہت میں تھوڑا سا دخل سسکیا کے چہرے اور لباس کا بھی ہے۔

اُس کی تصویر کا اصرار تھا کہ ٹھہرو اور مجھے دیکھو۔ آرٹ کے ان خزینوں کیلئے ڈھیروں ڈھیروں وقت درکار تھا۔

اُس وقت بھوک کی ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ پہلے تو میں نے پیٹ کو بے بھاؤ کی سنائیں۔

''ہمیشہ تجھے ہابڑا (کھانے کی بے چینی) پڑا رہتا ہے۔ موقع محل بھی نہیں دیکھتا۔ اپنا راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے۔ ریمبراں کو دیکھنے کی توفیق مجھے کبھی نصیب ہوئی تھی؟ بول۔ بتا۔ اب اگر قدرت نے یہ عنایت کر دی ہے۔ تو تو اپنا منہ بند کر۔ مر نہیں جائے گا۔''

دوسری زبردست لتاڑ ٹانگوں کو دی۔

''بندے کی پتر بنو اور یاد رکھو کہ میں نے ریمبراں کو تفصیل سے دیکھنا ہے اور لیونارڈو دو نچی کو بھی۔''

The Return of prodigal son نے جیسے مجھے کہا تھا کہ

''دیکھو دیکھو ریمبر اں کے آخری ایام کا یہ شاہکار دیکھو۔''

میں آبنوسی حاشیے والے بلند و بالا فریم کے سامنے رُک گئی تھی۔ پینٹنگ کا نقطۂ خیال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مستند موالی کے حوالہ سے ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو جوانی میں اپنے ترکے کی سب چیزیں کسی دُور دراز ملک میں گنوا کر مصائب اور بھوک کے ہاتھوں تنگ آ کر باپ کے پاس لوٹتا ہے۔ باپ اور بیٹے کے ملاپ کا منظر۔

کینوس پر بکھرے اس شاہکار کے مرکزی کردار نیم تاریکی اور سنہری روشنی میں نہار ہے تھے۔ پدرانہ شفقت، حلم و بردباری اور عفو و درگزری کے جذبات لرزتی داڑھی والے بوڑھے آدمی کے چہرے پر سجے تھے۔ گھٹنوں کے بل جھکا، باپ کی چھاتی سے لگا آوارہ گرد بیٹے کے شانوں پر دھرے ہاتھوں میں جذبات کی کپکپاہٹ تھی۔ ایسی ہی کپکپاہٹ جیسی ہمیں اپنی نافرمان اولادوں کے معافی مانگنے پر ہوتی ہے۔ پاس کھڑے افراد خانہ کے چہروں پر اندھیرے اور ہلکی سی روشنی کے امتزاج میں باپ بیٹے کے ملاپ کی کیفیات کو محسوس کرنے کے تاثرات کا عکس موجزن تھا۔

بڑی دلآویز جذباتی اور حقیقت کی عکاس تھی۔ یہ اُس کے انتہائے کمال کے زمانے کی وہ تصویر جب اُس نے دُھندلے سرخ خاکی اور زرد رنگ اپنی تصویروں کو پہنائے۔

پر شہرہ آفاق ''Danae'' نے مجھے پھر کھینچ لیا تھا۔ ریمبر اں کا ایک اور لازوال شاہکار۔

یہ قدیم یونانی اساطیری کہانی کے اُس لمحے کی تصویر کشی ہے جب Danae شاہ کی بیٹی پر عاشق دیوتا فضاؤں سے اُس کے کمرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ جادوئی سنہری روشنی اور انتہائی قیمتی شاہانہ بستر پر دراز ڈینا۔ خادم کا پردے ہٹا کر چور آنکھوں سے اندر جھانکنا اور سیلاب کے پانیوں کا کمرے میں موجیں مارتے پھرتا۔ ریمبر اں کے اولین دور کا خوبصورت نمونہ جب اُس کی تصویروں پر سبزی مائل خاکی رنگ غالب ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی موضوع کو اٹلی کے Titian

نے بھی پینٹ کیا تھا۔ روشنی میں نہاتے سر سے لے کر پاؤں تک ننگے نسوانی وجود کو میں نے اسی طرح دیکھا تھا جسے ڈاکٹر کسی ایکسرے کا معائنہ کرتا ہے۔

نسوانی جسم اور اس کے ایک ایک خدوخال کی تفصیل میں ریمبراں کا فن نقطہ عروج پر ہے۔ اُس کا کمال فن Lesson of Anatomy میں بھی چھلکتا تھا۔ نسوانی جسم کی شبیہہ بنانے میں شاید ہی کوئی دوسرا مصور اس پائے تک پہنچ سکا ہو جہاں یہ فنکار پہنچا ہوا تھا۔ کیسا بدقسمت تھا۔ سونے کے ہاتھوں والا، امیر والدین کا بیٹا، مفلسی و ناداری کی گھمن گھیریوں میں ہی پھنسا رہا اور ایسے ہی مر گیا۔

"Danae" کو 1985ء میں کسی تخریبی کاروائی کے نتیجے میں نقصان پہنچا۔ ہرمیٹیج کے ماہر عملے نے ہائیڈ وکلورک ایسڈ کی مدد سے بارہ سال کی طویل مدت تک اس پر کام کر کے اسے اُس کی اصلی صورت لوٹائی۔

اللہ ایک پینٹنگ کیلئے بارہ سال کی محنت۔ ایک ہم لوگ ہیں، بے حس اور بے شعور، ذہنی طور پر ایک ناپختہ قوم، تاریخ اور اُس کے اثاثوں کی اہمیت سے ناواقف۔ لاہور اور ٹیکسلا کے عجائب گھروں سے کتنا کچھ چوری ہوا؟ اور کہاں کہاں پہنچا؟

اب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے مزید قدم اُٹھائے تو لحہ بھر میں منہ کے بل دھڑام سے گروں گی۔ آرام دہ بینچ پر بیٹھی تو جی چاہا لم لیٹ ہو جاؤں۔ آنکھیں بند کر لوں۔ سو جاؤں۔ ہائے پور پور میں تھکاوٹ کی دُکھن تھی۔ بوٹ اُتار کر میں نے ذرا سا ٹانگوں کو اُوپر کیا کیا کہ لگا جیسے کوئی تنک چڑھی مغرور ظالم مالکن اپنی مظلوم سی خادمہ کے لتے لے رہی ہو۔

اُدھیڑ عمر موٹی تازی رُوسی نگران اُونچے اُونچے میری ٹانگوں کی طرف اشارے کرتے ہوئے جانے کیا کیا صلواتوں سے میری تواضع کر رہی تھی۔

میں نے فوراً ٹانگیں تو نیچے کر لیں پر اس کے ساتھ ہی ایک جھٹکے سے جسم کو اٹھاتے ہوئے بینچ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ فرش اتنا تو صاف تھا۔

وہ ابھی بھی بکواس کیے چلی جا رہی تھی۔ میں نے ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا۔ سرکشی سے سر کو نفی میں ہلایا کہ مجھے اب نہیں اٹھنا۔ کر لو جو کرنا ہے۔

بکتی جھکتی دُور جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے ٹانگوں کو بینچ کے نیچے گھسیڑا۔ آرام سے سیب کھایا، کیلے کھائے۔ بازوؤں کے ہالے میں بینچ کو لے کر اور سر اُس پر ٹکا کر چند لمحوں کا آرام بھی کیا۔

چلو تھوڑا سا تو دال دلیا ہوا۔

جی تو میرا چاہتا تھا یا تو میں یہیں ٹانگیں پسار کر سو جاؤں۔ پر نگران پوری چنڈال تھی۔ دوسرے پھر اُٹھوں، جوتا پہنوں، ٹیکسی پکڑوں اور ہوٹل جا کر بستر پر لم لیٹ ہو جاؤں۔

پر میں نے بے بسی سے سر نفی میں ہلایا تھا۔

اُف کتنی مجبوری تھی عین اُس طالب علم کی طرح جس کے امتحان سر پر ہوں اور وہ رت جگوں پر مجبور ہو۔

میں دوبارہ کب یہاں آؤں گی؟ ممکن ہی نہیں، آج تیسرا دن ہے اور میں ابھی تک ہرمیٹیج کے چنگل سے ہی نہیں نکل سکی اور یہاں حال یہ ہے کہ اینٹ اٹھاؤ تو ایک تاریخی محل بمعہ لمبی چوڑی تفصیلات کے برآمد ہوتا ہے۔

پاؤں کی مٹھی چاپی کی اور کمر ہمت باندھی۔

لارج سکائی لائٹ ہال کی سجاوٹ کی بیان بازی کیا کروں۔ لوٹس کے پھولوں کی شکل کے کینڈل سٹینڈ۔ چھوٹی بڑی میزیں۔ سونے سے مرصع جا بجا دھرے میلاچی کے چھوٹے بڑے گلدان اور دیواریں اطالوی مصوروں کی پینٹنگز سے بھری ہوئیں۔

اگلے کیبنوں کے کمرے ایک دوسرے میں کھُلتے ہوئے سولہویں اور سترہویں صدی کے اطالوی آرٹسٹوں کی نمائش کر رہے تھے۔

میں چل نہیں ایک طرح بھاگ رہی تھی، صدیوں پر چھلانگیں مارتی ہوئی، پر چھوٹے

سکائی لائٹ ہال میں رُکنا پڑا تھا۔

مصر کی قلوپطرہ ہو، اُس کی زندگی کا اہم باب ہو اور اُسے تفصیلی دیکھے بغیر گزر جاؤں کہیں ممکن تھا۔ سترھویں صدی کے مصر کی مشہور زمانہ ملکہ قلوپطرہ جب شہنشاہ آکتاوئین (Octavian) کی قیدی بنتی ہے۔ The Death of Cleopatra کا سین سامنے ہے۔ قلوپطرہ کے حکم پر سانپ اُسے ڈسنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ شاہی چھپر کھٹ پر نیم ایستادہ ننگا وجود، سیاہ ناگ، مخروطی انگلیوں سے سرکتا ہوا کولہے پر دھرے بازو سے لپٹتا اوپر جاتا اور پستان کے عین نپل پر اپنا منہ رکھے کاٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ خوبصورت چہرے پر آنکھیں موت کے زیر اثر بند سی تھیں۔

''اُف میرے خدایا۔'' میرے قدم ساکت ہو گئے تھے۔ سانس سینے میں کہیں ٹھہر گئی تھی۔ Massimo Stanzione نے کمال کی منظر کشی کی تھی۔ خوفناک، پُر اثر، جذباتی اور المناک انجام کے تصور سے لبالب بھری ہوئی۔

بس اب میں صرف لیونارڈو دونچی کو دیکھنے کی شدید خواہشمند تھی۔

راستے میں Raphael لاجز میں اُس کے کام کی جس انداز میں نمائش تھی وہ لاجواب تھا۔ لاجز اطالوی مینا کاری اور نقاشی سے بھری پڑی تھیں۔ جہاں Raphael کا کام جگمگا رہا تھا۔

ہرمیٹیج لاجز کیتھرائن دی گریٹ کے حکم پر روم کے ویٹی کن پیلس کی لاجز کی طرز پر بنائی گئیں جس میں یورپ کے احیائے علوم کے دور کی ہو بہو عکاسی ہوئی۔

مجھ پر تھکن شدت سے حملہ آور تھی۔ لیکن لیونارڈو کو دیکھنے کے لئے مجھے کتنا بھی چلنا پڑتا، میں نے چلنا تھا۔

لیونارڈو کی شخصیت کی جتنی جہتیں تھیں، جیسا وہ ہرفن مولا انسان تھا۔ اُس کا کمرہ بھی اپنی خوبصورتی اور آرائش، زیبائش کے اعتبار سے منفرد تھا۔ یہاں لیونارڈو کے کام کی دو پینٹنگز

موجود تھیں۔ The Madonna and Child براؤن چوبی سٹینڈ پر آویزاں اپنے خیال، لباس اور بالوں کے سٹائل سے لیونارڈو کے وقت کی فیشن اور رواج کی کہانی سناتی ہے۔ نوجوان ''میری'' کے چہرے پر ممتا کی مسرت رقصاں ہے۔ چار پتیوں والا پھول کراس کا سمبل ہے جو مستقبل کے تختہ دار کی نشان دہی ہے۔ بچے کا پھول کی طرف گہرا انہماک اور ہاتھ سے اُسے پکڑنے کی مسلسل کوشش دراصل لیونارڈو جیسے عالم اور فنکار کے دنیا کو جاننے کے احساس کی ترجمانی ہے۔ رنگوں کا امتزاج اور اعظاء کی مناسبت سبھی میں کمال کا توازن تھا۔

The Litta Madonna 1865ء میں کاؤنٹ ''لیتا'' سے ہرمیٹیج کے لئے حاصل کی گئی۔ یہ لیونارڈو کے اُس وقت کا شاہکار ہے جب وہ میلان میں ڈیوک مورو کے دربار میں ملازم تھا۔

میں گم سم تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میں پینٹنگ میں سے نکلتے ہوئے کسی سرمدی نغمے کو سُن رہی ہوں۔ دودھ پیتے جیسز پر ماں کی جمی نگاہیں اور ہونٹوں کے زاویوں پر خفیف سی مسکراہٹ کا ارتعاش میڈونا کے کلاسیکل نقوش کو وہ رعنائی دیتا ہے کہ جسے بیان کرنا مشکل ہے۔ مصور نے میڈونا کے سُرخ لباس اور نیلے کلاک میں روایتی مذہبی رمزیت کا استعمال کیا ہے۔

کمرے کے باہر نکلتے ہوئے میں نے اُس جینئس نابغہ روزگار کی عظمت کو سلام کیا جس نے سنگ تراشی کی۔ موسیقی، تعمیراتی فن، انشا پردازی، سائنسی تحقیق اور ایروناٹیکل انجینئرنگ میں ہوائی جہاز تک بنانے کی کوشش کی۔ مولا یہ انسان تھے؟ اتنے ڈھیروں ڈھیر ہنروں والے۔

باب
17

انستاسیا اور شاہد کا گھر • رُوسیوں اور پاکستانیوں کی قدرِ مشترک
بیس جون کی ''وائٹ نائٹ'' کا انتظار و اہتمام

Дом Интация И Шахида.
Мера Между Русски И Пакистански Народом.
Ажедания И Атметка Бели Ночи.

اپنی ڈائری کے وہ ورق میں نے آج پھر پلٹے تھے جس پر انتونینا نے ایک نام انستاسیا (Anastasya) لکھتے ہوئے کہا تھا۔ میری چچی کی گہری دوست ہیں۔ بڑی ملنسار اور مہمان نواز خاتون ہیں۔ اُن کا شوہر بھی پاکستانی ہے۔ ضرور ملیں۔ اگر کوئی مشکل پیش آئے تو بلا تکلف چلی جائیں۔ اُردو مجھ سے زیادہ اچھی بولتی ہیں۔ موبائل، گھر کا فون نمبر، آفس کا سب اُس پر درج تھے۔ ایڈریس بھی موجود تھا۔ آنے کے فوراً بعد میں نے رابطے کی کوشش کی کہ چلو ذرا تھوڑی سی معلومات ہی حاصل ہو جائیں لیکن رابطہ نہ ہوا۔ بعد میں ہم اپنے سیر سپاٹوں میں اُلجھ گئے۔

ایڈریس میں نے پڑھا۔ E-9. Chernyshevskaya

ریسپشن پر جا کر کاپی کاؤنٹر پر رکھ دی۔ میں نے خیال ہی نہیں کیا تھا۔ پورا ایڈریس انگریزی کے ساتھ ساتھ رُوسی میں بھی لکھا ہوا تھا۔ کترینا نے نقشے پر تھوڑی سی مغز پچی کے بعد

ایک جگہ اُنگلی رکھ دی۔

میں نے دیکھا تو پتہ چلا کہ کہیں اللہ میاں کے پچھواڑے خلیج فن لینڈ کے پانیوں کے ہمسائے میں ہے۔ کترینا نے فون ملایا۔ ہماری خوش قسمتی، جواب ملا۔ کترینا نے مختصری بات کے بعد ریسور میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔

بڑی خوبصورت انگریزی تھی۔ اُردو گو گلابی سی تھی پر اس میں روانی تھی۔ پھر ایک مردانہ آواز نے ہیلو ہائے کرنے کے بعد بے تکلفی سے اپنا تعارف کروایا۔ لاہور کا شاہد خان۔

''کل شام ہمارے ساتھ۔''

اتنی پُر خلوص دعوت۔ پک کرنے کی پیشکش۔

''ارے نہیں پہنچ جائیں گے۔ نہیں تو فون کر دیں گے۔ اب خجل خواری میں جانے کس جگہ ہوں۔ کہاں ڈھونڈتے پھریں گے بیچارے۔ اتنا محبت بھرا اظہار۔ لیجئے موجیں ہو گئیں۔ سارا پیٹرز برگ گویا اپنایت کی خوشبو سے بھر گیا تھا۔

اگلی شام ہرمیٹیج سے فارغ ہو کر نیوا کے ساحلوں پر ٹھنڈی ٹھار ہواؤں اور دھوپ کی میٹھی سی تمازت کے سنگم سے جی بھر کر لطف اُٹھایا۔ آرام کیا۔ آئس کریم کھائی۔ پھر سوچا۔ اب چلتے ہیں۔ نقشے کو ایک بار پھر کھولا۔ ماربل پیلس کے ساتھ ہی چوک سے سیدھی سڑک چرنایا تک جاتی تھی۔

چوک میں پہنچے۔ دائیں بائیں دیکھا تو احساس ہوا کہ یہ منظر بڑے مانوس سے ہیں۔ دفعتاً یاد آیا کہ بھئی یہ وہی جگہ ہے جہاں پہلے ہی دن آ پہنچے تھے۔ سمر گارڈنز اور پیٹرز اول کے سمر پیلس والی۔

سکوائر سے بس میں سوار ہو گئے۔ کترینا نے مار کر سے موٹے سے کاغذ پر چرنایا رُوسی میں لکھ دیا تھا۔ وہ کاغذ پرس سے نکال کر خاتون ڈرائیور کو اُسی انداز میں دکھایا جیسے ہمارے ہاں نوسر باز جھوٹی بیماریوں کے اشتہار بنا کر آپ کے منہ کے آگے خیرات کی طلب میں کرتے ہیں۔

یہاں خیرات کی تو نہیں البتہ التفات کی خواہش ضرور تھی۔

سڑک کی کشادگی، اطراف کا حُسن، دکانوں کی رنگا رنگی، بلاکوں میں بنے گھروں کی خوبصورتی، گاڑی کی سُبک خرامی، درختوں کی ہریالی اور اُن کی کثرت، لوگوں کا کاروبارِ حیات میں اُلجھاؤ اور کہیں کہیں نرالی وضع قطع کا کوئی ٹانواں ٹانواں دانہ۔

اس سڑک پر ٹی وی کی شاندار عمارت تھی۔ بلند ترین ٹاور کی شان و شوکت کا بھی دیکھنے سے تعلق تھا۔ ینوا کے پانیوں کی ہمسائیگی میں وسیع و عریض پارک کا طراوت بخشتا سبزہ ماحول کے حسن کو اور بڑھاتا تھا۔

بس نے پُل پار کیا۔ ایک جگہ رُکی۔ ڈرائیور نے ہمیں اُترنے کا اشارہ کیا۔ اُتر گئے۔ اب گھر پہنچنے کا مرحلہ تھا۔

پاس سے گذرتے نوجوان کو بازو سے تھام کر روک لیا اور کاپی کا صفحہ اُس کے سامنے کر دیا۔ بتانے یا گائیڈ کرنے کی بجائے اُس نے جیب سے اپنا موبائل نکالا اور نمبر دبا دیئے۔ جونہی لڑکے نے بات کی۔ ہمارے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک منٹ بعد لڑکے نے موبائل میرے کان سے لگا دیا۔ یقیناً شاہد تھا جس نے ہمیں وہیں کھڑے ہونے کی تاکید کی کہ وہ بس دو منٹ میں پہنچ رہا ہے۔

محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ میری آنکھوں میں لڑکے کے لئے جو شفقت اُبھری، اُسے محسوس کرتے ہوئے وہ مسکرایا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

لمبی سی نئی نویلی گاڑی نے فوراً متاثر کر ڈالا تھا۔

بھئی یہ تو بڑے امیر کبیر لگتے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد بیالیس (42) پینتالیس (45) کے گھیرے میں ہوگا۔ بڑا خوش مزاج اور ہنس مکھ سا۔ پاس آ کر یوں بات کی جیسے پرانا شناسا ہو۔ گھر قریب ہی تھا۔

چوتھی منزل پر گھر کا دروازہ کھلنے کی دیر تھی کہ ایک ہی نظر مکینوں کی خوشحالی اُن کے رکھ

رکھاؤ اور طریقے سلیقے کی گواہ بن گئی تھی۔ کوریڈور یوں سجا ہوا تھا جیسے یہ گھر کا اضافی حصہ نہیں بلکہ کوئی اہم کمرہ ہو۔

شاہد بائیس (22) سال کی عمر میں رُوس آیا تھا۔ اور اب وہ اِس معاشرے میں رچا بیٹھا تھا۔ گھر کی سوانی بڑی دلکش عورت تھی۔ بالٹک سمندر کے ساحلی علاقے کی ملاحت دلکشی اور حُسن کا مکمل نمونہ۔

ذرا بھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ کسی اجنبی گھر میں آئے ہیں۔

شاہد پیٹرز برگ کی کسی بڑی کیمیکل کمپنی میں چیف کیمیکل انجینئر تھا۔ بیوی کیمیکل انجینئر تھی۔

دو بیڈ روم کا گھر جس کا کونا کونا آرائشی اشیاء سے سجا جیسے لشکارے مارتا تھا۔ چھوٹا سا ڈرائنگ روم جس میں دھرے صوفے میں دھنسا شاہد سگریٹ پیتے ہوئے سوویت دور کی تعلیمی سہولتوں کے بارے میں بات کرتا تھا۔ آنے کے ساتھ ہی اس موضوع کے چھڑ جانے کی وجہ شاہد کی ساڑھے چھ سالہ بیٹی تھی جو کمرے میں اپنے کھلونوں کے ساتھ چُہلیں کرتی پھرتی تھی۔ اُس کا چھوٹے چھوٹے انگریزی کے جُملوں کا سمجھنا اور جواب دینا میرے لئے باعث تعجب تھا۔ شاہد نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ پیٹرز برگ کے بہترین سکول P.Tit Cref Pre School میں پڑھتی ہے۔ یہاں تین زبانیں رُوسی انگریزی اور فرنچ سکھائی جاتی ہیں۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''یہ تو ہمارے بچوں جیسا معاملہ ہی ہے۔ بچے نے اُردو سیکھنی ہے، انگریزی سیکھنی ہے اور اُسے عربی بھی پڑھنی ہے۔''

اور فیس پر بات کرتے ہوئے شاہد نے موجودہ نظام کا سوویت سے مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''بھئی ہم نے تو سچی بات ہے اُس دور میں بہت عیش کئے۔ تعلیم فری، رہائش فری، کھانا مفت سو روبل کا وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اور اب اِس چھٹانک بھر لڑکی کا خرچہ ہی نہیں مان۔''

کس قدر مزے کا مشروب تھا۔ گلاس بھی بڑے سٹائلش تھے۔

''لوگوں کا مجموعی ردِّ عمل کیسا ہے؟''

''خیر اب تو ایک سوشلسٹ سٹیٹ کی مراعات سے ہر کوئی ہی محروم ہو گیا ہے۔ پر وہ جنہوں نے لوٹ مار کر کے کچھ بنا لیا۔ وہ مزے میں۔ جنہوں نے انقلاب میں مار دھاڑ کی تھی وہ بھی ٹھیک۔ درمیان میں جو سیدھی سادھی کلاس تھی وہ رگڑی گئی۔ تب بھی اور اب بھی۔ وہ بیچارے تو ابھی تک اپنی قابل رحم حالت کا تجزیہ ہی نہیں کر پا رہے ہیں۔

رُوسیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ زندگی کی مشکلات اور مصائب سہنے کے لئے جیتے ہیں۔ اور یہ بہت حد تک ٹھیک ہے۔''

''ایک عام رُوسی کی سوچ کیا ہے؟''

انستاسیا ہنسی تھی۔

دراصل رُوسی بڑی اذیت پسند محنت کش اور سمارٹ قوم ہے۔ ہر مشکل، ہر تکلیف اور ہر پیچیدہ مسئلے میں سے انہوں نے لازماً ایک راستہ نکال لینا ہے۔ چوری بھی کر لینی ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ اگر بزنس ہے تو دوہرے تہرے کھاتے بھی بنا لینے ہیں۔ ٹیکس کی چوری معمولی بات ہے۔ کام سے غائب ہونا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ سوویت کے زمانوں میں تو ایک کہاوت بڑی مشہور تھی۔

"Everything around belongs to the public (nation).

So everything belongs to me."

میں تو سچی بات ہے جیسے کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ کیوں نہ ہنستی۔ تھوڑی سی تسکین ملی تھی کہ چلو ہم ہی اتنے خراب نہیں ہیں۔ انستاسیا مزید گوہر افشانیاں کرتی تھی۔

''بیچاروں کی تو نسل در نسل زندگیاں غیر یقینی حالات کا سامنا کرتے گزر گئیں۔ ایک ایسی سوسائٹی جس میں کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ 17 اگست 1998ء میں جب روبل ڈرامائی طور پر گر گیا اور حکومت نے اپنے ڈی فالٹ ہونے کا اعلان کر دیا۔

کوئی مغربی ملک ہوتا تو لوگ حکومت کا تیا پانچہ کرنے کو دوڑتے۔ پر رُوس میں روبل کو ڈالر سے تبدیل کرنے کی ڈوریں لگیں۔

ارے تو ڈالر کا یہاں بھی بڑا ہوکا ہے۔"

پھر ایک خوبصورت سا اونچا لمبا لڑکا آیا۔ شاہد کا بڑا بیٹا۔ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والا۔ جس کا رُوسی نام میکسم شاہد تھا۔

لڑکے کا ہائی سکول ابھی ختم ہوا تھا۔ اور وہ اپنے سکول کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر آنے والی بیس جون کی نائٹ کہ جو سفید راتوں کی انتہائے عروج ہے کو شاندار طریق سے منانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

بیس (20) جون کی یہ شب جس کا پیٹرز برگ میں بے حد انتظار۔ جس کے منانے کا حد درجہ اہتمام کہ اُس رات نہ لوگ سوتے ہیں نہ شہر سوتا ہے نہ سُورج سوتا ہے اور نہ فضا۔ جاگتے اور اُودھم مچاتے شہر کے فارغ التحصیل سکول گریجوایٹ بچوں کی یہ وہ یادگار نائٹ ہے کہ جس میں وہ اپنی سکول زندگی کو الوداع کہتے ہوئے بلوغت کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔

سرخ اور گہرے سرخ بادبان لہراتی لانچوں میں وہ اُس رات بہت دُور نیوا کے پانیوں پر سفر کرتے اور نوجوان دوشیزہ کی اُس کہانی کو سنتے ہیں۔ اُس حسین دوشیزہ کی کہانی جو ساحلوں پر بیٹھی اپنے محبوب کے سرخ بادبانوں والے جہاز کا انتظار کرتی ہے جس نے پانیوں کا سینہ چیرتے ہوئے اُس تک آنا ہے۔

اُن کے بیڈ روم بہت آراستہ پیراستہ تھے۔ دیواروں میں لگائے ہوئے سٹیل کے خوبصورت شیلف دونوں میاں بیوی کے ہاتھوں کی ہنرمندی کا راز کھولتے تھے۔ پھولوں کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی خوبصورتی سے سجی ہوئی تھیں۔ رُوسی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ رسائل بھی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ پرانے اخبار بھی زمینی ریک پر طریقے سلیقے سے پڑے تھے۔

شادی کی تصویر دیوار پر آویزاں تھی اور خوبصورت جوڑا ایک دوسرے کی بانہوں میں

مسکراتا تھا۔ انستاسیا کا سفید لباس مغربی ویڈنگ ڈریس سے خاصا مختلف تھا۔ ہماری خواہش پر کہ وہ ہمیں البم دکھائیں اور کچھ شادی کی رسومات کے بارے میں بتائیں۔

شاہد خان ہنستے ہوئے بولا۔

''لیجئے آپ تو ایک تیر سے دو شکار چاہتی ہیں۔ آج ہی سب کچھ جان جانے کی خواہشمند ہیں۔ جناب ایک بار پھر آیئے۔ احوال ہماری ملاقات اور محبت و پیار کا۔ تفصیل ہماری شادی کی، دیدار ہماری مووی البم کا اور کھانا ہمارے ساتھ چاہتوں بھرا۔''

''یہ تم شاعری بھی کرتے ہو؟''

''ارے کہاں، آپ لوگ آئے ہیں تو اچھا لگا ہے۔ آج کا کھانا میں نے پکایا ہے۔ نرا پاکستانی اُس دن یہ پکائیں گی خالص رُوسی۔

ہاں آپ کو ایک اور بات بھی بتانی ہے کہ ہمارے گھر کے پاس ہی وہ جگہ ہے جہاں پشکن نے ڈوئل لڑا اور وہ شدید زخمی ہوا۔''

کمال ہے یہ تو بڑی اچھی بات بتائی آپ نے۔

فن لینڈ میٹرو اسٹیشن کو بھی ضرور دیکھیے کہ جہاں لینن کا مجسمہ ہے اور تاریخ بھی۔''

میں بٹر بٹر شاہد کا منہ دیکھتی تھی۔ وہ کیسا مہمان نواز تھا۔ کیسا اچھا اور پیارا بندہ۔ شاہد تم پاکستانی اور رُوسی بیوی کو کسی پیمانے پر ناپتے ہو۔ تمہارا یہ شادی کا تجربہ کیسا ہے؟

''ارے انستاسیا بڑی زبردست، بڑی وفادار اور محبت والی بیوی ہے۔ پاکستانی بیوی کا مجھے کیا تجربہ۔ پر یہ جب پاکستان میں چار ماہ رہی۔ میری ماں کا کہنا ہے کہ یہ اُس کی بہوؤں میں سے سب سے اچھی ہے کہ میرے دونوں بھائیوں کی شادیاں میرے چچا اور پھوپھی کی بیٹیوں سے ہوئیں اور دونوں نہایت بدتمیز اور نافرمان ہیں۔''

کھانا بہت لذیذ تھا۔ مہرالنساء کے دانتوں تلے دنوں بعد بوٹی نہیں بوٹیاں آئی تھیں اور اُس نے اُن کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔

باب
18

دوستووسکی اور اینا سے ملاقات

Вестреча С Достоевским и Иной.

سچ تو یہی تھا کہ میں تو سینٹ پیٹرز برگ کے ریلوے سٹیشن سے ہی سیدھی اُس عظیم ناول نگار کے گھر اور میوزیم جانے کی خواہش میں بے حال تھی۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ صورت اس شعر کی غماز تھی۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

ایک تو میری ساتھی محل میناروں کی شیدائی۔ ونٹر پیلس اور ہرمیٹیج کا سبق گھر سے پڑھ کر آئی تھی۔ دوسرے میں خود بھی محلات اور چرچوں کے طرز تعمیر کی فنکاریوں، فنون لطیفہ کی گھمبیر تاؤں اور ان کی بوقلمونیوں میں یوں اُلجھی کہ دوستووسکی ذرا سا دل سے اوجھل ہو گیا۔

چوتھے دن صبح سویرے مجھے اس کی ہُوک اٹھی تھی۔ میں ٹک گائیڈ ہاتھ میں پکڑے ریسیپشن پر چلی گئی۔ ریسیپشن پر ہر دوسرے دن ایک نئی لڑکی ہوتی۔ دوستووسکی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے میں نے ہاتھ فضا میں استفہامیہ تاثر دیتے ہوئے لہرایا۔

اینا دوستوفسکی

دوستوفسکی

مصنفہ نشست گاہ میں

مصنفہ اور مہر النساء، دوستوفسکی میوزیم کے دروازے پر

سماوار جس میں چائے کیلئے پانی گرم ہوتا ہے

دوستوفسکی کے سٹڈی روم کا کلاک جس کی سوئیاں ان کی موت کے وقت ساکت کر دی گئیں

روس کی ایک جھلک

زار نکولس اول و زارینہ الیگزینڈرہ فیدوروونہ

پیٹر ہاف کے گریٹ پیلس کے لوئر پارک
اور اپر پارک کے خوبصورت مناظر

''ٹیکسی۔'' وہ بولی ''نیت۔'' (نہیں) میٹرو یا بس۔ میں نے جواباً کہا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس نے مجھے بتانا چاہا کہ تم ٹیکسی کرلو ٹھیک رہوگی۔

''ارے مجھے کُتّے نے کاٹا ہے جو ٹیکسی کرلوں۔ ایک دو کلومیٹر کا راستہ اُس نے گھما پھرا کر دس کا کر لینا ہے۔ اور پانچ سو چار سو روبل جھاڑ لینے ہیں۔ رُوس کے ٹیکسی ڈرائیور بھی اول درجے کے کائیاں ہیں غیر ملکیوں کو لوٹنا جانتے ہیں۔ یوں بھی من موجی اور ٹریفک قواعد وضوابط میں لاپرواہ سے۔ ایسی ایسی پھرتیاں دکھاتے ہیں کہ مانو لگتا ہے جیسے سواری کو تو اُوپر پہنچا کر ہی دم لیں گے۔

لڑکی ہنس پڑی اور بولی۔

''آپ تو میرے سامنے زمین پر زندہ سلامت کھڑی ہیں۔ یہ بڑے ماہر ڈرائیور ہوتے ہیں۔ گھبرایا نہ کریں۔''

''بس تم مجھے سمجھادو۔ میٹرو یا بس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں۔''

''میٹرو سے۔'' اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

اس کی حیرت پر مجھے اچنبھا ہوا۔

''لو یہ ہمیں کیا گاؤدی عورتیں سمجھ رہی ہیں۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

چلو خیر کچھ زبان اور کچھ جسچر نے سمجھا اور سمجھایا۔ اور ہم لوگ چلے۔ سادووایا (Sadovya) میٹرو سے دوستووسکی سکایا میٹرو پر اُترے۔ باہر آئے۔

گاڑیوں بسوں سے بھرا ہوا یہ چوک جس کے عین سامنے خوبصورت ولادی میر چرچ تھا جس کے ساتھ ہی کزنچنی (Kuznechny) لین ہے۔ نقشے پاس ہونے کے باوجود ہم لوگوں کو روک کر پوچھنے میں ذرا سا تامل نہیں کرتے تھے۔ پرانی یم سکایا سٹریٹ جواب دوستووسکی کہلاتی ہے۔ یہیں کونے پر وہ چار منزلہ عمارت کھڑی ہے جس کے ایک اپارٹمنٹ میں اکتوبر 1878ء میں وہ میرا محبوب لکھاری اپنی فیملی کے ساتھ شفٹ ہوا اور یہی وہ گھر تھا جہاں 1846ء میں بھی

اس نے کچھ وقت کرایہ دار کی حیثیت سے گزارا تھا۔ گویا یہ گھر اس کی تخلیقی زندگی کی ابتداء اور انتہا تھا۔

مین دروازہ بیسمنٹ کی چند سیڑھیاں اتر کر تھا۔ پہلے پوڈے پر قدم دھرنے سے قبل میرا جی چند لمحوں کے لئے چبوترے پر بیٹھ جانے کو چاہا۔

میں کچھ جذباتی ہو رہی تھی۔ نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میری پلکیں اظہار تشکر کے طور پر بھیگ سی گئی تھیں۔ بھلا میری اتنی اوقات کہاں تھی کہ میں تاریخ وثقافت سے لبالب بھرے اس شہر میں آنے اور اس عظیم مصنف کے در پر حاضری دینے کا سوچ سکتی۔ تیری عنایت ہی ہے نا۔

اور پھر میں بھاری بھرکم چوبی دروازے کو دھکا دے کر فیدور دوستو وسکی (Fydor Mikhail Dostovsky) کے گھر میں داخل ہوتی ہوں۔ سو روبل کا ٹکٹ خرید کر چھوٹی سی راہداری میں کرسی میز بچھائے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کام کرتی خاتون کے گائیڈ کرنے پر سیڑھیاں چڑھتی ہوں بڑا کمرہ سامنے آتا ہے۔ یہ ہال کمرہ تھا جس میں رکھے ٹی وی کی سکرین پر اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ڈاکومینٹری چل رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھا ہوا۔ صوفے پر ہی آرام کرتا، کھانے کی میز پر، چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، دریائے نیوا کے کنارے سیر کے لئے جاتا، کینڈل پکڑے، برفباری کے دوران بیلچے سے برف ہٹاتے، پودوں کو پانی دیتے، اس کی زندگی کے بے شمار روپ ہم نے زہرمہرہ رنگے میٹ پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے دیکھے۔ اس کمرے میں ہمارے علاوہ ساؤتھ کوریا کے دو لڑکے اور کُرسی پر براجمان موٹی تازی رُوسی نگران خاتون تھی۔

فلم ختم ہونے کے بعد بھی میں ویسے ہی بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں میں محبت اور عقیدت کے دیئے جلتے تھے۔ بند کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھتی اور یہ سوچتی ہوئی کہ اس گھر میں اس کا دوبارہ آنا کس قدر شدید جذباتی صدمے کا نتیجہ تھا۔

میرے سامنے اس کی بیوی ''اینا'' "Anna" کی وہ تحریر تھی جس میں ممتا کا وہ دُکھ جھلکتا تھا کہ جب اُن کا سب سے چھوٹا بیٹا لائیوشا (Lyosha) فوت ہوا۔ اُسے مرگی کی بیماری اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ دونوں میاں بیوی کو وہ گھر جس کے چپے چپے پر ان کے لاڈلے بیٹے کی یادیں بکھری ہوئی تھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

بیٹے کے اِس دُکھ نے انہیں ایک نئے تجربے سے روشناس کیا۔ جہاں اُنہوں نے گھر بدلا۔ وہیں وہ ولادی میر سلوویو (Solovyov) کے کہنے پر آپٹن مناسٹری زیارت کے لئے گئے جہاں ''ایلڈرز'' نے اُن کی پریشان اور غم زدہ حالت پر انہیں اپنی محبت اور دعاؤں سے نوازا۔ دوستوو سکی کا یہ روحانی تجربہ اور قلبی طمانیت اُس کے ناول The Brothers Karamazov میں نمایاں ہوئی۔

چھ کمروں کے اپارٹمنٹ میں یہی وہ ہال تھا جس کا ذکر اینا نے بہت تفصیل سے کیا تھا۔

میں اُٹھی۔ سامنے دیوار پر پیٹرز برگ کی اٹھارویں صدی کی طبعی صورت کی بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ جب گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ مردوں کے لمبے فراک نما پہناوے اور عورتوں کی زمین بوس ہوتی فراک نما میکسیاں، سروں پر سکارف نما ہڈ اور کوٹ نما گاؤن تھے۔ سینا سکوائیر میں خرید وفروخت کا ایک منظر زندہ تھا۔ ہال نایاب تصویروں، خوبصورت سکیچ پینٹنگز جن میں لندن کا سینٹ پال کیتھڈرل، کرسٹل پیلس، روم کا پیٹر سکوائیر اور میلان کے کیتھڈرل چرچ بہت نمایاں تھے۔

پھر یوں ہوا میں ٹھٹھک کر رُک گئی۔ ایک ایسی تصویر میرے سامنے تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

''یہ ہینز ہولبن دی ینگر'' (Hans Holbein the younger) کی ''دی ڈیتھ آف جیسز'' (The death of jesus) پر وہ شاہکار اور نایاب پینٹنگ تھی جس میں اس نے جیسز (Jesus) کے پورے وجود پر بکھری موت کی اذیت اور دردناکیوں کو پینٹ کیا تھا۔ جیسز

کے جسم کی اذیت کی عکاس ایک ایک ہڈی پسلی، زخمی ہاتھ پاؤں خوفناک کرب و درد سے سُتا چہرہ، ہر احساس سے بے نیاز نیم کھلی آنکھیں، ناک ٹھوڑی اور منہ نیلا ہٹوں میں ڈوبا ہوا۔

یہی وہ پینٹنگ تھی جسے دیکھنے کے لئے وہ خصوصی طور پر باسل (Basel) سوئیز رلینڈ گیا اور اسی کے بارے میں اس نے کہا تھا۔

''اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ پر ہولبن ایک حیرت انگیز آرٹسٹ اور شاعر ہے۔''

انٹرنس ہال میں اس کی چھتریاں، ہیٹ اور صندوق دیکھتے ہوئے نرسری میں داخلہ ہوا۔ جب یہ خاندان یہاں شفٹ ہوا، اس وقت لیوبو (Liubov) بیٹی نو سال اور بیٹا فیودور سات سال کا تھا۔

کمرہ ایک خوبصورت گڑیا، راکنگ ہارس، چند کرسیوں، بچوں کی رائٹنگ ٹیبل اور میز پر رکھے بیٹے کی طرف سے باپ کو لکھے ہوئے لفافے سے سجا ہوا تھا۔

دوستو وسکی اپنے بچوں سے کس قدر پیار کرتا تھا اور ان کے بارے میں کتنا فکر مند رہتا تھا۔ اس کا اظہار اُس تحریر سے ہوتا ہے جو ''اینا'' نے اپنی یادداشتوں میں لکھی۔ اگر وہ اپنے علاج یا کاروباری معاملات کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تو ''اینا'' کو ملنے والے خطوط اس کی اور بچوں کی محبت سے بھر پور ہوتے۔ وہ اپنے بچوں کو کم عُمری سے ہی رُوسی اور یورپی ادب پڑھانے کا متمنی تھا۔ گوگول، پشکن، ڈکنز (Dickens) اور وکٹر ہیوگو سے تو بچے چھوٹی عمر میں ہی مانوس ہو گئے تھے۔ وہ اکثر بچوں کو پاس بٹھا کر بائبل کو اُونچے اُونچے پڑھتا۔ ایک بار بیٹے کی شکایت پر اس نے مجھے لکھا۔

''اینا تم فیودور کے باہر جانے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے پر پریشان ہوتی ہو۔ دیکھو وہ بچپنے سے بلوغت میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کی شخصیت کے بارے میں بہت سی گہری باتیں میرے مشاہدے میں آئی ہیں۔ گھبراؤ نہیں شاید تمہیں اس کا احساس نہ ہو کہ میں یہاں اس کے متعلق کتنا فکر مند رہتا ہوں۔ ہمیں ایک طویل مدت تک اس کے ہاتھوں میں کتابیں دے کر اسے

پڑھانا ہے۔''

اور یقیناً یہ اسی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کی بیٹی لیوبو نے بہت سی کتابیں جن میں ''Sick Girl'' ''وویمن لائر اور'' ''دستووسکی اپنی بیٹی کی نظر میں'' بہت مشہور ہوئیں۔

فیودور گھوڑوں میں دلچسپی کے باعث ایک کامیاب ٹریزاور ماہر ہورس بریڈر بننے کے ساتھ ساتھ شاعر اور تنقید نگار بھی تھا۔

نرسری سے ہی میں اینا کے کمرے میں داخل ہوگئی تھی۔

اینا جریجوریںا (Anna Grigorriena) کا کمرہ سادگی کا نمونہ تھا۔کھڑکی کے پاس کونے میں رکھی رائٹنگ ٹیبل، ایک الماری، صوفہ نما کرسی میز۔ میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ رُوس میں ہر تاریخی محل، میوزیم، پارکوں، شاہراہوں پر جابجا صوفے آرام دہ کرُسیاں اور بینچ رکھے ہوتے ہیں۔ سیاح پیدل چلتے چلتے تھک جائیں۔ بیٹھیں، ستائیں، سوچیں، خالقت کو دیکھیں، جو مرضی کریں۔ استنبول میں کہیں بیٹھنا تو دُور کی بات کسی دیوار کے ساتھ لمحہ بھر کی ٹیکی بھی ڈیوٹی پر حاضر پولیس والوں کی نگاہ میں فی الفور آ جاتی ہے اور وہ آپ پر کسی شکاری کی طرح حملہ آور ہو جاتا ہے۔

یقیناً میں وہاں بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے اس عورت کی قربت کی مہک محسوس کرنا چاہتی تھی جو صرف بیس سال کی عمر میں اپنے سے دوگنی عمر کے شخص کی زندگی میں ایک ایسے وقت داخل ہوئی جب وہ مصائب کے ہاتھوں حد درجہ پریشان تھا۔

دوستووسکی کے لئے 1854ء کا سال بہت پُرآشوب تھا۔ اس کی بیوی ماریا بھائی مکھیل اور گہرا دوست نامور محقق اور شاعر اپولون (Apollon) جو اس کے ذاتی اخبار ''دی ٹائم'' اور ''دی آپوچ'' (The Apoch) میں اس کا معاون تھا یکے بعد دیگرے اسے تنہا چھوڑ گئے۔ انہی دنوں اس نے ایک جگہ لکھا۔

''میری زندگی ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔''

اپنے بھائی کے قرضے اُتارنے کے لئے وہ کمیشن پر لکھنے کے لئے مجبور ہوا۔ وقت کی ایسی ہی کڑی گھڑیوں میں اسے ایک ایسا ناول لکھنے کی پیشکش ہوئی جس کی مدت تکمیل صرف ایک ماہ تھی۔ معاہدے کی رُو سے ناکامی کی صورت میں وہ مستقبل میں اپنے کام کی رائلٹی سے محروم ہو جاتا۔

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

اُس نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔

''ایک سٹینوگرافر رکھو۔''

دوست نے حل بتایا۔

تب چار اکتوبر 1866ء کی ایک اَبر آلود دوپہر کو کتابی چہرے پر سجے ستواں ناک اور خوبصورت آنکھوں والی دلکش لڑکی جس کے براؤن فراک کے گلے اور آستینوں پر لگی دیدہ زیب لیسیں لہراتی تھیں اس کے گھر میں سٹینوگرافر کی حیثیت سے داخل ہوئی اور ٹائپ رائٹر پر بیٹھی۔

''The Gambler'' چھبیس دنوں میں مکمل ہو گئی۔

کام کے اختتام پر اُسے احساس ہوا کہ وہ اس مہربان اور ہمدرد لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''میں اُس سے کیسے بات کروں؟'' اُس کے باریک بھینچے ہوئے ہونٹوں سے تذبذب میں ڈوبا ہوا یہ سوال اُبھرا جو دل کی سرگوشی میں اپنے آپ سے تھا۔

وہ ردّ کئے جانے سے ڈرتا تھا۔ پھر اُس کا عندیہ لینے کے لئے اُس نے فرضی ناول کا پلاٹ گھڑا۔ ایک چوالیس (44) سالہ مرد جو مریض بھی ہے کا بیس (20) سال کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونا اور اینا سے یہ پوچھنا کہ ذرا سوچو تو کیا اُمنگوں سے بھری ہوئی اُس نوجوان لڑکی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایسے مرد کی محبت کا جواب محبت سے دے؟

''کیوں نہیں۔'' اینا نے نگاہیں اُٹھائیں اور اُسے دیکھا۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر تفکر بھری لکیریں تھیں۔

''محبت تو ان سب باتوں سے بالا ہوتی ہے۔''

بس تو جیسے سُوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے۔ وہ بھی کھل اُٹھا اور اپنا آپ کھول کر سامنے رکھ دیا۔

''اینا میں جانتا ہوں میری عمر کا ایک مرد تم جیسی نوجوان لڑکی کے لئے قطعی موزوں نہیں پر پتہ نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے کہ تم مجھ جیسے بکھرے ہوئے انسان کو سمیٹ لوگی۔ مجھے پیار دوگی کہ تمہیں پیار دینا آتا ہے۔''

اور اینا نے اُس کے چہرے کو دیکھا جو اپنی چمکتی بھوری آنکھوں میں آرزوؤں کا ایک جہاں سمیٹے اُسے دیکھتا تھا۔

تب اُس نے خود سے کہا کہ اگر وہ نفی میں جواب دیتی ہے تو یہ اُس کی خودداری اُس کے پندار اور اُس کی عظمت کے لئے کتنا بڑا دھچکا ہوگا۔

''نہیں۔ میں اسے افسردہ اور ملول نہیں دیکھ سکتی۔ یہ انسان مجھے بے حد عزیز ہو چکا ہے۔''

بیاہ کا دن پندرہ فروری طے ہوا۔ اور رسم کی ادائیگی کے لئے ٹرنٹی کیتھڈرل کا نام تجویز کیا گیا۔

یہ سب تو ہوگیا۔ پر کچھ گھمبیر سے مسائل ابھی بھی اُس کے سامنے سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں سرفہرست اُس کا ویڈنگ ڈریس تھا۔

یہ کیسا ہو؟ اور اُس کی خریداری کہاں سے کی جائے؟ دوستووسکی کے لئے تو پیسے کی فراہمی بھی مسئلہ تھی۔

سمجھدار ذہین لڑکی نے اُن بہت سارے سوالوں کہ جنہوں نے اُسے پریشان کر رکھا تھا کا جواب دے کر اُس کے تفکرات کو تحلیل کر دیا۔

''بھئی آخر میں سلائی کڑھائی کی اتنی ماہر ہوں۔ اپنا عروسی جوڑا خود ڈیزائن کروں گی اور اُسے سلمہ ستارے سے خود ہی سجالوں گی۔ تم کوئی چنتا مت کرو۔ رہا کپڑا تو وہ میرے پاس ہے۔''

شادی ہوئی اور مصائب کا آغاز بھی ہوگیا۔ ابھی استقبالیہ دعوت تھی۔ جب نئی نویلی دُلہن کو دولہا سنبھالنا پڑا کہ دوستووسکی نے شمپین ضرورت سے زیادہ پی لی۔ مرگی جس کا وہ پرانا

مریض تھا کا دورہ پڑ گیا۔ گھنٹوں وہ درد سے بے حال رہا اور دُلہن اُسے اپنی بانہوں میں اور کبھی اُس کا سر اپنی گود میں رکھے اُسے سنبھالتی رہی۔ پہلے ہی دن سے اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹنے اور اُس کے دُکھ کو بانٹنے کا یہ کام اُسے ساری زندگی کرنا پڑا۔

صحت کا مسئلہ تو ایک طرف۔ اس کے ساتھ معاشی مصائب بھی خون چوسنے والی جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ قرض خواہوں کی خوفناک دھمکیاں، اُن کا آئے دن تنگ کرنا، اُس کی جائیداد ہتھیانے کی سازشیں، بیس (20) سالہ لڑکی اُن سب کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے اپنی ذاتی چیزیں بیچیں اور کچھ سالوں کے لئے شوہر کو اُن کے چنگل سے نکال کر باہر لے گئی۔

بیرون ملک یہ زندگی مشکلات اور مصائب سے بھری ہوئی تھی۔ پیسے کی تنگی، مشرقی یورپ میں خانہ بدوشوں جیسی زندگی، بسا اوقات کمرے کا کرایہ ادا نہ کر سکنے پر لینڈ لارڈ کی صلواتیں، دوستووسکی کی خراب صحت، اکثر اُس کا جُوا کھیلنا اور سب کچھ ہار جانا۔

ان کے پہلے بچے صوفیہ کی سوئیزرلینڈ میں پیدائش اور تین ماہ بعد اس کا مر جانا۔ سب وہ کڑی آزمائشیں تھیں جنہیں اگر اینا نے حوصلے اور محبت کے بل پر سہا تو وہیں اس نے Idiot تخلیق کی۔

مہرالنساء کوئی دو بار سارے کمروں کا چکر لگا آئی تھی۔ اور میں ابھی تک وہیں بیٹھی تھی جب اُس نے کہا۔

''سارا دن یہیں گل کرنے کا ارادہ ہے کیا؟''

میں چپ تھی۔ اس وقت میرے سارے جذبے اُس عورت کو خراج تحسین پیش کرتے تھے جس نے ساری زندگی کرائے کے گھروں میں گزاری۔ جس نے کسی مہربان اور مشفق ماں کی طرح اُس پر اپنی محبتوں کی بارش کی۔ جس نے اس کے مرنے کے بعد اپنے بقیہ سارے سال اس کے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور اپنی یادداشتوں کو مرتب کرنے میں گزار دیئے۔

میں خاموشی سے اُٹھ کر ملحقہ ڈائننگ روم میں آ گئی۔ ڈائننگ روم کی سجاوٹ پیٹرز برگ

کے روایتی گھروں جیسی تھی۔ دوستوویسکی کے خاندان کا اندازِ زندگی سادگی سے بھرپور تھا۔ میز پر کپ سجے تھے۔ کونے میں دھری چھوٹی میز پر پیتل کا وہ سماوار اور چائے دانیاں تھیں جس کا ذکر اینا کی یادداشتوں میں ملتا ہے۔ الماری چینی کے نفیس برتنوں سے سجی تھی۔

خاندان رات کے کھانے پر ضرور اکٹھا ہوتا۔ اکثر عزیز دوست اور رشتہ دار بھی شامل ہوتے۔ اینا کو اپنے شوہر کا گھر واپسی پر رات کے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ لانا بہت پسند تھا۔ پر اُسے آئے دن دوستوویسکی کا بچوں کو ٹریٹ دے دے کر خراب کرنے پر بھی گلہ رہتا تھا۔

چائے اور اُس کا اہتمام دوستوویسکی کی زندگی میں بہت اہم تھا۔ چمکتے پیتل کے سماوار کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے میرے سامنے اینا کی تحریر تھی۔

اچھی چائے اس کی کمزوری تھی۔ سونے سے قبل میں سماوار کو ڈائننگ روم میں ضرور چیک کرتی۔ چائے بنانے کا اہتمام خصوصی ہوتا۔ سب سے پہلے وہ اُبلتے پانی سے کیتلی کو کھنگالتا، اس کا چمچ مخصوص تھا جسے بچے پاپا کا چمچ کہتے تھے۔

میری نظروں کے عین سامنے وہ چمچ اور چائے دانی تھی۔ میں اسے ہاتھ لگا کر چھو نہیں سکتی تھی کہ آگے حد بندی تھی۔ وہ تین چمچ چائے ڈالتا اور چائے دانی کا 1/3 حصہ پانی سے بھر کر اُسے نیپکن سے ڈھانپ دیتا۔ پورے تین منٹ بعد وہ چائے دانی کے بقیہ کو کھولتے پانی سے بھرتا اور پھر اُسے کپڑے سے ڈھانپتا۔

اس کی بیٹی لیوبو (Liubov) کا کہنا تھا کہ پاپا ہمیشہ چائے کے رنگ کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔

''ہائے۔'' میں نے سرشاری کے سُرور آگیں احساس کے زیرِ خود سے کہا۔

چلو اور کچھ نہ سہی پر یہ قدر تو مشترک ٹھہری کہ زندگی میں اچھی چائے کے سوا کوئی دوسرا شوق نہیں رہا۔ چائے کا رنگ کمزوری اور چائے بنانے اور پینے کا اہتمام خوشی۔

گلاس ہاتھ میں تھامے وہ سٹڈی روم میں آتا اور لکھنے میں محو ہو جاتا۔ چائے میں چینی کی

ہمیشہ دو کیوبز ہی استعمال ہوتیں۔ چائے سے اس کی یہ محبت اس کے ناولوں کے اکثر کرداروں میں جھلکتی۔ ''The Devils'' کے کردار اسے زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

اس گھر میں سب سے اہم تاریخ ساز جگہ اُس کا سٹڈی روم تھا۔ نشست گاہ سے ملحقہ جو اس کی خوابگاہ بھی تھی۔ نشست گاہ میں دیوار گیر وال کلاک کے پاس کھڑے ہو کر اور کرسیوں پر بیٹھ کر تصویریں بنائیں۔ خوش ہوئے کہ ہم ایک ایسے کمرے کی فضا میں سانس لے رہے ہیں، جہاں رُوس کے نامور شاعر، فلاسفر، محقق اور حقوق خواتین کی تحریک کے علمبردار آتے اور بیٹھا کرتے۔

سٹڈی روم میں کچھ وقت گزارنے کی ضرورت تھی اور وہ میں نے گزارا۔ کمرے کی کھڑکیاں باہر Kuznechny Lane پر کھلتی تھی۔ ولادی میر چرچ بھی سامنے تھا جہاں دوستووسکی اپنے آخری ایام میں عبادت کے لئے جایا کرتا۔

یہی وہ کمرہ تھا اور میرے سامنے ہشت پہلو میز پر دھرا وہ کلاک تھا جس کی سوئیاں 28 جنوری 1881ء بروز بدھ کی شام آٹھ بج کر 36 منٹ پر اس کمرے کے مکین کے ساتھ ہی ساکت ہو گئی تھیں۔

کمرہ سادگی کی تصویر تھا۔ عین وسط میں رائٹنگ ٹیبل اور دیوار کے ساتھ صوفہ تھا۔ ملمع زدہ فریم میں اس کی تصویر کے عین نیچے لیٹر بکس تھا۔ تین خانے والے ریک کے ہر حصے میں کتابیں تھیں۔ الماری میں بھی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ اس سادہ سے کمرے میں اسی میز پر اس نے اپنا آخری شاہکار ناول برادرز کرامازو (The Brothers Karamazov) تخلیق کیا۔

پیدائش تو اس کی ماسکو کی تھی۔ 11 نومبر 1821ء۔ بچپن ہی سے اُسے قلم اور کاغذ سے دلچسپی تھی۔ سوچنے کا شوق تھا۔ ماں کے مرنے پر اس کے باپ نے جبراً اُسے ملٹری انجینئرنگ اکیڈمی پیٹرز برگ بھیج دیا اور گویا اس کی قسمت پیٹرز برگ سے وابستہ ہو گئی۔ فوج میں اپنی نوکری سے بالآخر ایک دن اس نے یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہا

ہوں۔ رشتہ داروں کے اعتراضات پر اُس کا جواب تھا۔

''میں اپنے بارے میں پرُامید ہوں۔ انسان ایک سربستہ راز ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

آغاز کا کچھ وقت اُس نے فرانسیسی لکھاریوں کے ترجموں میں صرف کیا۔ یورپ اور رُوس کے رائٹرز کو پڑھا۔ پڑھنے سے اُس نے ہمیشہ ایک رُوحانی آسودگی محسوس کی۔ ابتداء میں اس کے محبوب ڈکنس، گوگول، شلر اور پشکن تھے۔ پر جلد ہی اُسے احساس ہو گیا کہ حقیقت بذاتِ خود بڑی خوبصورت شاندار اور حیرت انگیز ہے۔ آغاز کا لکھا ہوا سارا کام اس نے ضائع کر دیا اور نئے اعتماد اور چیلنج کے ساتھ Poor Folk میں ظاہر ہوا۔ اس کا ہیرو کوئی رومانوی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ستم رسیدہ غیر اہم شخص ایک کلرک تھا۔ انسان کے اندر کی سچائی کی تلاش کو اس نے اپنی تحریر کا منتہا ٹھہرایا۔

اور یہ یہی وہ دن تھے جب اس کا تعارف میخائل پیٹرا شوشکائے (Mikhail Petrashevsky) سے ہوا جو رُوس کے بہتر مستقبل کے لئے درد رکھنے، انقلاب فرانس اور سوشلسٹ نظریات سے محبت کرنے والے نوجوانوں کو اپنے گھر بلاتا اور رُوسی معاشرے اور اس کے موجودہ حالات پر لمبی چوڑی بحثیں کرواتا۔

1848ء میں یورپ میں انقلابی تحریک چلی تو نکولس اول نے خوف زدہ ہو کر رُوسی وزارتِ داخلہ کو ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں رپورٹ کے لئے کہا جو رُوس میں سرگرم عمل تھیں۔ اور نتیجتاً دوستووسکی سمیت میٹنگ کے تمام افراد 23 اپریل 1849 کو گرفتار ہوئے۔ چند ماہ پیٹر اینڈ پال قلعے میں گزارنے اور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ آنے پر منتقلی سائبیریا کے شہر اومسک (Omsk) کی سنٹرل جیل میں ہوئی۔

آٹھ ماہ بعد نکولس اول کا اُنہیں عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ منظر عام پر آ گیا۔

یہ بائیس (22) دسمبر 1849 کی سرد ترین صبح تھی۔ سمینو وسکائے سکوائیر میں ایک بڑے

شو کا اہتمام کیا گیا تھا جس کا سکرپٹ زار نے خود لکھا اور خود ترتیب دیا۔

سکوائیر کے ڈھلانی چھتوں والی عمارتیں برف باری سے سفید ہوئی پڑی تھیں۔ لوگوں کا ایک جم غفیر میدان میں موجود تھا۔ فوج اور پولیس کے دستے مستعد کھڑے تھے۔ پادری موجود اور جلاد حاضر۔ نکولس اول بہ نفس نفیس یہاں تھا۔ اس شو کو ایک عبرت انگیز مثال بنانے کے لئے ریاستی فنڈز بھی بے دریغ استعمال ہوئے تھے۔

مجرموں کی لمبی قطار موت کے انتظار میں کھڑی تھی۔ کیسا دل دہلانے والا نظارہ تھا۔ پلیٹ فارم سے کوئی بیس قدم پرے تین پوسٹیں بنائی گئیں۔ پہلے تین مجرموں کو پوسٹ پر لا کر گاؤن پہنائے جاتے جن کے ساتھ لمبے لمبے ہڈ ہوتے جو اُن کی آنکھوں کو ڈھانپ لیتے۔ پادری کراس کے ساتھ ہر ایک کے پاس جاتا۔ بازوؤں سے تھام کر پلیٹ فارم پر لائے جاتے۔ فردِ جرم اُونچی آواز میں پڑھی جاتی۔ ڈرم بجتا اور ''موت فائرنگ سکواڈ کے ساتھ۔'' الفاظ گونجتے اور زندگی پل جھپکتے میں موت کے ہاتھوں جھول جاتی۔

اگلے مجرم نئی فردِ جرم کے ساتھ۔

دو موتوں کے درمیان بیس منٹ کا وقفہ اور تیاری کے بعد پانچ منٹ کا۔ اُس پانچ منٹ کے جس تجربے سے دوستووسکی گزرا وہ اُس کی زندگی کا ناقابل فراموش تھا۔

سمینو وسکائے سکوائیر کے چرچ کی سُنہری چھت اور گنبد، لوگ، دھوپ، چمکتا سورج، ہوائیں، آسمان اور میدان میں موت کے بجے بازار سے پھوٹتی کہیں آس اور امید کی کوئی موہوم سی کرن۔ نکولس اول موت سے خاصا محظوظ ہو چکا تھا۔ بقیہ کے لئے قید بامشقت کا حکم دیتا اُٹھ گیا تھا۔

''ایڈیٹ (Idiot) میں پرنس ماشکن (Myshkin) کی زبان سے اُس نے اپنے اسی تجربے کو دہرایا ہے۔ زندگی ہمارے اندر ہے۔ باہر نہیں۔''

اومسک (Omsk) جیل میں چار سالہ مشقت بھری قید نے اسے اتنی تکلیف نہیں دی جتنی قلم کا غذ اس کے ہاتھ سے چھننے پر ہوئی۔ اسے اسی کا ڈر تھا اور یہی اُس نے کہا۔

''اگر مجھے لکھنے نہ دیا گیا تو میں مر جاؤں گا۔ کاغذ اور قلم کے ساتھ میں پندرہ برس کی سزا کو بھی بخوشی کاٹنے کے لئے تیار ہوں۔''

بیرکوں میں یہ چار سال چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ گزارے۔ ان کرداروں میں جو گہرائی، توانائی اور خوبصورتی اس نے دیکھی وہ کہنے پر مجبور ہوا۔

''یہ تو بدصورت سیپیوں میں بند وہ سونا ہے جن کی دریافت میں نہ مجھے اپنے برسوں کے ضائع ہونے اور نہ کاغذ قلم نہ ہونے کا دُکھ ہے۔ میں نے ان حیرت انگیز لوگوں کو تفصیل اور سچائی سے پڑھنے اور ان کے کرداروں کی بے شمار جہتوں کو پرکھنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ میرے لئے بہت بڑا اثاثہ ہے۔ میں نے رُوس کو نہیں پر رُوسی لوگوں کو ضرور جانا اور سمجھا ہے۔ Crime and Punishment اس کے بعد لکھی گئی۔''

اور اگلے چھ سال اُس نے سائبیریا کے قصبے میں ڈرل اور مارچنگ کرتے ہوئے گزارے، پر یہاں اسے لکھنے پڑھنے کی آزادی تھی۔ اپنے ہر خط میں وہ اپنے بھائی کو اپنی پسندیدہ کتابوں اور رسالوں کے نام بھیجتا۔

اور سائبیریا میں اُس نے ''My Uncle's Dream'' اور ''The Village of Stepanchikovo'' لکھیں۔

نکولس اول کی موت نے ملکی حالات کو تبدیل کر دیا۔ اور وہ اپنے پیٹرز برگ کے دو ستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہا ہو گیا۔ مئی 1854ء میں اُس نے ماریا سے شادی کی جو بیوہ تھی۔ اپنے بھائی کو ماریا کے بارے میں بتاتے ہوئے اُس نے لکھا تھا۔

''وہ صرف اٹھائیس سال کی ہے۔ چھ سال کا بیٹا بھی اُس کے پاس ہے۔ وہ ایک ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ اور میں نے اُسے مستقبل میں تحفظ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

زندگی کے آخری برسوں میں اس کے پڑھنے والوں کے سامنے اس کا ایک اور رُخ آیا تھا۔ ہمارے اشفاق احمد صاحب کی طرح اُس کا رُجحان بھی رُوحانیت کی طرف ہو گیا تھا۔ لوگوں

کے مسائل سننا، اپنی مشکلات سے بھرے ہوئے ان کے خط پڑھنا، ممکنہ حد تک ان کی پریشانیوں کو دور کرنے اور ان میں آسانیاں بانٹنے کی کوشش کرنا اس کا مطمع نظر ہو گیا تھا۔

اور پھر وہ دن آیا جب اُس نے کہا۔

''آج مجھے مر جانا ہے۔''

طبیعت تو دو تین دنوں سے خراب تھی۔ پھیپھڑوں کی بیماری تو بہت پرانی تھی۔ اینا نے ڈاکٹروں کو بلایا۔ ولادی میر چرچ کے پادری بھی آئے۔

اٹھائیس (28) جنوری کی صبح اس نے کہا۔

''اینا آج مجھے دنیا سے چلے جانا ہے۔ تم انجیل لاؤ۔''

اور اینا اُسی انجیل کی کاپی لے کر آئی جو سائبیریا جاتے ہوئے راستے میں اُسے فونویزینا (Fonvizina) نے دی تھی جو 14 دسمبر کو زاروں کے خلاف انسانی حقوق کی ناکام بغاوت کے باغیوں میں سے ایک کی بیوی تھی۔ جو دسمبری کہلاتے تھے۔

اس نے ہمیشہ اُسے سنبھال کر رکھا اور جب بھی وہ پریشان یا کسی مشکل میں ہوا اس نے ہمیشہ اُسے کھولا اور پڑھا اور اب اینا پڑھتی تھی۔

''پس جیسز نے اُسے کہا۔ اب ایسا ہونے دو۔''

اور اُس نے آنکھیں کھول کر ایک لمحے کے لئے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''اینا تم سنتی ہو۔ Let it be so now''۔

''تم سمجھتی ہو میں مر رہا ہوں۔''

اُس نے آنکھیں موندلیں۔

گھڑی کی سوئیاں ساکت کر دی گئی تھیں۔ یہ اٹھائیس جنوری 1881ء تھا اور وقت آٹھ بج کر چھتیس منٹ کا تھا۔

اور ایک عظیم لکھنے والا دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

باب

19

رُوسی بابشکاؤں کے ہاتھوں لٹنا

نتاشا اور آلا سے ملاقات • پرُانے پیٹر ہاف آلا کا گھر

Аграбления Русских Болшёвиков
Вестреча С Наташам И Алоиём.

سچی بات ہے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رُوسی بوڑھی عورتیں جنہیں بابشکا ہیں کہتے ہیں۔ اس درجہ ہوشیار اور چالاک ہوں گی کہ دن دیہاڑے آنکھوں میں دُھول جھونک کر دو ٹکے کی چیز باوا کے مُول دیں گی۔

بات اتنی سی تھی کہ Kuznechny Lane میں دستووسکی کے گھر اور میوزیم جانے کیلئے ہم غلطی سے ذرا آگے نکل گئے تھے۔ جب واپس پلٹنے لگے تو فٹ پاتھ پر چار بوڑھی عورتوں کو تازہ سلاد کی سُرخ مولیاں، ہرا پیاز، پودینہ اور گاجریں بیچتے دیکھا۔ مُولیوں اور گاجروں کی خوش رنگی اور تازگی اپنی جگہ جو بوڑھیاں دکاندار بنی وہاں کھڑی تھیں وہ اپنے پہناوں کے ساتھ پیٹرز برگ کی قدیم تہذیب کی نمائندہ تھیں۔ موٹی چنٹوں والے لونگ سکرٹ، پوری آستینوں والے لمبے بلاؤز اور سروں پر خاص قسم کی ٹوپیاں اوڑھے۔ مولیاں اتنی تازہ اور خوش رنگ تھیں کہ بے اختیار اُسی وقت جی چاہنے لگا کہ ابھی پکڑیں اور کچر کچر کھانا شروع کر دیں۔ یقیناً ایسا کر بھی

لیتے پر ایک تو ابھی سویر تھی۔ بھاری بھر کم ناشتہ کلیجے پر دھرا تھا۔ دوسرے گُرد کے گھر جا رہی تھی۔ طے کیا۔ واپسی پر انہیں خریدا جائے۔ کتلت اور خلیب (براؤن بریڈ) کے ساتھ مزیدار ڈنر کا سامان بنایا جائے۔

دوستو وسکی اور اینا کے گھر سے رُخصت ہوئے تو وہیں جا کر مولیوں کی خریداری کا سوچا۔ اُنگلیوں سے ایک خوبصورت سمارٹ سی بابشکا نے چار کا اشارہ دیا۔ سات آٹھ بندھی مولیوں کا یہ گچھا ہم نے دو اور تین میں خریدنا چاہا پر وہ چار کے اشارے پر ڈٹی رہی۔

چلو خیر پانچ روبل کا سکہ دیا اور ایک روبل کی واپسی کیلئے ہاتھ کیا بڑھایا جیسے لگا کہ شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ بیٹھے ہیں۔ خونخوار چیلوں کے نرغے میں آ گئے ہیں۔ خوفناک شکاری کُتوں کے گھیر میں پھنس گئے ہیں۔ اُس کی ساتھی عورتوں نے فی الفور چار اور صفر کا اشارہ دیتے ہوئے غصیلی نگاہوں سے یوں گھورا جس میں پیغام تھا، فوراً پیسے دو، چالیس روبل۔

''چالیس روبل۔'' میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ ان پانچ چھ مولیوں کے گُچھے کے چالیس روبل۔ ناممکن۔

میرا تو سانس لینا مشکل ہوگیا۔ پل بھر کیلئے سوچا۔ پھینک دیں انہیں اور بھاگ جائیں، کیا کر لیں گی۔ پر سوچ آئی تھی کہ اگر تعاقب ہوگیا تو مارے جائیں گے جو مرضی الزام لگا دیں۔ ہماری کس نے سُنی ہے؟

قہر درویش بر جان درویش۔ چالیس روبل کے نوٹ دے کر جان کی خلاصی کروائی۔ تھوڑا سا آگے چلنے پر سبزی اور پھل مارکیٹ نظر آئی تو اندر جا گھسے۔ پختہ چبوتروں پر تازہ خوش رنگ پھلوں اور سبزی کے سلیقے سے لگے ڈھیروں پر قیمتوں کے کارڈ بھی دھرے تھے۔ پوری منڈی میں عورتوں کی حکمرانی تھی۔

''اوہو تو یہی بابشکا مارکیٹ ہے۔ ہر رُوسی کا مضافات میں چھوٹے یا بڑے گھر کا ہونا ضروری ہے جسے ڈاچا کہا جاتا ہے۔ اس کے باغیچے میں سبزیاں پھلدار درخت لگائے جاتے

ہیں۔ اکثر بوڑھی عورتیں صبح سویرے اپنے ڈاچاؤں سے سلاد اور پھل لا کر فروخت کرتی ہیں۔ کہیں یہ دکانداری منظم صورت میں کہیں فٹ پاتھوں اور چوراہوں پر بکھری ہوئی۔ جنہوں نے ہمیں لوٹا وہ ذرا ماٹھی قسم کی باشکائیں تھیں کہ جو تھوڑے سے مال متاع کے ساتھ سڑکوں پر ڈیرہ لگا لیتی ہیں اور جہاں داؤ چلا مہنگے داموں بیچ بچا کر اپنی دیہاڑی کے ساتھ گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔ مارکیٹ کی عورتیں تو سچی بات ہے بڑی مرد مار قسم کی تھیں۔ پکے پھیٹے بنیوں کی طرح اپنے اپنے اڈوں پر ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔ گاہکوں میں بھی قسم کھانے کو کوئی مرد نہ تھا۔ مولیوں کا گچھا پانچ روبل کا تھا۔

دل نے رَج کے اُن کھوسٹ بڈھیوں کو لعن طعن کیا۔

ہتھ چھٹ قسم کے کیلے تھے۔ ہمارے عنبری سیبوں جیسی رنگت والے جہازی سائز کے سیب تھے۔ چار کیلے اور دو سیب نوے روبل کے خریدے اور ولادی میر سکایا چوک میں دھری لمبی چوڑی بنچ پر بیٹھ کر کیلے اور سیب کھانے کے ساتھ ساتھ نرم گرم دھوپ سینکی، پاس بیٹھے جب چند لوگوں نے جگہ خالی کی تو ٹانگیں پسار اور لم لیٹ ہو کر تھوڑا سا مزہ بھی اٹھایا۔

مہرانساء نے کہا۔ کچھ خوف خدا کرو، بھینس کی طرح پسر گئی ہو۔ خلقت امنڈی پڑ رہی ہے۔

میں ہنس پڑی۔ ارے اُمنڈنے دو، مجھے تو اپنے مزے سے غرض ہے۔ یہاں کسے فرصت ہے کہ وہ اس عورت کو دیکھے۔

کوئی گھنٹے بعد میں نے ایک نوجوان کو پکڑا، جس نے اطمینان اور تسلی سے کھڑے ہو کر مجھے سمجھایا۔ پیٹر ہاف (Peter Hof) سپیڈ بوٹ سے جایا جا سکتا ہے۔ اُس کے لئے ہرمیٹج کے نزدیک پیلس برج پر آپ کو جانا پڑے گا۔ میٹرو سے جاتی ہیں تو یہاں پاس ہی میٹرو کا سٹیشن ہے۔ اندر جا کر بالٹی سکایا کا ٹکٹ لیں۔ جب میٹرو کی بلڈنگ سے نکلیں گی تو دائیں ہاتھ کے گیٹ سے باہر جائیں۔ پیٹر ہاف کیلئے بسوں کے پرے نظر آئیں گے۔ ٹیکسی سے جا سکتی ہیں جو یقیناً مہنگی

ہو گی۔

بس تو فیصلہ ہوا کہ میٹرو بہتر رہے گی۔ آگے بس چلے گی۔

پر ہوا یہ کہ کچھ تو میٹرو سٹیشن کی رنگینیاں، کچھ لوگوں کا ہجوم، دایاں بھول گئے اور بائیں کی گود میں جا گرے یوں کہ لمبے چوڑے خوبصورت سیاہ اور سفید ٹائیلوں والے فرش پر احتیاط سے چلتے ہوئے بڑے سائز کے چوبی دروازے سے باہر کا منظر بڑا عجیب سا تھا۔ بھونچکے سے ہو کر پٹریوں پر گاڑیوں کو اور پلیٹ فارم پر لوگوں کے جتھوں کو دیکھا۔

چلو ایک نیا سیاپا، پیٹرہاف کی دہائیاں دیتی بسیں وہ کہاں ہیں؟ یہ گاڑیوں والا جمگھٹا تو نہیں بتایا گیا تھا۔

کوفت بھرے انداز میں یہ بڑبڑاہٹ میری صرف اپنے آپ سے تھی۔

پھر ہجوم کو آنکھوں میں قصائی جیسی نظر بھر کر دیکھا کہ ہے کوئی مہربان چہرہ جسے پوچھیں تو وہ مونڈھے مار کر آگے نہ بڑھے۔ دو عورتیں منفرد سی لگیں، انہی کے پاس جا کر مدعا گوش گذار کیا۔

وہ بھی یوں لگتا تھا جیسے اسی انتظار میں کھڑی ہیں کہ کب کوئی کچھ پوچھے اور وہ نیکی کمائیں۔ پل جھپکتے میں ہاتھ سے پکڑ کر ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر لے آئیں کہ پیٹرہاف لوکل گاڑی سے بھی جایا جاتا ہے۔ ہمیں بھی اسی طرف جانا ہے۔ کچھ فکر کی بات نہیں۔

ایک تو سیاح، اُوپر سے ماحول اور لوگوں کے بارے میں کچے پچھے جاننے کے خواشمند، تیسرے مدمقابل انگریزی بولنے والا، جہاں اتنی باتیں ساز گار مل جائیں تو اندھے کو دو آنکھوں کے سوا اور کیا چاہیے تھا۔ کیسا خوش نصیب دن تھا۔

آلا سیاہ زمین پر سفید بُند کیوں والا فراک پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ جرسی اور لمبی سیاہ جرابیں، پوری جٹ نظر آتی تھی، عمر یہی کوئی چالیس کے ہیر پھیر میں ہو گی۔ رُوسی لڑکیوں کو انگریزی سکھاتی تھی۔

نتاشا کی گردن کے دو مہرے کھسکے ہوئے تھے۔ کالر پہننے کی وجہ سے گردن میں اکڑاؤ تھا۔ بیماری کی اذیت سے دوچار ہونے کے باوجود ہنس مکھ تھی۔ جسم پر کوٹ اور سر پر لمبی سی ٹوپی تھی۔

گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ہی ڈھیر ساری معلومات ایک دوسرے کے بارے میں حاصل ہو گئی تھیں۔ آلا کی اپنے شوہر سے علیحدگی تھی۔ اکلوتے بیٹے کے بارے میں بات کرتے ہوئے اُس کے لہجے میں دُکھ اور ملال تھا۔

''نشہ کرتا ہے، چھ ہزار روبل میری تنخواہ ہے، کہاں سے اُس کے آئے دن کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورے کروں، نکال دیا ہے گھر سے میں نے۔''

''یہ کمبخت مائیں پالنے سے لے کر اولاد کے بوڑھا ہونے تک بھی اُن کی ہی فکروں میں مری جاتی ہیں۔''

نتاشا کا شوہر بس ڈرائیور تھا، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا، تینوں شادی شدہ تھے۔

وہ اگر گھریلو زندگی سے سکھی تھی تو بیماری اور اس پر اٹھنے والے اخراجات کے ہاتھوں پریشان تھی۔ اور میرے یہ پوچھنے پر کہ روس میں طبّی علاج تو حکومت کی ذمہ داری ہے۔

زیادہ مہنگے علاج اب حکومت کی ذمہ داری نہیں رہے، وہ دور ختم ہو گیا جب زبان تو بند تھی پر باقی فقر فاقے نہیں تھے۔ آلا بولی تھی۔

میں دُھوپ میں کھڑی تھی اور اسکا پیار اور تیزی درختوں، عمارتوں، پلیٹ فارم کی سلیبوں اور اس میں نہاتے انسانوں کے لال گلال چہروں پر ہویدا تھی۔ اُس وقت ہوائیں بھی گویا اُس کے سامنے دم سادھے بیٹھی تھیں۔ مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے آلا سے ذرا چھاؤں میں چلنے کی درخواست کی۔

پر عین اُسی وقت آلا مجھے ہاتھ سے تھام کر گاڑی میں لے آئی کہ اُس کی روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔

کمپارٹمنٹ بہت کشادہ اور نشستیں شاہ بلوط کی نئی نکور لکڑی کی تھیں۔ کوئی نرم سی پوشش نہیں تھی اُن پر۔ رُوسیوں کی طرح ٹھنڈی ٹھار اور سخت۔

آلا کے لہجے میں ایک اچھے اُستاد کا تاسف چھلکتا تھا جب وہ اپنی شاگردوں کے بارے میں بات کرتی تھی۔

رُوسی لڑکیاں امریکی زندگی اور اس کی آسائشوں کے حصول کیلئے مری جاتی ہیں۔ اُنہیں خوابوں کی دنیا میں رہنا بہت پسند، پر انگریزی سیکھنے میں پکّی چور اور پوری ہڈحرام ہیں۔ ڈکٹیشن سے اُن کی جان جاتی ہے۔ ہجے یاد کرنے پر موت پڑتی ہے۔ اور Tenses سیکھتے ہوئے تو گویا بیہوش ہو ہو جاتی ہیں۔ کبھی میری کلاس میں آ ؤ تو دیکھو کہ گرامر کی کلاس میں پڑھاتے ہوئے اُن کے چہروں پر پھیلی بیزارگی، کوفت اور بار بار اسکا اظہار ''اُف یہ تو انتہائی بور ہیں'' جیسے جُملے سُننا میرا روز کا معمول ہے۔

سچی بات ہے کلاس میں اُن کی لمبی لمبی انگڑائیاں اور منہ کھول کر اُباسیاں لینے سے بھی میری جان جاتی ہے۔

آلا جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی وائس (Active Passive) اور نریشن (Direct and indirect) سکھاتے ہوئے میں کس عذاب سے گذرتی ہوں۔ تم اُس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔

میں زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ ارے آلا پرائی زبانیں سیکھنا کوئی خالہ جی کا گھر ہے۔ پکّی جماعت سے ہمارے ہاں انگریزی پڑھنے اور سیکھنے پر زور ہے۔ پر پھر بھی حالت وہی ہے کہ دھوبی کے کُتّے نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ آدھے تیتر آدھے بٹیر۔

پر ایک بات مجھے سمجھ نہیں آتی تھی۔ یہ بات میں نے اپنے دل میں نہیں رکھی۔ آلا سے کہہ ہی دی کہ

''آخر رُوسیوں کو وختہ کیا پڑا تھا حروف کو اُلٹا پُلٹا کرنے کا۔ اب B کی آواز V کی ہے۔

H پڑھنا ہوتو N کی آواز نکالو۔ P نے R کی ساؤنڈ دینی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال بقیہ حروف تہجی کا ہے۔ رُوسی رسم الخط کریلک اور لاطینی رسم الخط میں اگر مشرق و مغرب جیسا فرق نہیں تو مغرب اور مشرق وسطیٰ جتنا تو ضرور ہے۔''

آلا زور سے ہنسی تھی۔

''تم رُوسیوں کو کیا سمجھتی ہو؟ انہوں نے ہر معاملے میں اپنی انفرادیت قائم نہیں رکھنی۔ ہمارے تن و توش کو ہی دیکھ لو، کیا عورتیں اور کیا مرد کیسے گٹھے ہوئے مضبوط جسم و جان کے مالک ہیں۔''

ہاں البتہ آلا نے لمبی سانس بھری تھی۔

''اب نئی نسل مایوس کر رہی ہے۔''

کمپارٹمنٹ میں بڑا تھرموس ہاتھ میں پکڑے آئس کریم بیچنے والے لڑکے کی آمد ایک مانوس سے وطنی منظر کی شدومد سے یاددہانی تھی جو یقیناً اچھی لگی تھی پر نتاشا کی میزبانی سپرٹ نے اس سونے پر سہاگہ کا کام کر دیا تھا کہ فی الفور چاکلیٹ آئس کریم خرید کر ہمارے ہاتھوں میں تھما دی کہ چلو کھاؤ۔ چلتی گاڑی سے باہر کے نظارے دیکھو اور باتیں بھی کرتے جاؤ۔

بیرونی منظر وسیع و عریض جنگلوں کے تھے۔ کہیں کہیں عمارتوں کے سلسلے اُن میں ٹانکے لگاتے تھے۔ ہمیں نئے پیٹر ہاف اُترنا تھا آلا لوگوں کو پرانے اور ہمیں آگے سے پھر بس لینی تھی۔

پر ایک جملہ میرے لبوں سے پھسل گیا۔

''آلا کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ہمیں اپنے گھر لے چلیں۔ ایک عام رُوسی کا گھر دیکھنے کی شدید تمنا ہے۔''

آلا چپ سی ہوگئی، نتاشا نے اس کی طرف دیکھا دونوں رُوسی میں بات کرنے لگیں۔

مہرالنساء نے مجھے گھر کا۔

''نہ کل رات تم کوئی چینی جاپانیوں کے گھر میں تھی۔ وہ رُوسی گھر ہی تو تھا کوئی ہنس کر

بات کرے تو تم اُٹھ کر ساتھ چلنے کے لئے مچل جاتی ہو۔"

"چپکی بیٹھو دیکھو تو سہی۔" میں نے دھیمی آواز سے کہا۔

میرے خیال میں یقیناً نتاشا نے ہلہ شیری دی ہوگی۔

"گھر اتنے بڑے نہیں اتنے خوبصورت بھی نہیں" آلا مجسم معذرت تھی۔

"گھر تو آلا سے ہے اور آلا صورت کے ساتھ ساتھ دل کی بھی حسین ہے۔"

سچی دلداری سے بھرے میرے لفظوں نے آلا کو پگھلا کر رکھ دیا تھا۔

صنوبر اور چیڑ کے درختوں کے چھدرے جنگلوں میں مستطیل اور مربع نما عمارتوں کے بلند و بالا سلسلے تھے۔ پختہ سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی مختلف بلڈنگوں تک رسائی کا ذریعہ تھیں۔ آلا کا گھر تیسری منزل پر تھا۔ لفٹ تنگ اور کسی دمہ کے مریض کی طرح ہونکتی تھی۔

کھڑ کھڑ دھڑ دھڑ نے ذرا سا ہراساں تو کیا پر نتاشا اور آلا دونوں کی آنکھوں اور ہونٹوں پر بکھری تسلی نے سمجھایا کہ یہ تو اس کی پرانی عادت ہے۔ اگر کوئی وختہ ٹائپ حادثہ ہو جائے تو پھر ایمرجنسی بیل بجادی جاتی ہے۔

یہ کیمونزم دور کی عمارتیں تھیں جنہیں مالکانہ حقوق کے ساتھ لوگوں کو دے دیا گیا تھا۔ ہر بلڈنگ کا گرم پانی کا پلانٹ اپنا ہے۔ خستگی اور کہنہ سالی اُن کے چہرے مہروں اور اندر تک اُتری ہوئی ہے۔

گرے رنگ کی طرف مائل تازہ پینٹ شدہ اندر سے بند دروازہ آلا کے بیل بجانے اور کچھ بولنے پر فوراً ہی کھولا گیا۔ سفید نیلی رگوں سے پُر کمزور سے ہاتھ میں پکڑا دروازے کا پٹ تھامے ایک خزاں رسیدہ پھول کانچ کے بنٹے جیسی بھوری آنکھوں کو پوری طرح کھولے ہماری طرف متوجہ تھا۔ عام روسی بوڑھی عورتوں کے برعکس بے حد دُبلا پتلا اور سمارٹ سا وجود آلا کی ماں کا تھا۔

اُس کی بھوری آنکھوں میں اور نہ اُس کے پتلے باریک ہونٹوں پر ہمیں دیکھ کر کوئی

مسکراہٹ اُبھری تھی۔ دروازے کے ساتھ ریک تھا۔ کُرسی تھی، نتاشا نے کرسی پر بیٹھ کر جوتے اُتارے اور آلا نے کھڑے کھڑے، دونوں نے انہیں ریک میں سجا دیا۔ عام رُوسیوں کے ہاں جوتے اندر لے جانے کا کوئی رواج نہیں۔ ذرا اوپر کوٹ برساتی یا جرسی وغیرہ کے ٹانگنے کی جگہ تھی۔ ایک نے کوٹ لٹکایا۔ دوسری نے جرسی، ہم نے بھی سب کاموں میں ان کی تقلید کی اور ہلکے پھلکے ہو کر آگے بڑھے، برآمدے میں کارپٹ بچھا تھا، گیلری میں باہر کی سمت شیشے لگے تھے۔

دو کمروں کا یہ فلیٹ جس کا ڈرائنگ اور بیڈ روم 8x6 فٹ تھے، نتاشا کا گھر دوسرے بلاک میں ایسا ہی تھا، کمرے بھی کارپیڈ تھے، دیواریں کاغذ کے رنگین وال پیپروں سے بجی تھیں، یہ وال پیپر آلا نے خود لگایا تھا۔ ماڑے موٹے کاموں سے لیکر بڑے بڑے کام کرنے میں عورتیں خود کفیل ہیں۔

چھوٹے موٹے اوزاروں کی موجودگی بھی ہر گھر میں ضروری ہے۔ ڈرائنگ روم میں دیوان (بیڈ نما صوفہ) شوکیس دو کُرسیاں اور ٹی وی بمعہ ٹرالی موجود تھا۔ خواب گاہ میں عام سا بیڈ دھرا تھا، چھوٹے سے عقبی برآمدے میں دُھوپ کے رُخ دھرے گملوں میں چھوٹے چھوٹے کاسنی اور سفید مُسکراتے پھول اس سنسان اور ویران سے برآمدے اور گھر میں زندگی کا لطیف سا احساس بکھیر رہے تھے۔

چھوٹے سے کچن میں ضروریات زندگی کی چند چیزیں ہی الیکٹرونک تھیں۔ واشنگ مشین نہیں تھی۔ چھوٹی میز کے گرد چار کُرسیاں دھری تھیں۔

جب ہم نشست گاہ میں بیٹھے تھے، مہنگائی کا رونا تھا۔ معاشرے کے دو انتہاؤں بہت امیر اور بہت غریب میں بٹ جانے کا دُکھ تھا۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے، طبقاتی تقسیم کے پیدا ہونے اور معاشرے میں بے راہ روی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کا دُکھ آلا سے کہیں زیادہ اس کی ماں کو تھا۔ زبان سمجھ نہ آنے کے باوجود اُس کی آنکھوں سے، اُس کے چہرے کی بولتی سلوٹوں سے، اُس کے ہاتھوں کی سیمابی اور

اضطرابی لہر اؤ سبھوں میں اس کا عکس نظر آتا تھا۔ باتوں کی شاہراہ پر سرپٹ بھاگی جاتی تھی۔ آلا جب ترجمانی کرتی تھی اُس سے بھی اُس کے لقمے جاری رہتے تھے۔

''ارے جائیدادوں کیلئے لوگ پاگل نہیں تھے۔ اپنے کاروباروں کا بھی کوئی ہوکا نہیں تھا۔ ضروریات زندگی کی فراہمی یقینی اور ارزاں نرخوں پر تھی۔ راشن کارڈ سسٹم تھا، شراب پر بھی ایک حدتک پینے کی پابندی تھی۔ اس امر کے باوجود کہ واڈ کا رُوسیوں کی کمزوری ہے اور وہ شراب کے حد درجہ رسیا ہیں۔ یہ تھوڑی کہ جیسے آج کی نسل پب باروں کے سامنے بیٹھی بوتل پر بوتل چڑھائے چلی جاتی ہے۔ کوئی روک ٹوک اور پوچھنے والا نہیں۔

آلا کے لڑکے کا ذکر کیا ہوا، بابشکا (بوڑھی عورت) کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔

زندگی میں سکون تھا اگر بہت خوشحالی نہیں تھی تو بُہت غریبی بھی نہ تھی۔ ٹیکس ہلکے تھے۔ تیرے میرے گھروں کا معیارِ زندگی ایک جیسا تھا۔ اب جیسی ڈور نہیں لگی ہوئی تھی۔

دنیا کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ٹی وی کا ایک چینل جو دکھا دیا دیکھ لیا، جو سُنا دیا سن لیا سوویت قوم کیلئے کام ہوتا تھا۔ قوم کی عظمت کیلئے جان ماری جاتی تھی، افراتفری، آپو دھاپی مار دھاڑ کچھ نہیں تھا۔

میں نے آلا سے نئی نسل کے بارے میں پوچھا کہ اُس کی سوچ کیا ہے۔

آزادی کسے بُری لگتی ہے؟ بہر حال جبر تو تھا، منفی اور پلس پوائنٹ دونوں تھے، اور اب بھی دونوں ہیں۔

پھر ہم باتھ روم گئے منہ ہاتھ دھویا اور رخصت چاہی، پر آلا چھوٹے سے کچن میں گھسی میری بات پر پھدک کر باہر آئی۔

گھر میں جو دال دلیہ ہے، اسے تو آپ کو کھانا پڑے گا۔

متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے ہاں کھانا کمرے میں نہیں کچن میں کھایا جاتا ہے۔ میز پر چار باؤل سجے تھے۔ دو چار پڑے تھے جن میں پیاز اور کھیرے تیر رہے تھے۔ بڑے سے چینی کے

ڈونگے میں سوپ (گائے کا گوشت اور سبزیوں کا سوپ) اور پلیٹ میں چورنی خلیب (براؤن بریڈ) دھری تھی۔

سچی بات ہے، شرمندگی کا ہلکا سا غبار میرے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ گھر آنے کا مقصد تو ذرا گھر کے حال حلیے سے آشنائی کا تھا نہ کہ کھانے سے، اور جب اس کا دو تین بار اظہار میری زبان سے ہوا، آلا کے لہجے میں اگر محبت تھی تو وہیں صاف گوئی کی سچائی بھی تھی۔ جب اُس نے کہا تھا "یہ سب فرج میں تھا۔ نہ ہوتا تو تم لوگوں کو چائے پر ٹرخا دینا تھا۔"

یہ سادہ بے تکلفانہ سا ماحول تھا۔ چور آنکھوں سے اُن کے کھانے کے سٹائل کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

بھوکی تو وہ بھی تھیں اور ہم بھی۔ انہوں نے سلائس کو ہاتھ میں پکڑا۔ بائٹ لی اور چمچ سے سوپ کا گھونٹ بھرلیا۔ یہی کام ہم نے کیا، یہ بریڈ کتنے مزے کی تھی۔ سوپ تو بس ایویں سا ہی لگا۔ ابھی آلا نے اس میں تھوڑا سا اُبلے ہوئے میش شدہ آلوؤں کا آمیزہ بھی شامل کر دیا تھا۔

اور جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ جُڑے یہ سب کھاتے اور باتیں کرتے تھے۔ آلا نے کہا تھا۔ کبھی رُوسی بوڑھوں کی سوچ کم و بیش میری ماں جیسی ہی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھایا جا سکتا کہ دنیا ایک گلوبل ویلج بن گئی ہے اور دنیا سے کٹ کر کنوئیں کے مینڈک بن کر نہیں رہا جا سکتا۔ ذات کا شعور اور آگہی کا ادراک ہونا بہت ضروری ہے۔ معاشروں اور تہذیبوں پر اثر پذیری کے عمل کو بدلتے وقت اور حالات کے تحت روکا نہیں جا سکتا۔ تم نے دیکھا ہوگا، جابجا کام کرتی رُوسی عورت نک سک سے آراستہ بہترین لباس میں ملبوس کتنی ہشاش بشاش اور چاق و چوبند ہے۔ اُسے فیشن کی دنیا سے گہری دلچسپی ہے۔ میری خوابگاہ کا بیڈ میری ماں کے زمانے کا ہے۔ جب حکومت چار پانچ ڈیزائن کے بیڈ بنوا کر ہر فیملی کو بانٹ دیتی تھی۔ اب یہ ممکن ہی نہیں۔ وقت تو قلانچیں بھرتا آگے چلا گیا۔ لوگوں کے طور طریقوں کی تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ انہیں خوش دلی سے قبول کرنا وقت کا تقاضا ہے۔ کیپٹل ازم اور ماڈرن ازم کے اس سیلاب کے آگے کوئی بند

نہیں باندھ سکتا۔

زندگی کی گاڑی کو مُشکل سے گھسیٹنے کے باوجود آلا کی سوچیں کس درجہ مثبت تھیں۔ میں حیران تھی۔

اس بے حد ٹھنڈی ٹھار اور اجنبیوں کیلئے مہر سے عاری سرزمین پر میں نے آلا اور نتاشا کو دل کی دنیا کے اُس گوشے میں جا بیٹھایا جہاں اُس کے چند اور بھائی بند اجنبیوں پر اپنی مہربانیوں کے باعث بیٹھے تھے۔

باب

20

پیٹرہاف کا اَپر گارڈن • پیٹرز برگ یونیورسٹی کے طلبہ سے ایک مکالمہ

Пётерговски Верховный Парк

Диалоги С Студентом, Петерговское Универстета.

گاڑی اور پھر بس کے سفر نے پیٹر ہاف جب پہنچایا اُس وقت چار بج رہے تھے۔

یہ پیٹر ہاف کیا تھا؟ رُوس کے زاروں کی گرمائی رہائش گاہ، ونٹر پیلس سے جی بھر گیا تو دارالحکومت کے شمالی کنارے خلیج فن لینڈ کے ساحلوں پر محل چوباروں کا ایک جہان بنا دیا۔ باغوں، باغیچوں اور اُن میں موتی لٹاتے فواروں سے سجا دیا، یوں کہ پیٹرز برگ کی فن سے لبالب بھری آرٹ سے سجے وجود والی صراحی دار گردن کا وہ نیکلس بن گیا کہ جسے دیکھنا اور سراہنا ضروری ٹھہرا۔

آہنی سیاہ گرل والے بڑے سے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر جو منظر نظر آئے تھے۔ انہوں نے فوراً یہ بتا دیا تھا کہ یہ جائے مانند فردوس ہے اور تم اتنے تھوڑے سے وقت میں کیا دیکھو گی؟

دو رویہ درختوں، گھاس کے بڑے بڑے دلفریب قطعوں، ٹیولپ کے کاسنی اور سفید

پھولوں کی بچھی چادروں، فواروں، اُن میں کھڑے بیٹھے مجسموں، اُن کے دہانوں سے اُگلتی موتیوں کی پھواروں اور سامنے عظیم الشان عمارتوں کے لمبے چوڑے سلسلوں جنہیں رُک رُک کر دیکھنے اور حیرت زدہ ہونے کا عمل جاری تھا جب اُس انڈین جوڑے نے اجنبی فضا میں مانوسیت کا رنگ بکھیرا، یہ کہتے ہوئے۔

''ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ گریٹ پیلس اور عظیم آبشار لاجواب چیزیں ہیں۔''

اب متوجہ ہونے کی ضرورت تو تھی۔ سوفی الفور ہوئے۔ یہ زبان کی ہم آہنگی بھی کیا چیز ہے۔ سارے فاصلے آناً فاناً مٹاڈالتی ہے۔

دلّی سے آنے والے، شگفتلا چوپڑہ اور مکیش چوپڑہ درمیانی عمر کا ہنس مکھ سا جوڑا تھا۔ شگفتلا چنبیلی رنگت پر موٹے موٹے نقوش والی جاذبِ نظر دِکھنے والی خاتون تھی۔ خوش طبع، بات چیت میں سادہ، اس قدر خوبصورت ساڑھی زیب تن تھی کہ میری نگاہیں کپڑے کی چمک اور رنگوں کے حُسن میں پھنس گئی تھیں۔ مکیش چوپڑہ بیوی کی نسبت تیز اور خاصا زمانہ ساز انسان دِکھتا تھا۔ آنکھیں بولتی تھیں کہ بندہ سرد گرم چشیدہ ہے۔ دونوں بیٹے کے پاس ماسکو آئے تھے۔

مسز چوپڑہ نے بتایا پہلے تو چار پانچ بھانجے بھتیجے ماسکو میں ہی بزنس کرتے تھے اب وہ تو سارے یورپ کی طرف نکل گئے ہیں۔ بیٹا ابھی یہیں ہے وہ بھی اب یہاں سے اُڈاری مارنے کو ہے۔ بس روز فون کرتا تھا کہ میرے جانے سے پہلے چکر لگا جاؤ۔

اب رہنمائی کیلئے کتابوں کتابچوں کی بجائے اُن ہی کی طرف راغب ہوئے کہ جان لیں محدود وقت میں کیا صحیح طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ ٹکٹ کا طریقہ بھی سمجھا کہ ہر میٹیج والا قصہ دُہرانے کا قطعی پروگرام نہیں تھا۔

''باپ رے باپ مسز گپتا بولیں غیر ملکیوں کو تو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ پانچ سو روبل چار سو روبل ٹکٹ سے کم بات نہیں، ہاں اس وقت گریٹ پیلس دیکھ لو۔ چھ کے بعد پارکوں میں داخلہ مُفتے پر چلتا ہے۔''

پر اُن کا شکریہ ادا کرنے اور انہیں خُدا حافظ کہہ کر جب اپر گارڈن میں آگے بڑھے تو راستے میں بچھیاں ڈال ڈال کر روکنے والی بہت ساری چیزیں تھیں۔ مٹدوے فاؤنٹین میں کانسی کے ایک نہیں، دو نہیں، پورے پانچ مجسمے تھے۔ منہ سے دھڑا دھڑ پانی نکالتے ڈریگن اور ڈولفن بدصورت اور ڈروانے لگنے کے باوجود دیکھنے والی چیزیں تھیں۔ یہ اپر گارڈن کا پہلا فاؤنٹین تھا۔

جب چیزیں ایسی دل ربا قسم کی ہوں تو پھر وقت کی ساعتوں کو کون کافر دھیان میں رکھتا ہے۔ Neptune Fountain پر یہی ہوا تھا۔ حد درجہ پُرفسوں اور شاندار سمندروں کی مشہور تھیم کا عکاس۔

گرینائٹ کے اُونچے تین سٹیپ والے چبوترے پر کانسی کا داڑھی والا یونانی کردار نیپچون دیوتا اپنے ہاتھوں میں سہ شاخہ تیر کمان پکڑے پانیوں پر اپنی طاقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

نظریں ایک سے بمشکل اُٹھتیں اور دوسری پر جا رُکتی تھیں۔ ڈولفن، ڈریگن گھوڑوں کے مُنہ سے پانی کی پھواروں نے مماثلتوں کے تانے کہیں میرے بچپن سے جا جوڑے تھے۔ جب بھینس کے تھنوں کے نیچے بیٹھی میں ان ہی طرح بگھیاڑ سا منہ کھولے اپنی بھاوج کے ہاتھوں دودھ کی دھاریں کسی آبشار کی صورت اپنے حلق میں لیتی تھی۔ بس فرق صرف اندر کرنے اور باہر نکالنے کا تھا۔

گرینائٹ کے چبوترے پر بیٹھی لڑکیاں، مچھلی کے دھڑ والے لڑکے اور اپالو کا مجسمہ سب لاجواب شاہکار تھے۔

فواروں کے سامنے زردئی اور سفیدی مائل رنگوں کے امتزاج اور اپنے گنبدوں کو طلائی پیرہن پہنائے جو گرانڈیل عمارت نظر آتی تھی وہ بڑی شاندار تھی، چند لمحوں کیلئے بینچوں پر بیٹھ کر ہم نے کلارنٹ بجاتے موسیقاروں کو سُنا جو داخلی گذرگاہ کے دروازے پر کھڑے زور و شور سے سُریلی تانیں فضا میں بکھیر رہے تھے۔ سُرخی مائل زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر ہری گھاس کے کٹاؤ دار ڈیزائن، چبوتروں پر دھرے قد آدم سنگی مجسموں، درختوں کی قطاروں کے درمیان

بنے راستے کو بغور دیکھتے اور کبھی کبھی نگاہیں اٹھا کر پورے منظر کو دید کی گرفت میں لیتے ہوئے ہم نے خاصا وقت صرف کیا تھا۔

مُفتے کے چکر نے چکرا دیا تھا۔ رُوس کے آسمان کا سورج تو نزاکتوں کی پوٹلی ہے۔ ہر قدم اٹھانے سے پہلے بیسوؤں بار سوچتا ہے کہ آگے بڑھوں کہ پیچھے ہٹوں۔

مہرانساء بینچ پر ذرا سا ستانے کے لئے بیٹھی تو جیسے اُونگھتے کو ٹیلے کا بہانہ چاہیے تھا۔ غنودگی میں چلی گئی۔ میں بھی بیٹھ گئی اور کتابچہ کھول کر دیکھنے لگی۔

اپر گارڈن کے بارے میں پڑھتے ہوئے پتہ چلا تھا کہ آغاز میں پیلس میں داخلہ فن لینڈ گلف والے راستے سے ہوتا تھا۔ یہ بے چارہ توزاروں کی دال سالن کا سامان تھا کہ یہاں سبزیاں اور سلاد اُگایا جاتا تھا۔ تالابوں میں ماہی پروری ہوتی تھی اور مُرغیوں کے ڈربے تھے۔

''ہائے وے میریا ربا'' میں مرجاواں، ککڑیاں بھی تو اُگتی ہوں گی، پور جتنی موٹی اور بالشت بھر لمبی ویسی ہی صورت کی کہ جن کے لئے لکھنؤ کے بانکے ریڑھی والے شعر کہتے تھے۔

''لے لو کہ لیلیٰ کی اُنگلیاں ہیں۔'' شکر ہے ہانک لگانے والوں نے اُنگلیاں ہی کہا پسلیاں نہیں کہیں۔ چسکے خور زارینائیں (ملکائیں) تو لون مرچ کاغذ میں لپیٹ کر کھیتوں میں آجاتی ہوں گی۔ کرچ کرچ مزے لے لے کر کھاتی ہوں گی۔

ڈھیر سارا منہ میں آیا ہوا پانی حلق سے نیچے اُنڈیلا، ہنسی بھی آئی تھی کہ لوزارِیناؤں کو ککڑیاں لون مرچوں کے ساتھ کھلادیں۔ واہ بھئی واہ تخیل سازی ہو تو ایسی۔''

پر نہیں جی۔ اندر سے ڈٹ کر جواب آیا تھا۔

''بھئی وہ ملکائیں تھیں تو کیا ہوا؟ تھیں تو عورتیں نا۔ اور عورتیں چاہے ملکائیں ہوں یا فقیرنیاں وہ مائیں بھی ہوتی ہیں اور چٹوریاں بھی۔ بڑے دبدبے اور شان وشوکت والی کیتھرائن دی گریٹ کی سارسکایاسلو (Tsarskoye Selo) محل کے باغوں میں ایک تصویر عورت کی فطرت کی خوبصورت عکاسی کرتی سامنے آگئی تھی جہاں وہ زمین پر جھاڑو دیتے اپنے شاہی

لبادے اور خدام کی فوج کے باوجود اپنے بچے کے پیچھے بھاگ رہی ہے کہ وہ مرغابیوں کے تعاقب میں ہے اور نہر نزدیک ہے۔

پھر تازہ سبزیوں اور کُٹ کُٹ کرتی مرغیوں کے روسٹ کا سوچتی مجھے تو پتہ بھی نہ چلا کہ میں کب بنچ پر لم لیٹ ہوئی اور کب غنودگی کی دبیز لہر مجھے وقت کی اُس ٹنل میں لے گئی جب اپر گارڈن میں سبزیاں اُگتی تھیں۔ گنوں کے کھیت تھے اور چھلیاں بھی جو آلاؤ جلا کر بھونی جاتی تھیں۔

اور جب آنکھ کھلی اور اپنے آپ پر نظر پڑی تو عجیب سی ابتری اور کم مائیگی کا احساس محسوس ہوا۔

ہمیں ایسے سوتے دیکھ کر کسی نے ایک پل کیلئے شاید یہ کہا ہو۔

''شالا کوئی پردیسی نہ تھیوے۔'' لیکن اس خیال پر بے اختیار ہنسی آئی۔

''اب ایسی فینٹسی پیدا کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ پردیسی بننے کیلئے تمہارا بازو بیلنے میں نہیں آیا ہوا تھا۔ اپنے شوق سے خجل ہو رہی ہو۔''

چلو اچھا ہوا اندر کی اس تگڑی پھٹکار نے موڈ اور درست کر دیا، پر سونے نے بھوک کو شاید چمکا دیا تھا، پانی بھی ختم تھا اور مُفتے پر لعنت بھیجتے ہوئے کہ جہاں سو وہاں سوا سو، دفع کرو کل کا سارا دن یہاں گزرے گا۔

کنگھی پٹی درست کر کے جب اُٹھے تو قریب سے گزرنے والے تین لڑکے اچانک پاس آ کر رُک گئے۔

''کہاں سے ہیں؟'' کا استفسار ہوا۔ پاکستان کا جان کر بولے۔

''اوہو۔''

''اوہو۔'' انگریزی کے اس لفظ کی ادائیگی میں جو طنز اور تیزی تھی ابھی میں اُسے سمجھنے کے مرحلے میں ہی تھی کہ ایک اور وار ہوا۔

''اچھا امریکہ کا پُھو۔امریکہ، رُوس اور افغانستان وار کا تیسرا اہم کردار۔''

پل بھر کے لئے تو منہ میں جیسے گھنگنیاں سی ڈل گئیں۔لڑکے نے تو جیسے کچا چھا منہ پر دے مارا۔پھر ہوش آیا۔اور زبان گڑگراہٹ کے ساتھ پٹڑی پر چڑھ گئی۔

''لو جی یہ تو وہی بات ہوئی۔چورنا لے چتر۔ایک چڑھائیاں کیں۔پنگے لئے۔خود ذلیل ہوئے اوروں کو ذلیل کروایا۔قدرت نے دوسری سپر پاور کا تمغہ سر پر سجا رکھا تھا۔اُسے بھی سنبھالنا نہیں آیا۔منہ کے بل دھڑام سے گرے۔غریب ملکوں کی آس تھے۔اُمید تھے۔اُن کی آس اُمید توڑیں۔رُسوا کر دیا کم بختوں کی گرم پانیوں پر تصرف کی خواہشوں نے۔کبھی جاپان سے پنگے لیتے تھے۔کوریا تک پہنچنے کے آرزومند تھے۔پولینڈ کا تیاء پانچا کر دیا۔افغانستان کے ساتھ پاکستان کو بھی نشانے پر رکھ لیا۔منہ کی کھاتے ہیں پر بندے نہیں بنتے۔

افسوس طاقت کا سارا توازن خراب کر دیا۔اور بدمعاش کو دُنیا میں کھل کھیلنے کا موقع دے دیا۔

اور یہ ہم پاکستانی بھی نرے اُلو کے پٹھے ہیں۔احمق اور جذباتی۔سارے زمانے کے لائی لگ۔رہن رکھا ہوا ہے اپنے آپ کو۔اپنے حسابوں بڑے سُورما بنے پھرتے تھے کہ جہاد کر رہے ہیں۔افغانستان میں بڑے تیر مارے ہیں۔رُوسیوں اور کمیونزم کے آگے بند باندھ دیئے ہیں۔پر ہوا کیا۔پرائی لڑائی اپنے گھر ڈال لی۔اپنا خانہ خراب کر لیا۔

لڑکے تو سچی بات ہے میں نے بولنے جوگے نہیں چھوڑے تھے۔اب وہ ذرا پرے بینچ پر بیٹھ گئے۔میرے پوچھنے پر کہ وہ کیا کرتے ہیں۔وہی تیز سالڑکا بولا تھا۔

''پیٹرزبرگ یونیورسٹی میں سیاست پڑھتے ہیں۔''

''ارے سیاست پڑھتے ہو اور بونگیاں مارتے ہو۔اور جانتے ہی نہیں ہو کہ تمہاری احمق سیاسی قیادت اور ٹاپ دفاعی وزارت نے مروا دیا۔ملک کی ہیت بگاڑ کر رکھ دی۔اب اگر 24 دسمبر 1979ء کی اُس سرد ترین شام کو روسی وزیر دفاع دمتری استینوف اپنے نائب پاؤلوسکی کی

بات دھیان سے سن لیتا۔ چند لمحوں کے لئے اس اَمر پر غور کر لیتا کہ وہ آخر افغانستان سے آ رہا تھا اور اس بات پر مُصر تھا کہ افغانستان میں فوج بھیجنا مناسب نہیں۔ اور جب وہ بار بار کہتا تھا کہ پولٹ بیورو کے کسی ممبر کی ڈیوٹی لگائی جائے کہ وہ حفیظ اللہ امین سے ملے۔ حفیظ اللہ نے برژنیف کے لئے خصوصی پیغام بھیجا ہے۔ تو حرج ہی کیا تھا کہ اس پر غور و غوض ہو جاتا۔

پر تاریخ کا جبر یہی ہے کہ جب تباہیاں سر پر کوکتی ہیں تو پھر فیصلے غلط ہوتے ہیں اور عقلیں ماری جاتی ہیں۔ پاؤلوسکی کی تو کسی بات کو سُنا ہی نہیں گیا۔"

اورلڑکے میرا منہ دیکھتے تھے۔ یقیناً انہیں اس پاکستانی عورت سے ایسے جارحانہ جوابوں کی توقع نہیں تھی۔

واپسی پر پہلے بس میں چڑھے۔ پھر میٹرو میں چڑھے اور پھر تین مسلمان ازبک عورتوں کے ہتھے چڑھے۔ جن سے بس ذرا سا راستہ پوچھنے کے چور ضرور ہوئے۔ دو عورتوں اور ایک بچی نے فی الفور مورچے سنبھال ہمیں اپنی حفاظتی حصار میں یوں لیا کہ نہ صرف ہوٹل کی قریبی جگہ تک پہنچایا بلکہ درجن بھر پیروشکی اور رشین سلاد بھی خرید کر بعد اصرار ہمارے پلے باندھا اور پنجابی زبان کی اس کہاوت کو کہ اُنے بھکّے نوں ٹکروی کھواؤ تے کرھ نوں وی چھڈ کے آؤ (یعنی اندھے بھوکے کو کھانا بھی کھلاؤ اور گھر بھی چھوڑ کر آؤ) عملاً سچ ثابت کیا تھا۔

باب
21

سینٹ پیٹرز برگ کا موتی پیٹر ہاف • میخائل ویزالیوچ سے ملاقات • کٹھی میٹھی باتیں

Жемчут Петербурга Петерхаф
Вестреча Мехал Везааовичам.

Peter hof is the Russia's answer to versailles. میں نے فرانس کے لوئی پائنز دھم کا ورسائی محل نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے میرے لئے تقابل کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ہاں البتہ رُوسیوں کے ہاں جس اعتماد کا اظہار تھا وہ یقیناً حقیقت سے لگا کھاتا ہوگا۔

پر جب گریٹ پیلس میں داخلہ ہوا اور مرکزی زینے پر قدم رکھے۔ بھونچکی سی ہو کر میں نے چاروں طرف دیکھا اور دھپ سے سیڑھیوں کے اٹھارویں پوڈے پر بیٹھ گئی۔ ونٹر پیلس کی خوبصورتیاں تو اس کے آگے پانی بھرتی تھیں۔

یہ سات فٹا پیٹر اعظم کیا شے تھا۔ ایک غیر معمولی طاقتور، فطین، ہٹیلا، سرکش، کھیڈن کو مانگے چاند جیسی خواہش سر میں سمائے تو آسمان سے توڑ کر اپنے سامنے ڈھیر کر لے۔ پہلے شہر بسایا اُسے محلوں پارکوں سے سجایا۔ اور پھر پیٹر ہاف بنا کر اس میں تارے ٹانک دیئے۔

ایک ہزار ایکڑ کے رقبے پر پھیلا، تیس مختلف ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت عمارتوں،

تقریباً ڈیڑھ سو مجسموں اور سو سے زیادہ فواروں پر مشتمل اس محل کا مجھ جیسی نے تقابلی جائزہ لینا تھا فرانسیسی محل ورسائی سے۔

''واہ میاں واہ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ'' مجھے تو اپنی اس اتنی بڑی جسارت پر اُس وقت ہنسی آ رہی تھی جو نظارے کے پہلے مرحلے میں ہی چاروں شانے چت پڑی تھی۔

ابھی تو حُسن جنگ عظیم دوم میں نازیوں کے ہاتھوں بیدردی سے تاراج ہوا تھا۔ اندر داخلے سے قبل اس کی ڈھیروں ڈھیر تصویروں کی نمائش لئے پڑے کسی ایسے گلفام شہزادے کی طرح نظر آئی تھیں۔ جو بیچارہ جنسیت کے مارے مردم مار قسم کے خبیث لوگوں کے ہاتھوں گینگ ریپ کا شکار ہو کر اُدھڑا پُدھڑا پڑا ہو۔

''کمبخت مرنے جوگوں نے مجال ہے جو سونے کی ایک رتی بھی اسکے تن پر رہنے دی۔ نوچ کھسوٹ کر سب لے گئے۔ پر تن جگرا تھا کمیونسٹ حکومت کا۔ جنگ نے ابھی دہلیز ہی خالی کی تھی کہ انہوں نے آ گا دیکھا نہ پچھا خزانوں کے منہ کھول دیئے اور قومی ورثے کو پیٹر اول کے خاکوں اور ڈرائنگوں کی مدد سے وہی توپ شے پھر بنا دیا۔

اور جو ان کی جگہ کہیں ہمارے حکمران ہوتے تو بس اس وقت یہ سب سامان عبرت بنا ہوا ہوتا کہ ہم نے قومی ورثے اُجاڑنے سیکھے ہیں۔ سنوارنے نہیں۔

ایک تو میں اپنی اس وطنی جذباتیت کے ہاتھوں ناکوں ناک آئی پڑی ہوں۔ بس جہاں کہیں کسی کی کوئی اچھی چیز دیکھی ہائیڈ وکلورک سلفائڈ میں ڈوبی سڑاند مارتی آہیں کلیجے سے نکلنی شروع ہو گئیں۔ اللہ یہ سب میرے دیس میں کیوں نہیں۔ حکمرانوں اور لوگوں ایک ایک کا سیاپا کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ لاکھ خود کو سمجھاؤں کہ قوموں کی زندگی میں اکسٹھ 61 سال تو جیسے آٹے میں نمک، اُونٹ کے منہ میں زیرے والی بات ہے۔ پر یہ دیوانہ دل کچھ سمجھے بھی۔

سنہری بیلوں سے سجے چبوتروں پر کھڑے طلائی نسوانی مجسموں، اُن کے دلربایانہ انداز، کہیں موسموں کی نمائندگی، کہیں اساطیری کہانیوں کے کرداروں کا رُوپ، طرز تعمیر کے بارِوق

سٹائل کی سنہری گل کاریوں سے سجی دیواریں اور کھڑکیوں کی محرابیں بلند و بالا وسیع وعریض چھت، مصوری کے حُسن، فن کے شاہکار سب رنگ و نور کے بہتے سیلاب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اب میرے ڈوبنے کی باری تھی اور میں ڈوب رہی تھی۔

پانچ ہزار سپاہیوں غلاموں اور قیدیوں نے پندرہ سال شب و روز اپنے خون جگر سے اس کی صورت گری کی۔ اسے حُسن و رعنائی بخشی۔ پیٹر ہاف کی باقاعدہ نقاب کشائی پندرہ اگست 1723ء کو ہوئی۔

گریٹ پیلس سب سے اہم اور مرکزی عمارت ہے پر میں اُسے دیکھنے کی بجائے Throne رُوم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

سُرخ چبوترے پر دھری طلائی پایوں والی کرسی کی پشت پر کیتھرائن اول پیٹر اعظم کے دل کی ملکہ گھوڑے پر سوار نظر آتی ہے۔ ویجی لیٹس کا شاہکار۔ کیتھرائن پیٹر کا پیار تھا۔ اُس کی محبت تھی۔ وہ اُس کی محبوبہ تھی۔ عام سے لیتھونین (Lithunian) کسان کی بیٹی جو مقدر کی ملکہ تھی۔ رُوس نے 1702ء میں میرئین برگ (Marien burg) پر قبضہ کیا۔ یہ جنگی قیدیوں کے طور پر فوج کے ہاتھ لگی۔ دراز قامت انتہائی حُسن و جمال کی مالک، خود اعتماد اور حاضر جواب لڑکی کا نام مارتھا تھا۔ تیز طرار اس لڑکی کو پیٹر دی گریٹ کے دستِ راست الیگزینڈر فیشکو و کے حوالے کر دیا گیا۔

کہیں پیٹر نے اُسے دیکھا تو جی جان سے عاشق ہو گیا۔ محبت کا کچھ یہ حال ہوا کہ روز اُسے خط لکھتا، اور جواب لیتا۔ ملاقاتیں بھی کرنے لگا۔ بچہ ٹھہر گیا۔ بچے کی پیدائش کے بعد اُسے آرتھوڈکس چرچ لایا گیا۔ دوبارہ عیسائی کرنے کے بعد کیتھرائن الیکسو نا (Alekseyvna) کا نام تجویز ہوا۔

دلیر اور بہادر عورت تھی۔ ذہین اور سمجھ دار تھی۔ جانتی تھی کہ اُس کے کمزور پہلو کون سے ہیں۔ اُس کے غصّے کو کیسے کنٹرول کرنا ہے۔ ہر کڑے وقت اُس کے ساتھ رہتی حتیٰ کہ تُرکوں کی

جانب سے ایک یلغار کے دوران انتہائی عقلمندی سے اُس نے پیٹر اور رُوسی سلطنت کو بچایا۔ گیارہ بچوں کو جنم دیا جن میں سے صرف دو لڑکیاں بچیں۔

رُوسی تاریخ کی وہ پہلی حکمران خاتون تھی جس نے آئینی راستے کھولے۔ اکیڈمی آف سائنسز کی تعمیر و ترقی کے لئے پیٹر کے کام کو جاری رکھا۔ سپریم پرایوی کونسل کا اجرا کیا جو امور مملکت چلانے میں اُس کی مدد کرتی۔ پیٹر کی موت کے بعد وہ صرف دو سال زندہ رہی۔ کل تنتالیس سالہ زندگی۔

اسی دیوار پر مصور نے دائیں بائیں دونوں بیٹیوں ایلزبتھ پیٹروونہ (Petrovna) اور اینا ایونونہ (Avanovna) کو ان کے بھاری بھرکم شاہی لبادوں میں متحرک کر رکھا تھا۔ کرسی خالی تھی۔ کبھی اس پر پیٹر دی گریٹ بیٹھتا ہوگا۔ اب تو میرا جی بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔

دروازے اگلے کمروں کی طرف کھلتے تھے اور آگے بال روم تھا۔ پُورم پور سونے میں ڈوبا ہوا۔ ہائے ری میّا اتنا سونا۔ زبان تو جیسے بے اختیار ہی پھٹ پڑی تھی۔

میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

لامحدود وسعت کا تاثر دیتی مختلف شکلوں اور سائزوں کی شیشے اور طلائی منبت کاری سے مزیّن دروازے کھڑکیاں اور ان سے اندر آتی سورج کی کرنیں ڈیزائن دار چوبی فرش پر اُوپر تلے کی کھڑکیوں کے پورے عکس یوں منعکس کر رہی تھیں کہ جیسے یہ رواں شفاف پانیوں میں غوطہ زن ہیں۔

طویل چھت بھی آرٹسٹوں کی فنکاری کی کہانی سناتی تھی۔

گردن کو دہرا کر کے کتنی دیر تک یہ کہانی سنتی، بیچاری تھک گئی تھی پر آنکھیں تھیں کہ ہل من مزید کی ہوس میں لتھڑی پڑی تھیں۔ مجھے غصہ بھی آیا اور میں نے پھٹکار بھی دی کہ اب تم چاہتی ہو میں تمہاری اس خواہش کو پورا کرتے کرتے بیچاری کا منکا تڑوا لوں، بس کرو اب۔

دفعتاً اس آئینہ خانے سے ایک ایسا منظر دید میں آیا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی

بہشت بریں کا ٹوٹا دیکھ رہی ہوں۔ پاؤں تو جہاں کھڑی تھی وہاں جیسے چپک ہی گئے تھے۔
لوئر پارک (Nizhniy) اور اپر گارڈن (Verkhniy) دونوں اپنے رنگ ڈھنگ کے اعتبار سے فردوس بریں کی دودھیا نہروں، موتی اُچھالتے فواروں، باغوں اور حوروں جیسی تمثیلاتی تصوراتی کہانیوں سے کتنی زبردست مماثلت رکھتے نظر آئے تھے۔ گم سم کھڑی دیر تک اس منظر میں کھوئی رہی۔

گریٹ پیلس کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جانے سے قبل میں پیٹر دی گریٹ کا ذاتی کمرہ دیکھنے کی خواشمند تھی۔

کمروں، ملحقہ راہداریوں پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے قدموں کی تیزی کے ساتھ ساتھ دماغ کی پوٹلی سے رات کا پڑھا ہوا مواد باہر آنے لگ گیا تھا۔

قد و قامت بھی غیر معمولی تھی اور صلاحیتیں بھی۔ پر زار بننے کے لئے اُس کا نام زیرِ غور نہیں تھا۔ شاید اسی لئے رائل فیملی نے اُس کی تربیت میں اُن طور طریقوں کا قطعی خیال نہ کیا جو جانشین زار کیلئے وضع تھے۔ ماسکو میں اُس کا زیادہ وقت غیر ملکیوں خاص طور پر اطالویوں کے ساتھ گذرا۔

آغاز میں اُس نے جنگ لڑنے اور جیتنے کا آرٹ سیکھا اور زار بننے کے بعد اُس نے یورپ جا کر بے شمار علوم میں مہارت حاصل کی۔ یہ کسی رُوسی زار کیلئے پہلا واقعہ تھا واپس آ کر اُس کا پہلا کڑا وار آرتھوڈکس چرچوں پر پڑا۔ چرچوں کی گھنٹیاں پگھلا کر توپیں بنوائیں۔ انہیں قومی تحویل میں لینے کے ساتھ اُس نے داڑھیوں پر پابندی لگائی۔

''ان داڑھیوں کے ساتھ یقیناً کوئی مسئلہ ہے۔ شاید لوگ آپے میں نہیں رہتے۔'' رات پڑھتے ہوئے مجھے بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

رُوسی قوم کو حروف ابجد، قانون، زبردست بحری اور برّی قوت، زرعی شعبوں کو ماڈرن ازم اور بھاری صنعتوں کا تحفہ دیا۔

ٹیکسوں کا نظام وضع کیا اور دنیا بھر سے ماہرین کو بُلا کر بالٹک کے کناروں پر نئے شہر کی بنیاد رکھی جو اُس نے سویڈن سے جنگ میں جیتی تھی۔ وہ اسے جدید روس کا ایک ماڈرن شہر بنانے کا آرزومند تھا۔ مشرقی رجحانات سے اُس نے اپنی فوج اور قوم کو مغربی ترقی پذیر سانچوں میں ڈھالنے کی سرتوڑ کوشش کی۔

لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ وہ کیسا انسان تھا۔ بے رحم، ظالم، اپنے اکلوتے بیٹے الیکسی کا قاتل۔ شاید اس کی وجہ الیکسی کی وہ سرگرمیاں تھیں جو وہ اپنے باپ کی اصلاحات کے خلاف کرتا رہتا تھا۔ یقیناً شہنشاہیت کے لئے پتھر کے کلیجے کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تاہم وہ تاریخ رُوس کا طاقتور ترین اور زبردست زار تھا۔

میں اُس کے ذاتی کمرے میں کھڑی ہوں۔ میری نظریں اُس کے دلکش پورٹریٹ پر جمی ہوئی ہیں۔ ایک تو اس کی گھائل کرنے والی شخصیت، اُوپر سے رُوسی ملٹری یونیفارم کی دلکشی۔ اب بندہ لاکھ جوان نہ رہے دل تو جوان رہتا ہے۔ تو پھر دیر تک اُسے دیکھتے رہنے سے نہ تو وقت بیتنے کا احساس ہوا اور نہ ہی یہ کہ میرے پاس وقت کی کمی ہے۔

کمرے کی زیبائش زیادہ تر شاہ بلوط کی لکڑی سے ہوئی ہے۔

میز پر پڑا وا لا قلم، کتابیں، گھڑی، قلم، دوات سجے ہیں۔ یہ اُس کی مختلف النوع سرگرمیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ مطالعہ، آرام، ملاقاتیں، ریاستی امور پر بحث مباحثے سب یہیں ہوتے تھے۔

پھر میں گریٹ آبشار کے سامنے گریٹ پیلس کے اونچے ٹیرس پر کھڑی اردگرد پھیلی رنگینوں کو دیکھتی تھی۔ اور اپنے آپ سے کہتی تھی۔ ''یہ تو فواروں کا شہر ہے۔'' مختلف ٹیرسوں پر جن کے لئے پانی کی فراہمی کا بہت مربوط سسٹم بنایا گیا تھا۔

رنگ رنگیلی دُنیا کے رنگ رنگیلے لوگ تعمیراتی حسن کے بے مثال اور بے نظیر نمونوں پر بکھرے موج مستیاں کرتے تھے۔ مہرانساء بھی کہیں اسی ہجوم میں ہوگی۔ لوئر پارک کی انٹرنس

رمپ پر چلتے ہوئے مجھے درختوں کے سُرخ اور ہرے رنگوں نے روک لیا تھا۔

یہ شاندار آبشار لوئر پارک کو دو حصوں مشرقی اور مغربی میں تقسیم کرتی ہے اور ہر حصہ آگے اپنی اپنی چھوٹی آبشاروں میں منقسم ہے۔

میں مرکزی آبشار کے سینے میں اُتر آئی تھی۔ اور صورت اس مصرعے کی غماز ہو گئی تھی۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کُھل گیا

اب فردوس تو جانے نصیب میں دیکھنی لکھی ہے یا نہیں۔ پر بہشت بریں کا یہ ٹکڑا جو میرے سامنے تھا۔ میں اُسے دیکھتی اور اس کی غزل خوانی کو سُنتی تھی۔

اس عظیم اور شاندار آبشار کے مجسمے کہیں نہ کہیں علامتی استعاروں کی صورت میں سیاحوں کو رُوس کی بری بحری فوج کی طاقت و عظمت کی داستان سُناتے ہیں۔ آبشار کا ماسٹر پیس سیمسن کا فوارہ ہے جہاں سونے میں ڈھلا سیمسن کا فولادی جسم اپنے آہنی ہاتھوں سے شیر کا منہ کھول کر اُس کا جبڑا چیر رہا ہے۔ Mikhail koz lovsky اپنا یہ شاہکار رُوسی افواج کو خراج تحسین کیلئے پیش کرتا ہے۔

سچ تو یہ تھا کہ جب میں آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر اس منظر کو بار بار دیکھتی تھی تو مجھے وسیع کینوس پر پھیلا یہ ایک مصور کا انتہائے کمال نظر آتا تھا۔ گریٹ پیلس کی شاندار طویل عمارت پس منظر میں کھڑی کسی دل کش بیل تختی کی طرح دِکھتی تھی۔ اطراف میں صنوبر اور شاہ بلوط کے قد آور گہرے سرسبز درخت رکھوالوں کی مانند ایستادہ تھے۔ ٹیرس پر چلتے پھرتے، اُس کی ریلنگ پر جھکے، نیچے جھانکتے، رمپ پر بھاگتے دوڑتے، لوئر پارک کے سرسبز قطعوں کے درمیان مست خرامیاں کرتے، خدائے لم یزل کی تخلیق کے نمائندے رواں دواں تھے۔ پیٹر ہاف کے فوارے ہائیڈرو الیکٹرک انجینئرنگ کا زبردست شاہکار ہیں۔

یہ فن اور فنکاری کی دُنیا تھی۔ یہاں پانیوں اور اُن سے بننے والے موتیوں کے نظارے

تھے۔ یہاں اُچھلتے کودتے کچھ کہتے۔ کچھ کرتے مجسموں کی کہانیاں تھیں۔ یہاں باغوں کی رعنائی اور درختوں کی زیبائی تھی۔ کیا کچھ نہیں تھا یہاں۔

مجھے اب کہیں اور جانا تھا۔

لیکن سیمسن کینال اور فن لینڈ گلف کو دیکھے بغیر میں آگے کیسے جا سکتی تھی؟ اُٹھنے سے قبل میں نے بیگ کو کھولا اور دہی کا چھوٹا ڈبہ نکالا۔ ناشتے میں ملنے والا دہی جو صبح کی بجائے اس وقت نوش جان ہوتا تھا۔

Naiad Nymph زیورس کی پائیوں میں رہنے والی جل پری، اُس کی بیٹیوں کو سنگی چبوترے پر بیٹھے پانی کی پچکاریاں مارتے دیکھتے اور گھونٹ گھونٹ دہی پیتے، اپنی طبیعت کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے خود کو پھنکار رہی تھی کہ خیر سے جناب نے کیا مزاج پایا ہے۔ سُر ہی نہیں رلتا کسی سے۔ پر وہ کمبخت میرا نساء بھی تو ایسی ہی ہے۔ اپنی مرضی کی مالک۔ آپ پھدری۔ میری طرح آوارہ گرد، گواچی گاں کی طرح اکیلے ہی ادھر اُدھر منہ مارنے کی عادی۔

سچی بات ہے اس منہ ماری میں مجھ سے پھر بھی بیچاری دو ہاتھ پیچھے ہی ہے۔ میں تو بالکل شتر بے مہار ہوں۔ جی میں آئے تو چُنی سر پر رکھی۔ پاؤں میں موجے پہنے اور سینما دیکھنے چل پڑی۔ زندگی میں ایک بار میاں کے ساتھ واک پر جانے کی چور ہوئی راستے میں ہی کسی بات پر وہ تُو تُو میں میں ہوئی کہ میاں کہیں اور میں کہیں۔

چلو یہ بھی مقام شکر کہ اجنبی ملکوں میں آنے کیلئے جب اور جس وقت صدا لگاؤ۔ جواب ملے گا۔ حاضر سائیں۔ حکم۔ کب کوچ کرنا ہے؟

گرینڈ کینال یا سیمسن کینال کے ساتھ ساتھ چلنا، چھوٹے فواروں سے نکلتی بلند و بالا آبشاروں کو دیکھ دیکھ کر نہال اور درختوں کی تازگی سے مسرور ہوتے جانا بھی کیسی روحانی آسودگی تھی۔

دونوں تجربے مسرور کن تھے۔ ایک چھوٹی چیز کو اپنے جز کے ساتھ کُل میں جذب ہوتے

اور گل کو اپنے تناظر میں لامحدود وسعتوں میں پھیلے دیکھنا۔ اس وقت جب آسمان اپنی بھرپور نیلاہٹوں کے ساتھ چمکتا تھا اور نیچے پُرسکون بہتا تاحد نظر پھیلا نیلگوں سبزی مائل پانیوں کا سلسلہ بارعب اور پُر ہیبت سے منظروں کو تخلیق کرتا تھا۔

شاہ بلوط اور صنوبر کے درختوں کی ٹہنیاں ہواؤں کے زور سے ہلارے کھاتی تھیں۔ میں نے بیگ میں سے پیروشکی کا ملیدہ بنا سموسہ نکال کر کھایا، پانی پیا۔ اور جب میں ییمسن کینال کے پانیوں کو پتھروں سے ٹکراتے، شور مچاتے، گنگناتے سنتی تھی۔ میری اُس سے ملاقات ہوئی۔ وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑا فن لینڈ کے پانیوں کو دیکھتا تھا۔ گوراچٹا، اُونچا لمبا، موٹا تازہ، جس نے بڑی شستگی سے میرے پاس آ کر مجھ سے میری وطنیت کا سوال کیا تھا۔

حیرت و مسرت سے میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اُسے دیکھا اور اُس کا سوال اُسی کو لوٹا دیا۔

''میں تو رُوسی ہوں۔'' وہ ہنسا۔

''ارے تو اُردو اتنا خوبصورت بولتے ہو۔ میں تو اندازوں میں ہی اُلجھ رہی تھی کہ شمالی ہند سے تعلق ہے، پاکستانی، پنجابی یا افغان ہو۔''

''اُردو۔'' مسکراہٹ اُس کے چہرے پر دُھوپ کی طرح بکھری ہوئی تھی جس میں اُس کا ہر نقش نہار رہا تھا۔

''مجھے فارسی اور عربی پر بھی عبور ہے۔ پنجابی سے بھی تھوڑی سی آشنائی ہے۔ میرے بہت سال کراچی میں گذرے۔ مشرق وسطیٰ کے مختلف شہروں میں رہا۔ آج کل دبئی میں ہوں۔ آخری زار فیملی کا قریبی رشتے دار بھی ہوں۔''

یہ میخائل ویزالیوچ تھا۔

بڑی دلچسپ شخصیت تھی۔ چھوٹتے ہی مجھ سے رائے طلب کرنے لگا۔ اُس وقت میں پیٹر ہاف کے تحیر اور اُس کے سحر میں گم تھی۔ اس لئے احمقوں کی طرح بول پڑی۔

''یہ شبستانِ حرم، یہ عشرت گاہیں، ظلم و جبر چیخوں اور کراہوں پر اُٹھائیں ان کی۔ کیا بولوں؟ کیا نہ بولوں۔''

زبردست قہقہہ گونجا تھا وہاں۔ بہت خوب۔

''خدا کے لئے اِس خود ساختہ قسم کی مظلومیت کو اتنا فنٹاسٹک رنگ مت دیجیے۔

زار کھا پی گئے۔ پھولوں کی سیج پر سوئے یا کانٹوں کے بستروں پر۔ بات سادہ سی ہے کہ جن پر ظلم کئے۔ اُن کی ہی آل اولادوں کے لئے روزی کا سامان چھوڑ گئے۔ اُن کی اپنی نسلیں تو ذبح ہو گئیں، سان پر چڑھ گئیں یا بھاگ بھاگئیں۔ ذرا اندازہ تو لگائیے اِن عشرت کدوں کا جن میں سے بہت سے میوزیم بنے ہوئے ہیں۔ جہاں چپے چپے پر موجود اُدھیڑ عمر، بوڑھی، جوان، دیہاتی، شہری عورتیں اور مرد رزق روٹی کماتے ہیں۔ خزانوں میں دھڑا دھڑ روبل جمع ہوتے ہیں۔ عقل آ گئی ہے انہیں۔ کھول رہے ہیں دُنیا پر اپنے دروازے۔

کچھ محل ٹریننگ سینٹرز میں تبدیل ہو گئے ہیں جہاں عام آدمی کے بچے کی کسی نہ کسی شعبے میں تربیت ہوتی ہے کہیں لائبریریاں بن کر علم کے قیمتی اثاثوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔

اور آپ بھی دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ یہ محل مینارے نہ ہوتے تو آتیں یہاں۔ چھجو کے چوبارے کے لئے کون پینڈے مارتا ہے۔ وہ تو ماڑا موٹا آپ کا بھی اپنا ہوگا۔''

میں تو یکی بات ہے۔ دل کھول کر ہنسی تھی۔ یہ رُخ تو مانو جیسے آنکھ اوجھل دماغ اوجھل تھا۔

کوئی ساتھ ہے یا اکیلے۔۔۔ ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اُس نے درمیان سے ہی اُچک لی۔ آپ نے بچپن یا نوعمری میں کبھی محبت کی؟ وہ میری طرف متوجہ تھا اور میں اِس عجیب اور بے ہودہ سے سوال پر ٹپٹا سی گئی۔

''میں جانتا ہوں۔ آپ جواب نہیں دیں گی اور دیں گی تو انکار کریں گی۔ پاکستانی خواتین کی ذہنیت کا مجھے خاصا تجربہ ہے۔''

مجھے غصہ آیا۔ عجیب آدمی ہے۔ کیسے بے تکے سوال کرتا اور خود ہی جواب دیئے جا رہا ہے۔

میری اس گومگو اور عجیب سی کیفیت کو اُس نے یقیناً محسوس کیا تھا۔ فوراً وضاحتی بیان شروع کر دیا۔ سوال کا مُدّعا تو بس اتنا سا تھا کہ مخاطب آدمی اگر کسی ایسی واردات سے گذرا ہو تو دوسرے کے جذبات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

پیٹرز برگ میری اولین محبت کا امین شہر ہے۔ اس کی قابل ذکر جگہیں، اس کی گلیاں، اس کے محلے، اس کے بازار، کونسی جگہ ایسی ہے جہاں میں اُس کے ساتھ نہیں گھوما تھا۔ اُس کا سحر میری یادوں میں ہمیشہ جھلملاتا ہے۔ اور یہ پیٹر ہاف جس کے چپے چپے پر میری یادیں دفن ہیں۔ آج انہیں زندہ کرنے آیا ہوں۔

میں ورونیژ کے ایک گاؤں سے ہوں۔ ماسکو سے کوئی دو سو میل دُور کا ایک شہر۔

پیٹرز برگ کی ملٹری اکیڈمی میں پڑھنے کے لئے آیا تھا۔ بس تو یہیں یُورال کے پہاڑوں سے اُتر کر آنے والی اُس شاہزادی سے میری ملاقات ہوئی۔

''کب کی بات ہے؟'' میں نے پوچھا تھا۔

پچیس سال ہوتے ہیں۔ میں اُس وقت کوئی بیس سال کا تھا۔

انسان زندگی کے جھمیلوں میں جتنا بھی اُلجھ جائے۔ جتنی چاہے دولت کما لے۔ دُنیا گھوم آئے۔ مگر جب کبھی وقت اُسے اُس جگہ لے آئے تو پھر وہ اُنہی جگہوں پر اپنی نوسٹلجیائی حسیات کو تسکین دینے کے لئے ضرور جاتا ہے۔

میں پیٹرز برگ میں چھ سے آٹھ جون تک منعقد ہونے والے ورلڈ اکنامک فورم رشیاCEO میں شرکت کے لئے آیا ہوں۔ وقت نکال کر اُن یادوں سے ملنے کے لئے بھاگا ہوں۔

''شادی وادی نہیں کی تھی اُس سے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو مرگئی۔ بچہ ٹھہر گیا تھا۔ اُسے ضائع کروانے لگے۔ بس اسی میں کام خراب ہوگیا۔

کتنی جلدی کہانی ہی ختم کردی تم نے تو۔ میں نے تاسف سے کہا۔ چند لمحے خاموشی میں گذرے۔

''کمیونسٹ دور کو کس نظر کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟''

ذاتی حوالے سے بدترین۔قومی حوالے سے بہتر۔ سچی بات ہے۔ میں نے اُس عروج کو نہیں دیکھا نہ اُس طرزِ زندگی کو جو میرے پردادوں کی تھی۔ بس صرف سننے کی حد تک جانتا ہوں۔ ورونیژ کے قصبے نواژیوتیننے میں میرے آباء کا گھر ''کولاک'' کہلاتا تھا۔اب کولاک کی شان وشوکت کا کیا بتاؤں کہ دریا کے اُونچے کنارے پر لائم اور بید مجنوں کے درختوں میں گھرا پختہ محل نما گھر جس کی چھت لوہے کی مضبوط چادروں سے ڈھنپی ہوئی، چوبی بھاری کنڈیوں والے پھاٹک۔ نقشین کھڑکیاں اور ساری آبادی کے وسط میں بنا ہوا یہ گھر ایسے ہی دِکھتا تھا جیسے ٹاٹ کے بھدے بدرنگے ٹکڑوں میں شوخ رنگا مخمل کا ٹوٹا لگ جائے۔ اس گھر کے مکین چمڑے کے جوتے پہنتے، ریشمی قمیضوں پر سیاہ واسکٹیں زیب تن کرتے اور پورے علاقے میں من مانیاں کرتے پھرتے۔

اب غریب کسان کی زندگی ذرا سوچیے! زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر لکڑی کے ہلوں سے کاشت کاری، چرخی والے کنوؤں سے آبپاشی، گھاس پھونس کی چھتوں والے جھونپڑوں میں رہنے، چھال کے جوتے اور ماڑے موٹے کپڑے پہننے اور رُوکھی سوکھی کھانے پر بسر ہوتی۔ انقلاب نے رگڑا دیا۔ جو دادا سے لے کر والد تک کو چڑھا۔ میرا زمانہ تو پھر بھی سنبھالے کا دور تھا۔ یہ تو کہنا پڑے گا کہ پوری قوم انقلاب سے سرشار ملک کی تعمیرِنو میں جُت گئی تھی۔ بڑے انقلابی کام ہوئے۔ غربت اور جہالت کے اندھیروں سے رُوس چھلانگ مار کر دُنیا کی دوسری سُپر پاور بنی۔

تاہم گھٹن، یکسانیت، زبان پر پابندی، سوچ پر پہرے، بے رنگ شب و روز۔ اُوپر کے لوگوں کے زاروں جیسے ہی اللّے تللّے۔ ایک محنت کش کیمونسٹ یہ سب دیکھتا تھا اور کڑھتا تھا پھر

کیمونسٹوں کے جتھے بورژوا گروپوں سے مل گئے اور سسٹم کی کایا کلپ ہوگئی۔

گورباچوف اور اُس کے حواری گلاس نوسٹ (آزادی اظہار و خیال) پرسترائیکا (سیاسی اور اقتصادی بہتری) اور ڈیموکریٹائزیشن کے نعرے لگاتے نئے گھوڑوں کی صورت میدان میں اُتر پڑے۔ اُنہوں نے اپنے رنگوں کی پچکاریاں ماریں۔ اب نئے شہسوار میدان میں ہیں۔

''میخائل جب سوویت ٹوٹا اُس وقت تم کہاں تھے؟ اور تمہارے احساسات کیا تھے؟''

''میں تو ماسکو میں تھا۔ فوجی بغاوت کی ناکامی کے بعد لوگوں کے ساتھ ریڈ سکوائر میں خوشیاں مناتا پھرتا تھا۔ ارے بھئی ٹڈ منگے روٹیاں تے گلاں ساریاں کھوٹیاں۔''

اُس کے پنجابی محاورہ بولنے پر میں تو حیران رہ گئی تھی۔ میری حیرت پر کوئی اظہار کی بجائے اُس نے بات جاری رکھی۔

چودہ ریپبلکیں آپ نے اپنے ساتھ باندھی ہوئی ہیں۔ اب وہ آزاد چاہتی ہیں ہونے دو انہیں آزاد۔ سنٹرل ایشیا پر تقریباً ڈیڑھ صدی اور بالٹک ریاستوں پر کوئی نصف صدی ڈنڈا چلا لیا آپ نے۔ شوق پورے ہوجانے چاہئیں تھے اب تو آپ کے اپنی معیشت کا یہ حال کہ زندگی کی بہت اہم اور بنیادی ضرورتوں ڈبل روٹی، انڈے، مکھن اور پنیر کے لئے گھنٹوں قطاروں میں لوگ۔ لوگوں کو لگتا جیسے قحط پڑنے والا ہے جو چیز ہاتھ میں آتی ہے سمیٹ لو۔ بڑے ہولناک منظر تھے۔ خالی ڈھنڈار دکانیں۔ ذرا سی کسی نے افواہ اُڑادی کہ فلاں جگہ نیا سٹاک آیا ہے بس لوگوں کی دوڑیں لگ جاتیں۔ گورنمنٹ نے بتیرے قرضے شرطے پکڑے۔ سامان کی بھی فراہمی کی۔ ماسکو میں ماسکو کا شہری ہونا شرط ٹھہرایا۔ بیچارے مسکوویٹز (ماسکو کے شہری) جبروں اور ظلموں کے مارے ہوئے کھل کر احتجاج بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بس قطاروں میں گھنٹوں کھڑے پرانے زمانوں کو یاد کرتے اور ایک دوسرے کو کہتے۔

برژنیف کا زمانہ اچھا تھا۔ زندگی تو مشکل تھی پر کم از کم ہمارے پاس روزگار تو تھے۔ ہمیں ایک ڈبل روٹی کے لیے ذلیل تو نہ ہونا پڑتا تھا۔ ارے ہمیں اِس پراسڑائیکا سے کیا لینا دینا۔ گلاس

نوسٹ نے ہمیں کیا دیا۔اب نوکری کریں یا سانس کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے ڈبل روٹی حاصل کریں۔

سچ تو یہ ہے کہ کوئی ازم انسانی پیٹ اور اُس کی ضروریات سے آگے نہیں ۔اُن دنوں ایک لطیفہ بہت مشہور ہوا تھا۔میخائل ہنسا آپ بھی سُنیں ۔

ماسکو کی ایک خاتون گوشت لینے کے لیے تین گھنٹے سے ایک قطار میں کھڑی تھی ۔اس سارے وقت میں قطار نے انچ برابر آگے حرکت نہ کی ۔

خاتون چلائی۔

''بس بہت ہو گیا۔میں گورباچوف کو قتل کرنے جا رہی ہوں ۔''

وہ قطار سے نکل کر بگولے کی طرح اُڑتی نظروں سے غائب ہو گئی۔صرف ایک گھنٹہ بعد واپس آ گئی۔

''کیا ہوا؟''اُس کی ساتھی عورتوں نے پوچھا۔

''تم نے گورباچوف کو قتل کر دیا؟''

''اس کو قتل کرنے والوں کی قطار بہت لمبی تھی اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ۔''

سچی بات ہے میں نے میخائل ویزالیوچ کی کمپنی سے بہت لطف اُٹھایا۔کچھ جانا۔کچھ سیکھا۔وقت رُخصت جب اُس نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا میں نے برگر کے بند جیسے اس کے ہاتھ کو اپنے سوکھے سڑیل ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''میخائل تمہارا بہت شکریہ۔اس اجنبی سرزمین پر ایک رُوسی کے منہ سے اُردو پنجابی سُن کر مزہ آیا۔''

اور جب میں اُس سے یہ پوچھتی تھی کہ مجھے کیا کیا دیکھنا چاہیے یہاں تو جہاں بکھرا پڑا ہے؟اُس نے کہا۔

''ماربل پیلس اور فاؤنٹین گارڈن دیکھ لیں۔خود کو اتنا مت تھکائیں۔

میں اپنے اہداف کی جگہوں کے عین درمیان میں تھی۔ اللہ کا نام لے کر مارلی پیلس کی طرف بڑھی۔ کچھ تو نقشے پر میری اپنی مغز پچی اور کچھ میخائل کی رہنمائی نے راستوں کو واضح کر دیا۔

سیمسن کینال پر بنے تین برج دراصل وہ تین راستے تھے جو Monplaisir Palace اور الیگزینڈر پارک سے شروع ہو کر گھنے درختوں سے ہوتے مارلی پیلس تک جاتے تھے۔ درمیانہ اور پار کا راستہ لمبے لگتے تھے۔ میں جہاں تھی وہ قدرے ترچھا اور چھوٹا نظر آتا تھا۔

کمبخت زار خود تو گھوڑوں پر بھاگے ڈورے پھرتے تھے۔ ہمیں پیدل چلوا چلوا کر مروا رہے تھے۔ ٹانگیں تھک گئی تھیں۔ کئی نوجوان لڑکے کرسیوں پر عمر رسیدہ مرد و عورتوں کو بٹھا کے گھما پھرا رہے تھے۔ ایسی موج مستی کرنے پر طبیعت تو میری بھی مال تھی۔ پوچھنے پر جو ریٹ سننے کو ملا وہ اتنا تھا کہ سوچا ابھی تو خرگوش کی چال چلتی ہوں۔ چلو واپسی پر جب مرنے والا حال ہو جائے گا تو پھر یہ زہر کھاؤں گا۔

ہرمیٹج اور مارلی پیلس کے درمیان جہاں راستے کا کٹاؤ تھا اور صورت سکوائر کی سی بنتی تھی وہاں فوارے تھے۔ لوگوں کے پُرے تھے۔ فواروں اور نظاروں سے عشق و عاشقی میں نے اُس وقت اٹھا رکھنی چاہیے اور چلتے رہنے پر دل کو مجبور کیا۔

مارلی پیلس کو دیکھتے ہی شورش کاشمیری کے مشہور زمانہ شعر کا ایک مصرعہ دماغ میں گونج گیا۔

طوائف گھری ہوئی ہے تماش بینوں میں

ننھا مُنا چنا سا مارلی پیلس بھی اسی طرح سر سبز قطعوں، درختوں کے جھنڈوں، ننگی مجسموں، فواروں اور باغیچوں میں گھرا گھڑا تھا۔

سچی بات اس کی خوبصورتی اور انفرادیت یہاں آنے والوں کا دل موہ لیتی ہے۔

پیلس کے اندر تو میں جا ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔ یوں سمجھے اس کی ذرا

خواہش نہ تھی۔ وہی سونے کے سیروں اور منوں میں ڈوبے کمرے۔ گھٹن ہونے لگتی تھی۔

پر گولڈن ہل کیسکیڈ Cascade مزے کی چیز تھی۔ یہ زینے دار پہاڑی بڑی ساتھ چھوٹی جو یونانی نسوانی مجسموں سے سجی ہوئی تھی۔

یہ بیل فاؤنٹین (Bell Fountains) بھی کمال کی چیز تھی۔ لڑکوں کے دھڑ تو مچھلیوں جیسے پر اُبھارے والے پیٹ اور ننگے تناسلی اعضاء پاکستانی خانہ بدوشوں کے چھ سات سالہ ننگ دھڑنگ پھرنے والے لڑکوں کی من وعین کاپی تھے۔ پاکستانی پیتل کی بڑی پرات کو جیسے الٹا کر کے سر پر رکھ لیا جائے۔ ویسی ہی پرات سر پر دھرے اور دونوں بازوؤں سے اُسے اٹھائے پرات کے عین درمیان میں گول برتن جیسا فوارہ جس سے پانی کی دھاریں نکل کر پرات کے کناروں سے ٹپاٹپ کر کے نیچے گرتی گھنٹیوں جیسی صدا پیدا کرتی تھیں۔

یہاں ٹھنڈی ٹھار ہوائیں تھیں، چمکتی دھوپ تھی۔ میں تو بینچ پر لم لیٹ ہوگئی تھی۔ دیر تک لم لیٹ رہنے کے بعد اٹھی، اپنے دونوں پاؤں کی انگلیاں باری باری چٹخائیں، دونوں ہاتھوں سے ان کے وہ مقامات پولے پولے دبائے جن کے مساج کرنے سے پاؤں تازہ ہو جاتے ہیں۔

مساج کا اصل مزہ تو کسی دوسرے کے ہاتھوں سے ہوتا ہے پر اب کوئی دوسرا کہاں سے لاتی، جوانی ہوتی تو کوئی گھاس ڈال ہی دیتا پر اب اس بڈھی کی خدمت سے کیا حاصل وصول۔

منیر نیازی کو تو ایک دریا پار کرنے کے بعد پتہ چلا کہ اُنہیں تو ابھی ایک اور دریا کا سامنا کرنا ہے۔ پر مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرے سامنے دو دریا ہیں۔ خیال تھا کہ دوسرے دریا کیلئے میں کشتی میں بیٹھ جاؤں گی اور اب پتہ چلا تھا کہ کیڑیاں بیڑیاں تے کیڑے ملاح (کونسی کشتیاں اور کونسے ملاح) ویل چیئرز تو ایک بھی نظر نہ آئی تھی۔

چلنے سے قبل پیٹ پوجا کی۔ کافی کے چند گھونٹ برگر کے ساتھ لئے۔ اور پھر یہ گنگناتے ہوئے اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے۔

ہرمیٹیج راستے میں ہی تھا۔ مشرقی سمت پر۔ گلف کی گود میں۔ ”بس ذرا گردن جھکائی دیکھ

ل'' جیسے مصرعے کی تصویر، پر میں اس تصویر کو دیکھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

سیمسن کینال کے پل سے میں دوسری سمت اُتری۔ کینال کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پیٹر دی گریٹ کی پسندیدہ یک منزلہ رہائش گاہ مون پلیسر Monplaisir میں داخل ہوئی۔ یہ عمارت اس کے باغات محل وقوع سب ساحلی لینڈ سکیپ کی خوبصورت ترین تصویر تھے۔ محل کی ایک سمت کا جھکاؤ گلف کے خوبصورت خم کی طرف ہے۔

مجھے اس خوبصورت محل کے صرف سٹیٹ ہال کو دیکھنے میں دلچسپی تھی۔ اور وہ واقعی دیکھنے کی شے تھی کہ اس کی آٹھ میٹر اونچی چھت نقاشی و رنگ آمیزی و دلفریبی وجدّت کا وہ دلکش شاہکار تھی کہ جو حقیقتاً بہت منفرد نظر آئی۔ اس کی لکڑی کی دو طرفہ دیواریں یورپی مصوروں کے نایاب فن پاروں سے بجی تھیں۔ یہ ہال اُن رنگین یادوں سے معمور تھا جب یہاں جام وسبو کے دور چلتے۔ جب جوڑے رقص کرتے، جب فلک شگاف قہقہے اس کی بلند و بالا چھت سے ٹکراتے۔

آج یہاں خاموشی تھی۔ صرف اُن یادوں کی بازگشت میز پر دھرے بہت بڑے سائز کے ایگل کپ میں سنائی دیتی ہے، جو شاہوں کی شاہانہ مزاج کے نت نئے انداز اور محظوظ ہونے کے نرالے واقعات کا ایک بیّن ثبوت تھا کہ آنے والے اپنی وفاداریوں کو شاہی نظروں میں مزید معتبری دینے کیلئے کیسی کیسی جان لیوا آزمائش سے بھی گذرتے تھے کہ انہیں یہ گریٹ ایگل کپ دیا جاتا جس کے کپ میں بھری شراب کو انہیں صرف ایک ہی گھونٹ میں خالی کرنا ہوتا تھا۔ اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوتے اور مرتے بھی۔

واہ شاہوں کی تفنن طبع کا سامان۔

The Wheat Sheaf Fountain کیا بات تھی۔ نئی نسل نے کہاں یہ منظر دیکھے ہونگے جب گندم کی دستی کٹائی ہوتی اور انہیں گٹھوں کی صورت باندھ کر کھیتوں میں جگہ جگہ کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ کاشت کاری کا یہی طریق کبھی رُوس میں بھی رائج ہوگا۔ یہ فوارہ اُسی رواج کا عکاس تھا۔ براؤن پتھروں کے عین درمیان براؤن پتھر کا پُولا کھڑا ہے اور چاروں طرف پانی کی یہ

آبشاریں کھیتوں میں کھڑی پکی سنہری بالیوں کی طرح جو ہواؤں اور پھل کے بوجھ سے قوسی صورت بناتی ہیں۔ یہ بھی بعینہ وہی صورت بناتی زمین پر پانی برساتی ہیں۔ یہ واقعی ایک منفرد منظر تھا۔ پر اس ایک منظر پر کیا موقوف یہاں تو منظروں اور فواروں کی رنگارنگی بہار بکھری پڑی تھی۔

ویل چیئر کے مزے بھی چکھنا چاہے کہ چلو بیچاری ٹانگوں کی تھوڑی سی شنوائی ہو جائے کہ جو شور مچا مچا کر ہلکان ہو گئی تھیں سنہری چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے لڑکے نے ہاتھ کی تین انگلیاں فضا میں لہرائیں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا تین روبل۔

لڑکے کے تو مانو جیسے تن میں آگ لگ گئی۔ لال بھبھوکا ہوا اور روسی میں کچھ اول جلول بکنے لگا۔ یقیناً یہی کہتا ہوگا۔ بارہ من کی اس دھوبن کو تو دیکھو۔ روئی دیسی گھی کی چپڑی کھانا چاہتی ہے اور وہ بھی دودو۔

بھاؤ تاؤ تو قطعی فضول لگا، تکرار کرتی تو تین سو سے ڈھائی سو پر آجاتا، پر ڈھائی سو روبل دینا لعنت بھجوا اور یوں بھی ویل چیئر پر بیٹھنا گویا اپنے بڑھاپے کا لاؤڈ سپیکر پر اعلان کے مترادف تھا جو میں یقیناً نہیں چاہتی تھی۔ لاکھ میری ٹانگوں کا بھرکس بنا ہوا تھا۔

نکولس اول کی کاٹیج انگلش گوتھک موٹفز (Gothic Motifs) طرز تعمیر کی جھلکیاں مارتی الیگزینڈر پارک کے وسیع وعریض احاطے میں یوں نظر آتی تھی جیسے کسی سات فٹے جنے کی موٹی لمبی انگلیوں میں لشکارے مارتی عقیق کی انگوٹھی۔

نکولس تو دلبر شہزادہ تھا۔ انتہا کا خوبصورت 1816ء میں انگلینڈ گیا تو لندن کے نائٹ کلبوں میں تھرتھلی مچ گئی۔ لندن کی ارسٹوکریٹک کلاس کی عورتیں اس یونانی نقش و نگار والے بے حد وجیہہ شہزادے جس کا شاہانہ پہناوا حد درجہ دلکش اور انوکھا تھا پر بے طرح لٹو ہوئیں۔ پر وہ Prussia (جرمنی کا پرانا نام) کی نرم و نازک اور رنگین مزاج شہزادی الیگزینڈرہ فیدورونہ کے سامنے دل ہار بیٹھا۔ 1817ء میں شادی بھی کر لی۔ انگلستان کے مضافاتی علاقے میں باغات کے درمیان بنی کسی کاٹیج میں اُس نے کچھ وقت گذرا تھا اور وہ اِس ماحول اور کاٹیج کی خوبصورتی

سے متاثر تھا۔ بس تو الیگزینڈر پارک اور کاٹیج اسی یاد کا نتیجہ تھی کہ سارا ماحول روایتی دیہی انگلستان جیسا ہے۔

تاریخ میں نکولس اول اپنے اطوار میں ایک مطلق العنان اور کسی حد تک خودسر شہنشاہ کی شہرت کا حامل ہے نظم وضبط، رکھ رکھاؤ اور ترتیب وسلیقہ اُس کی زندگی کے ہر چلن میں سرفہرست تھے۔ انسپکٹر جنرل یا ڈرل ماسٹر کی طرح۔ الیگزینڈرہ مزاج شناس عورت تھی۔ اس کی ذاتی دلچسپی اور گہری توجہ نے کاٹیج کو اُس کے خاندان کے انتہائی ذاتی گھر میں تبدیل کر دیا تھا۔ جہاں نکولس ایک شفیق باپ اور محبت کرنے والا شوہر نظر آتا تھا۔ یہاں قیام کے دوران وہ خود کو ہمیشہ Lord of the cottage کے نام سے پکارنا پسند کرتا تھا۔

الیگزینڈر پارک کوئی چھوٹا سا تھا۔ شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا۔ واپسی پر فن لینڈ گلف کی جانب دو فوارے نظر آئے تھے۔ حوا یعنی Eve اور Adam فاؤنٹین۔ چپ چاپ میں اُونچے چبوترے پر تمکنت سے کھڑی حوا کو دیکھتی اور سوچتی تھی کہ مرمریں بازوؤں کی نزاکتوں کو دیکھوں، سینے کی گولائیوں اور اُن کے تناؤ کو پرکھوں یا بھولی بھالی معصوم صورت کی بھول بھلیوں میں کھوؤں یا ٹانگوں اور محرابی پاؤں میں اُلجھوں۔

اب ایسا تو ہونا تھا کہ جب ایسا ساحرانہ کافرانہ حُسن پہلو میں ہو اور فرمائش گندم کا دانہ کھانے کی ہو، بھلا انکار ممکن تھا۔ اتنی معصوم بے ضرری خواہش۔ سات فرشتوں کے قتل کا بھی کہہ دیتی تو وہ بھی آدم کیلئے کرنے جائز تھے۔ یہاں تو فقط ایک دانہ گندم کی خواہش تھی۔

چلو Bonazza نے تراشتے ہوئے تھوڑا سا احترام کرلیا کہ بڑی ادا اور خوبصورتی سے نچلے حصے کو ڈھانپ دیا۔

اپنی ماں کو الف للّلہ ننگی دیکھ کر تھوڑی سی شرم تو آنی تھی۔

مہرالنساء بنچ پر لیٹی غنودگی کے نہیں گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اُسے جگانے کی بجائے میں بھی وہیں سستانے کیلئے بیٹھ گئی۔ مقام شکر تھا کہ میں ادھر اُدھر بھٹکی نہیں، یوں بھٹکنا

کوئی خسارے کا سودا نہیں تھا۔ مزید نئی چیزیں اور نئے منظر بصارتوں میں آتے ہیں پر جب بندہ تھکن سے ادھ موا ہوا پڑا ہو تو پھر کوفت بیزارگی اور خود پر لعن طعن کا کھاتہ کھل جاتا ہے۔

ٹیکسی میں کیا بیٹھتے کہ پندرہ سو روبل کا مطالبہ تھا۔ بس لی کہ اوقات بس والی ہی تھی۔ میٹرو بھی لینی پڑی۔

ایڈمرل میں چائے بنانے اور پینے کے سب مراحل بڑے گھریلو قسم کے تھے کہ ہم کچن میں الیکٹرک کیتل میں پانی خود گرم کرتے۔ سیلون کے ٹی بیگز اور خالص گاڑھے دودھ کی بنی ہوئی چائے کے لبالب بھرے کپ اٹھا کر جب ہم اپنے کمرے میں آ کر چسکیاں لیتے ہوئے اُسے پیتے تو جیسے دن بھر کی تھکن کو یہ سپ بلاٹنگ پیپر کی طرح چوس لیتے۔

باب
22

دسمبرسٹ سکوائیر • دی برونز ہارس مین(The Bronze Horse man)

بے نظیر بھٹو • حبیب جالب • پُشکن کا ایوگینی

Площад Декабристы.
Брензовой Человек.
Беназир Бухто. Хабиб Джалиб И Пчшкинское Евгени.

چلو اس ماٹھے سے ہوٹل کا یہ فائدہ تو تھا کہ صبح جب تک جی چاہے پڑے اینڈتے رہو۔ ناشتہ آپ کو ملنا ہی ملنا ہے۔ بس بنانا خود پڑے گا کہ سروس دینے والی کترینا نو بجے کے بعد یونیورسٹی چلی جاتی ہے۔

بھئی ہم کون سا ہائی فائی قسم کی بیگمات تھیں۔ ماڑی موٹی عورتیں جن کی ساری زندگی چولہے چونکوں کونڈی ڈنڈوں اور توے پراتوں میں گذر گئی۔ تو اس انگلش سٹائل کا ناشتہ بنانے میں کون سا ہمیں پہاڑ توڑنے تھے۔

یوں ہم سحر خیز تھے۔ پر کل پیٹر ہاف نے تو سارے کس بل نکال دیئے۔ گرم پانی میں نمک ڈال کر دیر تک بدن کی ٹکور کی۔ زیتون سے ٹانگوں کی مالش ہوئی، ناشتہ بنایا، کھایا سگھڑ بیویوں کی طرح برتنوں کو دھو کر قرینے سے رکھا اور جنگل خواری کیلئے نکلے۔

آج ہمارے پروگرام میں محل ہرگز نہیں تھے۔ دسمبرسٹ سکوائر تھا۔ چرچ اور قلعہ تھا۔ پیٹرزبرگ کی اکلوتی مسجد تھی۔ اور یہ سب ایک دوسرے کے قریب قریب تھیں۔ نوا سکی پراسپکٹ ایڈمیرٹلی (Admiralty) پر ختم ہوتی تھی۔ دائیں ہاتھ ونٹر پیلس اور بائیں طرف ایڈمیرٹلی اور اس کے پاس ہی سینٹ آئزکز کیتھڈرل (Issac's Cathedral)۔

اُس وقت دسمبرسٹ سکوائر کے درختوں سے اٹھکیلیاں کرتی اور سبز قطعوں پر تیرتی ہوا بڑی ظالم ہو رہی تھی اور اتنی روشن اور چمکتی صُبح کی جگمگاہٹ کو بے اثر کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے گیلے بالوں کو گرم چادر سے اچھی طرح ڈھانپا کہ پردیس میں "کچھ ہو نہ جائے" کا ڈر بڑا خوفناک تھا۔

آہنی ریلنگ میں مقید خوبصورت جھاڑیوں کے گُچھوں کے اندر کھڑے بجلی کے سروِ چراغاں، دُور دُور تک پھیلی ہریالی، ہرے کچور درخت، شاندار شوخ زردئی سینیٹ اور سائینوڈ (Synod) کی عمارت، سامنے نیوا کے پانیوں میں اُترتا چبوترہ جس کے اطراف میں دھرے شیر اور نیوا کے پانیوں کی جھلملاہٹ سب دُھوپ میں اپنا اپنا رنگ و رُوپ نمایاں کرتے تھے۔

دسمبرسٹ سکوائر تاریخ رُوس کے چند عہد ساز واقعات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جس پہلی چیز نے بھرپور توجہ کو کھینچا وہ کانسی کے گھوڑے پر سوار وہ مجسمہ ہے۔ جو کیتھرائن دی گریٹ کی طرف سے اپنے نانا سسر پیٹر دی گریٹ کو خراج ہے۔ عقیدت مندانہ اظہار ہے۔ کیتھرائن غیر رُوسی ہونے کی وجہ سے اپنا ناطہ اور تعلق رُوسی تاریخ کے ابتدائی زاروں اور رومانوف خاندان سے جوڑنے کی بہت خواہشمند رہتی تھی۔

جرمنی کی ایک چھوٹی سی ریاست میں پیدا ہونے والی یہ شہزادی بڑی توپ شے تھی۔ ایسی فطین و ذہین تھی کہ نوعمری سے ہی دُنیا کے مفکروں اور دانشوروں کو پڑھتی اور اُن سے متاثر تھی۔ روسو اور Diderot سے تو دوستی اور خط و کتابت بھی تھی۔ پیٹر سوم سے شادی ہوئی تو آرتھوڈوکس

عیسائی بنی۔ بڑی عاشق مزاج، جی دار اور حُسن پرست تھی۔ جو عاشق تھے وہ بھی بڑے جیالے، بہادر، خوبصورت اور صلاحیتیوں سے مالا مال قسم کے لوگ تھے۔ تو بھلا کمزور سا شوہر کس کھاتے میں تھا۔ سولہ سترہ سالوں میں ہی پھڑ کا کرا گلے جہان پہنچا دیا۔

اب آرٹ ادب اور سائنس کو فروغ کیسے نہ ملتا اور پیٹرز برگ دُنیا کے خوبصورت اور مثالی شہروں جیسا رُوپ کیوں نہ دھارتا کہ عالم فاضل، زبردست قوت فیصلہ اور انتظامی صلاحیتوں کی حامل ملکہ تخت پر بیٹھی تھی اور معاونت کرنے والے بھی بڑے جری اور دلیر لوگ تھے۔

زارینہ کو وہ گمنام سپاہی جو زاروں کے توسیع پسندانہ عزائم کی بھینٹ چڑھنے کے لئے اُس کے ساتھ چلے اور اجنبی جگہوں پر رزق خاک ہوئے، کب یاد آئے ہوں گے؟ اُس نے تو پل کے ہزارویں حصے میں بھی ان کے بارے میں ایک بار نہ سوچا ہوگا۔

پیٹر اول نے 1700 میں عنان اقتدار سنبھالتے ہی اُس یورپی اتحاد میں شرکت کی جو سویڈن کے خلاف شمالی جنگ میں اُلجھا ہوا تھا۔ پیٹر اپنی علاقائی حدود کو بالٹک کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ بڑھانے کے علاوہ گرم پانیوں کی بندرگاہوں تک پہنچنے کا بھی شدید خواہش مند تھا کہ رُوس کیلئے مغرب میں دریچہ کھل سکے۔

پولٹاوا کے مقام پر زبردست جنگ کے بعد رُوسیوں کو عظیم فتح نصیب ہوئی۔

ناروے کے ساحلوں پر بہنے والے گلف اسٹریم کی گرم دھارا پر اُس کے تسلط نے اُسے دُنیا کے انتہائی شمال میں ایک خوبصورت شہر بنانے کے خواب کو تکمیل دے دی۔ جو اُس کے لئے یورپ میں کھلنے والی کھڑکی تھی۔

موریس فالکون (Maurice Falconet) کا یہ شاہکار دراصل رُوس میں پہلا رومن سٹائل مجسمہ تھا جو 1782ء میں یہاں نصب کیا گیا اور اس جگہ کو پیٹرز سکوائر کا نام ملا۔

بادامی اور گلابی گھلے ملے رنگ کے تین خفیف سے سٹیپ والے اِس چبوترے پر موٹا تازہ

اور لمبا سا سانپ بکھرا ہوا ہے۔ گھوڑے کے اگلے سم سانپ کا سر کچل کر آگے بڑھتے ہوئے اس انداز میں اوپر اٹھے ہوئے ہیں جیسے ابھی وہ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کر جائے گا۔

گھوڑے کے پھولے ہوئے نتھنے، اُوپر اٹھی کنوتیاں اور براچھوں کو چیرتی لگام جس کا سرا شہ سوار کے ایک ہاتھ میں ہے۔ شہ سوار کے چہرے اور آنکھوں میں آہنی عزم کی دہکتی لو ہے۔

سانپ سویڈن کا علامتی نشان ہے۔ سویڈن جو جانی دشمن ہے رُوس کا۔ دشمن جس کا سر بُری طرح کچل دیا گیا ہے۔

فضا میں پھیلے ہوئے ہاتھ کا تمثیلی انداز، کیا کہہ رہا ہے؟ مجھے اس کا پسِ منظر تو نہیں ملا۔ میرے خیال میں ایک اچھا شہنشاہ اپنی دھرتی کو اپنی پناہ، عافیت اور شفقت کے سائے تلے رکھنے کا عزم ہی دُہراتا ہے۔

اُنیسوی صدی کے آغاز میں پیٹر سکوائر سینیٹ سکوائر میں بدل گیا۔ نام کی تبدیلی ایک بار پھر اُس وقت ہوئی جب ایک بے حد اہم واقعے نے جنم لیا۔ حکمران زار نکولس اول تھا۔ سخت گیر، فوج جس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ سلطنت فوجی ٹولے کے ہاتھوں میں تھی۔ شرفاء مملکت کے ایک گروپ نے آزادی اظہار، بنیادی انسانی حقوق اور آئین کی بالادستی کے لئے بغاوت کر دی۔ تاریخ میں سنائی دینے والی اِس پہلی احتجاجی آواز پر اس کا گلا جس بُری طرح گھونٹا گیا اُس نے تاریخ کے صفحات میں دُکھ اور ملال کے تاثرات بکھیر دیئے۔

میں نے اِس واقعے کی پینٹنگ دیکھی تھی۔ اس وقت وہ منظر فریم سے نکل کر سکوائیر میں مجسم ہو گیا تھا میں دیکھتی تھی یادگار کے پاؤں میں بکھرے احتجاجی تو شاید پندرہ اٹھارہ سو سے زائد نہ ہوں پر گھڑ سوار بندوقوں والے ہزاروں کی تعداد میں میدان کے ہر طرف کیل کانٹوں سے لیس یوں کھڑے تھے جیسے سامنے دُشمن کی بھاری نفری مقابلے پر ہے اور بس کوئی دم میں جنگ کا طبل بجا چاہتا ہو۔

حبیب جالب بھی کیسے وقت یاد آیا تھا اور وہ پیاری سی لڑکی بھی چھم چھم کرتی جمہوریت

اور آئین کی بالادستی کا جھنڈا اُٹھائے سامنے آ گئی تھی اور سکوائر حبیب جالب کی گونج دار آواز سے بھر گیا تھا۔

ڈرتے ہیں بندوقوں والے اِک نہتی لڑکی سے۔

اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے لوگ کس قدر بزدل ہوتے ہیں کہ سچ کا علم تھامے چند لوگوں سے ڈر جاتے ہیں۔

14 دسمبر 1825ء کے بے حد سرد دن جب احتجاج کرنے والے لوگ ''دی برونز ہارس مین'' کے قدموں میں اکٹھے ہوئے، اُن پر گولی چلی۔ پانچ لیڈر اور سینکڑوں لوگ تو وہیں ختم، بقیہ گرفتار ہوئے اور سائبیریا کے کالے پانیوں میں پہنچائے گئے اور یہی وہ لوگ تھے جو دسمبری کہلائے۔ انہی جیسے لوگوں کے لئے پشکن جیسے شاعر نے انقلابی نظمیں لکھیں اور اس سکوائیر کو دسمبرسٹ سکوائیر کا نام ملا۔

ماحول میں افسردگی کا رچاؤ عود آیا تھا، میں نے گھوڑے کو بغور دیکھا تھا. میں شاید یہ جاننا اور دیکھنا چاہتی تھی کہ اپنی پُشت پر عہد ساز شخصیت کو بٹھانے کا جو گھمنڈ اُس کے نتھنوں کو پھلائے ہوئے ہے کیا اس کی آنکھوں میں کہیں اُس احساس، اُس درد کی کوئی ہلکی سی رمق بھی رقصاں ہے کہ جب بے گناہوں کے خون سے یہ جگہ رنگین ہوئی؟

''The Bronze Horseman دی برونز ہارس مین'' اِس سکوائر کی جان، اس کی رونق بڑھانے، فرانسیسی مجسمہ ساز کی فنکاری نمایاں کرنے، پیٹر دی گریٹ جیسے تخلیق کار کی خوبیوں کے پَرت کھولنے کے ساتھ ساتھ پشکن جیسے بے مثال شاعر کی لازوال نظم کو بھی اُجاگر کرتا ہے کہ اس کی نظر نے اِسے کِس انداز میں دیکھا اور محسوس کیا۔ نظم کے پسِ منظر میں 1777ء کا خوفناک سیلاب تھا۔

میں نے گھڑسوار کے پھیلے ہوئے آہنی ہاتھ کو دیکھا۔ لرزش یا تھرتھراہٹ نہیں تھی وہاں۔ اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ آنکھوں سے ٹپکتے جلال اور ہیبت نے مجھے ایوگینی کی طرح ہی خوف

زدہ کر دیا تھا۔

''برونز ہارس'' کا ایوگینی، دریائے نیوا کی کھاڑی کے کسی چھوٹے سے جھونپڑے میں رہنے والا مچھیرا، دریا کے منہ زور سیلاب میں اپنے جھونپڑے اور اپنی محبوبہ پراشا کو کھو بیٹھا تو گھڑ سوار سے یہ پوچھنے چلا آیا کہ تو کیسا شہنشاہ ہے؟ منہ زور پانیوں کے کنارے شہر آباد کرنے سے پہلے تو نے نہ سوچا کہ یہ پانی بھی کبھی کبھی انسانوں کو سبق سکھانے آ دوڑتے ہیں۔ اور جب بھی ایسا ہوگا تو مرنا کس نے ہے؟ غریبوں اور ماتھے لوگوں نے۔ تیرا کیا ہے؟ تیرے محلوں میں بھرے ہوئے پانی کو تو تیرے جرنیل تیری ایک آواز پر سمیٹنے کے لئے دوڑ پڑیں گے۔ پر ہم جیسے مارے لوگ تو برباد ہو جاتے ہیں۔ اب تو مجھے بتا۔ میری کٹیا اور میری پراشا جو میرا خواب، میری امید تھی۔ وہ سب تو پانیوں میں بہہ گئے۔

''لُٹ گیا نا میں تو؟ زندگی اُجڑ گئی نا میری تو۔ بول۔ جواب دے مجھے۔ آدھے جہاں کے مالک و وارث! تجھے اُس آگ کا کچھ اندازہ بھی ہے جو میرے سینے میں جل رہی ہے؟''

اُس نے سر کو چبوترے پر پٹخا پھر اُٹھایا۔ مجسمے کو دیکھا اور طنز سے بولا۔

''بڑا آیا عمارتیں بنوانے والا۔ نیا شہر بسانے والا اور تاریخ میں اپنا نام لکھوانے والا۔''

اُس نے گھڑ سوار کو بس اتنا ہی تو کہا تھا۔ اتنا سا گلہ اور اتنی سی شکایت ہی تو کی تھی پر اُسے لگا جیسے گھڑ سوار کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں پھوٹ پڑی ہیں۔ زمین سنسنانے لگی ہے یوں جیسے کوئی زلزلہ آ رہا ہو اور گھوڑا اس پر چڑھ دوڑنے والا ہو۔ ایوگینی خوف اور دہشت سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُسے لگا جیسے گھوڑے کی ٹاپیں سڑک کا سینہ کوٹتے ہوئے اُس تک پہنچ کر اُس کا سر کچل دیں گی۔

آہ! ایوگینی بیچارہ، یوں ہی بھاگتا پھرا اور ایک دن اپنی کٹیا میں مر گیا۔

میں نے ایک بار پھر گھڑ سوار کو دیکھا تھا اس کے چہرے اور ہاتھ کو بھی۔ سچی بات ہے کہ میں ایوگینی کی طرح بھاگی تو نہیں تھی پر خوف زدہ ضرور ہوئی تھی۔

باب

23

آئزک سکوائیر • آئزک کیتھڈرل • کولونیڈ سے نظارہ

Площад Азия , Азискй Церкве И Возгляд От Колоненд.

آئزک سکوائر کو دیکھنا خاصا دلچسپ شغل لگا۔ خوبصورت ایڈمیریلٹی کی بسنتی رنگی بلڈنگ ایک جانب، دوسری طرف دسمبر سٹ اور عقب میں آئزک چرچ کے احاطے میں کھڑی نکولس اول کی یادگار کا ہر سٹیپ ایک عدد ماہر کا مرہونِ منت ہے۔ اِن سروِ چراغاں کے قریب کھڑی انہیں دیکھتے ہوئے میں خود سے کہے جا رہی تھی۔

"کمال ہے ان پر۔ یہ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی فنکاری کے سلمہ ستارے سے سجا دیتے ہیں۔"

پیڈسٹل کے کنارے پر بیٹھے نسوانی کردار نکولس کی بیوی اور بیٹیوں کے تھے۔ یہ تشبیہی مجسمے عیسائیت کی بنیادی سچائیوں کے ترجمان تھے۔ الیگزینڈرہ سر کو چادر سے ڈھانپے ہاتھ میں کراس اور گھٹنوں پر دھری انجیل تھامے ایمان کی علامت ہے۔ جبکہ بیٹیاں شیشہ دکھاتی، میزان اٹھائے اور زرہ بکتر کے ساتھ عقل و دانش، انصاف اور طاقت کی نمائندہ کے طور پر پیش ہوئی ہیں۔ چوٹی پر زرہ بکتر پہنے سر پر آہنی خود دھرے، اس خود پر پروں والا شاہین نما پرندہ سجائے، گھڑسوار نکولس اول ہے۔ تاریخ میں نکولس کا مقام ایک کلاسیک، خودسر اور مطلق العنان زار کے

طور پر آتا ہے۔ مذہبی تھا۔ وقت اور عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات میں تقدیر اور قسمت پر یقین جیسے نظریات فروغ پانے لگے تھے۔ حتیٰ کہ 1855ء کی کریمین جنگ میں فرانس برطانیہ اور ٹرکی کے ہاتھوں شکست کے بعد تباہ کن معاشی اثرات پر اُس نے سادگی سے صرف یہی کہا۔

"I shall carry my cross until all my strenght is gone"

کشادہ آئزک سکوائر کو اس آرٹ پیس نے خوبصورتی اور دلکشی دے رکھی ہے۔ کہ اسے دائیں بائیں دُور نزدیک جہاں سے بھی دیکھو یہ اپنی اس انفرادیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہاں سے نیوا کے پانی اور پار کی مختلف عمارتوں کے رنگ اس کا حسن بڑھاتے ہیں۔

آئزک کیتھڈرل تو مناظر کی جان تھا۔ مٹیالے سبز اور طلائی رنگ کی اس کلاسیکل عمارت کو دیکھتے ہی اس کی تعمیر میں ایک گھمبیرتا کا سا رچاؤ محسوس ہوتا ہے۔ مرکزی گنبد غیر معمولی بڑا ہے۔ ذرا نیچے چاروں سمتوں میں چار اور گنبد اپنی محرابی بالکونیوں کے ساتھ اس کی شان میں اضافے کا موجب ہیں۔ اس کا جنوبی حصہ من وعن اس کے فرنٹ جیسا ہے۔

آئزک کیتھڈرل دیکھنے پر مہر انساء تو تیار نہیں تھی۔

''دو تو دیکھ لئے ہیں۔ اس میں کیا ہیرے ٹنگے ہوں گے۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اُن جیسا ہی ہوگا۔ ہاں اگر تمہیں دیکھنے کی بے چینی ہے تو چلی جاؤ۔ اُس نے کہا اور ساتھ ہی مجھے بتا دیا کہ وہ یہیں ہوگی۔''

چرچ کا ٹکٹ تین سو روبل اور کولونیڈ کا ڈیڑھ سو۔ پہلے سوچا چرچ دیکھنا ہی کافی ہوگا پھر سوچا۔ یار اک وار دا پھیرا اے، کیوں کنجوسی کروں۔

سو مربع میٹر کے رقبے پر پھیلا ایک سو ایک میٹر اونچا یہ گنبد نما صورت والا دنیا کا چوتھا بڑا چرچ ہے۔ روم کا سینٹ پیٹرز، لندن کا سینٹ پال اور فلورنس کا سینٹا ماریا علیٰ الرتیب پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہیں۔ چوتھا یہ ہے۔ طلائی گنبد کے نیچے کولنیڈ و کی چھت پر ریلنگ کے

ساتھ پیر پیر کے فاصلے پر کھڑے پر پھیلائے فرشتوں کی قطاریں اس کے حسن کو دوچند کرتی ہیں۔

اور اندر میرے سامنے محراب در محراب دیواروں، کمروں، چھوٹے بڑے گنبدوں، تصویروں اور رنگوں کی تزئین کاری کا ایک ایسا سلسلہ تھا جسے بہر صورت سراہے بغیر آگے جانا مشکل تھا۔

میں بے اختیار ہی سوچے چلی جارہی تھی کہ ہم نے عبادت گاہوں میں اپنی عقیدتوں کا رنگ بھر بھر کر کیسے اُنہیں آرٹ گیلریوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہاں آئی کون کا حیرت انگیز کام تھا یہاں مرکزی گنبد میں انجیل کے اہم واقعات اور ان کے کرداروں کی نقاشی میں ہنر مندی کا عروج تھا۔ ملمع زدہ کام اور دیواری نقش گری کی بے مثالی تھی۔ ایک انچ خالی جگہ کی تلاش مشکل نہیں ناممکن تھی۔

مجھے اپنا قبلہ و کعبہ بھی یاد آ گیا تھا۔

پتھروں اور مٹی سے بنا وہ چھوٹا سادہ سا کمرہ آج جس غلاف سے ڈھانپا جاتا ہے۔ اُس کی بُنت خاص الخاص ریشم کی تاروں سے ہوتی ہے۔ خدا کے گھر کی حُرمت، حج کی فرضیت اور فضیلت کی بارے میں قُرانی آیات کی طلائی کشیدہ کاری کا خرچ کروڑوں ریال ہے۔ اور ہر سال اسے تبدیل بھی کرنا ہے۔

کوئی پُوچھے خدا کو اس کی ضرورت ہے۔

میں لمبے لمبے سانس لیتی آگے بڑھ گئی تھی۔

سینٹ کیتھرائن آگسٹس کا ڈیزائن کردہ کیتھڈرل چار کالمی پورٹیکوز پر کھڑا اپنی ظاہری صورت میں بہت بڑا نظر آتا ہے۔ 1818ء سے لے کر 1858ء تک چالیس سال کے طویل عرصے میں بننے والی یہ عبادت گاہ تعمیری اور آرائش و زیبائش، نامور مجسمہ سازوں اور آرٹسٹوں کے ساتھ ساتھ آرٹ سکول کے اُن بے شمار جونیئر مصوروں کی محبت اور خلوص کا بھی نتیجہ ہے جنہوں نے اپنے مذہبی جذبوں سے اس پر کام کیا۔ رنگین ماربل، میلاچی، لپیس (نیلا قیمتی پتھر)

روس کی ایک جھلک
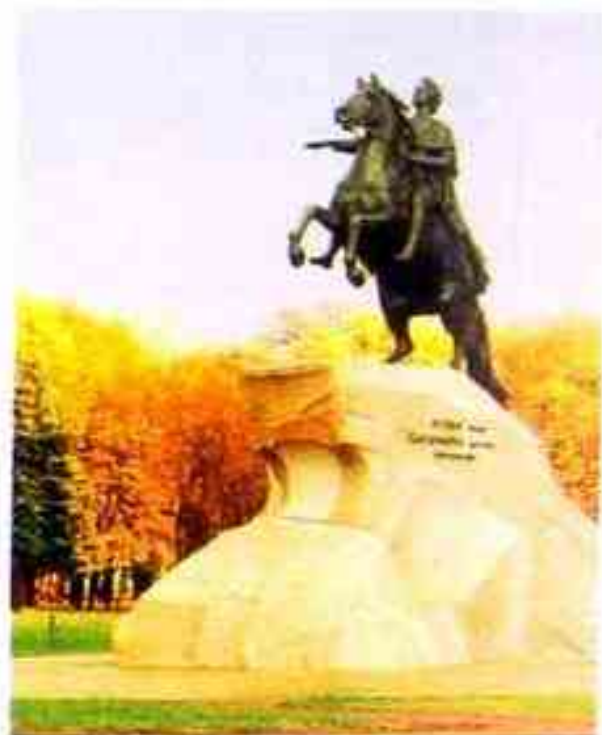
دسمبرسٹ سکوائر میں "دی برونز ہارس مین" پیٹر دی گریٹ کا کانسی کا مجسمہ

نکولس اول کی سب سے بڑی بیٹی ماریا

آئیزک سکوائر میں آئیزک کیتھڈرل

بیلے ڈانسر

آسٹرووسکائے (Ostrovsky) سکوائر کا ایک منظر

رُوس کی ایک جھلک

پیٹر دی گریٹ اپنے اکلوتے بیٹے الیکسی سے سازش کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہے۔ اسی قلعے میں الیکسی کو پھانسی دی گئی۔

پیٹر اینڈ پال فورٹریس کے قیدی۔ (دائیں سے بائیں) ویرافگنر، دوستووسکی، میکسم گورکی، لیون ٹراٹسکی

ہارس ٹریز

► آسترووسکائے سکوائر میں کیتھرائن دی گریٹ اپنے جرنیلوں وزیروں مشیروں کے ساتھ

کا بے تحاشا استعمال اسپر اٹھنے والے ڈھیروں ڈھیر اخراجات کی صداقت کا بتا تا ہے۔ایک سو بارہ کالموں والے اس گرجا میں دس ہزار لوگوں کی گنجائش ہے۔

جیسز زا اور ان کے موالیوں کی زندگیوں میں ایسی خرافات کی کہیں گنجائش تھی، جن میں ان کے پیروکاروں نے انہیں لادیا ہے۔سنہری پٹی والی سرخ چادر مجھے اُنکے تن پر لپٹی ہوئی کتنی عجیب لگی تھی۔سینٹ نکولس کو تو پاؤں سے لے کر سر تک رنگ رنگیلے تام جھام والے پہناوے میں لپیٹ کر ہاتھوں میں انجیل تھمادی تھی۔محبتوں چاہتوں اور عقیدتوں کے انداز۔

کولونیڈ پر چڑھنا کتنا مشکل تھا؟ اتنی بلندی؟ اب چونکہ ٹکٹ لے بیٹھی تھی اس لئے مار دھاڑ کرنا پڑی۔ پر سانس سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ ہو نکنے والی کیفیت تھی .ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

ساری کشٹ عین راحت میں بدل گئی تھی جب منظروں پر نظر پڑی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرے تھکے ماندے بوجھل پپوٹوں پر کسی نے ٹھنڈے ٹھار بھینی بھینی خوشبو میں بسے پھاہے رکھ دیے ہوں جنہوں نے سارے سریر کو تازہ دم اور ہاکا کر دیا ہو۔

ملتا ہے جہاں دھرتی سے گگن۔ آؤ وہیں ہم جائیں۔

یہاں گگن پانیوں سے مل رہا تھا دھرتی کے بوس و کنار لے رہا تھا اور میں یہاں آئی ہوئی تھی پر اکیلی۔ جہاں گلف کے پانیوں کا لامحدود پھیلاؤ تھا۔ وہیں دریائے نیوا چھوٹی سی لکیر کی مانند سانپ کی طرح بل کھاتا تھا۔ پیٹر اینڈ پال فرٹریس کا چھوٹا سا جزیرہ Vasilyevski کا بڑا جزیرہ ساتھ Petrogradskaya اور Vyborgskaya نیوا کی شاخوں سے جڑے ہوئے۔ سارا پیٹر برگ کہیں قوس کی صورت، کہیں جیومیٹری کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔نہریں سارے میں گھومتی پھرتی تھیں۔ مکانات یوں جیسے خوبصورت رنگوں والے چھوٹے چھوٹے گھروندے کسی نے قالین پر ساتھ ساتھ جوڑ کر سجا دیے ہوں۔ بڑے حسین منظر تھے۔

اِن منظروں نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے وہاں بٹھا دیا تھا.اور کہا تھا۔ دیکھو ہمیں اطمینان اور سکون سے۔

باب

24

تُرکوں کی تاتاری مسجد • پیٹرز برگ میں بسنے والے مسلمان
کنادی محمد دیکوف • اُمّ ِسلمیٰ دیکوف

Туpecки Meчeть–Живуши Mycулмaн B Пeтepбypгe
Гeнaди Maмeдoв , Дoчкa Caлмaeв

وہ دن جمعے کا تھا اور میں ظہر کی نماز پیٹرز برگ کی اکلوتی مسجد جو پیٹر اینڈ پال فوٹریس کے قریب تھی میں ادا کرنے کی شدید خواہش مند تھی۔ اجنبی جگہوں پر ہلالی نشان کو سر بلند رکھنے والے میناروں اور گنبدوں کو دیکھ کر رُوح تک میں جس قلبی سرشاری کی لہریں رقص کرتی ہیں۔ اُس کی وضاحت ممکن ہی نہیں۔

یہاں کتنے مسلمان ہیں؟ رُوسی اور دیگر ممالک کی تعداد کیا ہے؟ پاکستانی بھی ہیں۔ اگر ہیں تو کس سلسلے میں یہاں مقیم ہیں؟ یہ وہ سوال تھے جو میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے اب جو مشکل تھی وہ وقت تھا، جمعے کی نماز کب ہوگی؟ عشاء رات گیارہ بجے ہوتی تھی۔ ابھی تک تو ہم نمازیں سورج کے رُخ روشن کی زوال پذیری کے تیر تکّوں سے ہی ادا کرتے تھے۔

خیال تو میرا یہی تھا کہ ایک بجے تک آئزک کیتھڈرل کے دیدار سے سیری ہو جائے گی۔ پر ہوائیوں کہ میں کولونیڈ پر کیا چڑھی؟ مجھے محسوس ہوا جیسے میری آنکھیں نظاروں کی سان پر

جا چڑھی ہیں اور اٹھنے کی مہلت نہیں دے رہی ہیں۔

اور جب نیچے آئی تو مہرانساء نے وہ لتے لئے کہ اللہ دے اور بندہ لے والی بات ہوئی۔

وہ بولے چلی جارہی تھی۔

''سوچا تھا کہ چلو جمعہ ہی پڑھ لیں گے پر تمہیں تو تاریخ چھی ڈال کر بیٹھ جاتی ہے۔اب دوپہر کے کھانے کیلئے دوکان کھوجنی ہے اس میں بھی جانے کتنی دیر لگے اور مسجد بھی پہنچنا ہے۔ اللہ جانے راستہ کتنا لمبا ہے؟''

اس ساری بک بک جھک جھک کو میں نے مزے سے کان پر بیٹھی مکھی کی طرح اُڑا دیا تھا۔

چلو زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑی۔شاپ سے کلبسا (Kalbasa) خریدا۔اُس کے ٹکڑے کروائے اور شاپر کو محفوظ کیا۔

پیلس برج یا (Dvortsovyy Most) کو پار کیا۔نیوا کے نظارے کسی پیشہ ور طوائف کی مانند اشارے بازی کرتے تھے پر میں نے بھی کسی نوعمر پرہیزگار کی طرح نظروں کو جھکانے اور راستے پر مرکوز رکھنے پر توجہ کی۔

یہ پرہیزگاری پل بھر میں اُس وقت کورے برتن کی مانند ترخ گئی جب روسٹرل کالم دکھائی دیئے۔ایسا دلفریب منظر تھا کہ آنکھیں چرانی ممکن نہ تھیں۔ڈل سرخ رنگ کے دو مینار نیوا کے پانیوں میں اُترے ہوئے نیم قوسی چبوترے پر بڑی تمکنت سے کھڑے تھے۔ان کے وجود پر کشتیوں کے ہم شکل آہنی نمونے اُبھرے ہوئے تھے یوں جیسے کسی بڑے آلو کے جسم پر آئی بڈز نکلے ہوئے ہوں۔یونانی خدوخال اور یونانی پہناوں کے ساتھ نچلے چبوتروں پر بڑے خوبصورت مجسمے کھڑے بیٹھے دکھائی دیئے تھے۔ملحقہ وسیع وعریض لان جہاں سفید اور براؤن پھولوں کی جیسے چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ہائے آنکھیں تو مانو جیسے غڑاپ سے ٹھنڈے ٹھار پانیوں میں غوطہ زن ہوگئی ہوں۔

یہ سب ایسے ہی دیکھا جیسے کسی مسافر کو کہیں راہ میں چاند چہرے نظر آ جائیں۔ وہ رُک کر انہیں کچھ محبت اور کچھ دھیان سے دیکھنا چاہے پر مسافرت کی مجبوریاں دھکیل کر آگے لے جائیں۔ یہی کچھ میرے ساتھ تھا۔ بس گنتی کی چند نظروں کی چور ضرور ہوئی۔ ہاں البتہ میں نے، پلٹ کر بیٹھے اور کھڑے ان مجسموں کو یہ ضرور کہا۔

''وعدہ، میں پھر آؤں گی اور تمہارے ساتھ کچھ وقت گزاروں گی۔''

سڑک پار کی اور دوسری طرف بس کیلئے جا کھڑے ہوئے۔ بس نے پل کراس کیا اور پیٹروگراڈ سکایا سٹورنہ (Petrogradskaya Storna) میں داخل ہوگئی۔ چڑیا گھر نظر آیا تھا۔ سوچا اسے بھی دیکھنا چاہیے۔ بہت سی خوبصورت عمارتیں، بہت سے سڑکوں کے موڑ کٹتے گئے۔ شاہراہ Kamennoos Trovsky Prospekt کے ایک سٹاپ پر اُن دو مہربانوں نے اُترنے کا اشارہ دیا جنکی ''تا تار موسک، تا تار موسک'' کہہ کہہ کر جان کھائی تھی۔

یہ پیٹروگراڈ سکایا کی لمبی مرکزی شاہراہ ہے جو ہرمیٹیج کے پاس ہی ماربل پیلس کے تروات سکایا (Troitsky) پُل سے شروع ہوکر جزیرے کے آخر تک جاتی ہوئی Vyborgskaya آئی لینڈ میں داخل ہوتی ہے۔

خدا کا انتہائی شکر تھا کہ جہاں اُترے مسجد وہاں سے دو ہاتھ پر تھی۔

مسجد میں داخل کیا ہوئی دل کا صحرا جیسے کسی نخلستان میں بدل گیا۔ کسی پھول کی طرح کھل گیا۔ یہاں تو رنگوں، نسلوں، ملکوں کا ایک چھوٹا سا اجتماع تھا جو اپنی اپنی بولیاں بول رہا تھا۔ یہاں تا تاری تھے۔ ترکی تھے، افریقی، فلسطینی، الجزائری۔ قزاخی، رُوسی، اُزبک، تاجک تھے۔

جموں کا محمود تھا جس نے بے حد حیرت سے ہمیں دیکھا۔ پر پاکستانی نوجوان ہمایوں سے ملنا تو گویا پردیس میں اپنے کسی عزیز سے ملنے کے مترادف تھا۔ خوش طبع اور ملنسار سا لڑکا جس نے ہیوی مکینیکل انجینئرنگ ماسکو سے کی اور اب جینز اور جیکٹز کے بزنس کو پلان کرنے کی منصوبہ

بندی میں مصروف تھا۔ کتنا بڑا اجتماع تھا۔ ہزار بارہ سوسے تو کسی صورت کم نہ ہوگا۔ عورتوں کی بھی کثیر تعداد تھی۔

زبانیں اجنبی، رنگ ونسل مختلف، لباس وتہذیب میں فرق پر آنکھوں میں چمک ہونٹوں پر مسکراہٹیں، مصافحے، جھپیاں، گالوں پر بوسے، محبت ویگانگت کی ہوائیں چاروں طرف رقص میں تھیں۔

ماؤں کے ساتھ اُن کے بچے بھی تھے۔ اُن کا شور شرابہ۔ کیسا خوبصورت شاندار سا بھریا میلہ لگتا تھا۔

ایک قزاخی خاندان تو محبت کے گاڑھے شیرے کی مانند تھا۔ جس نے ہمیں بھی اپنے ساتھ چپکا لیا۔ صاحب خاندان کنادی محمد دیکوف، بیوی اُم سلمٰی دیکوف اور ماشاء اللہ سے پانچ بچوں کے ہمراہ ہمارے لئے اس درجہ مہربان ثابت ہوا کہ ہمیں نماز جمعہ کے بعد اپنے گھر لے جانے کے لئے بضد۔

میرا بس چلتا تو میں اُن کی گاڑی کی ڈکی میں گھس کر اُن کے ساتھ ہی چلی جاتی۔ مہرالنساء یکسر انکاری ہوگئی تھی۔ اُسے کسی چھوٹے یا ذرا بڑے فلیٹ کے کسی کمرے میں بیٹھ کر خاموش تماشائی بننے کی ضرورت کیا تھی؟ ایسے مواقع پر اُسے میرا ون ویمن شو یقیناً بہت کھلتا ہو گا۔

دیکوف اچھی انگریزی بول لیتا تھا۔ بیوی کو ویسے ہی محبت کا جاگ لگا ہوا تھا۔ گھر کا نمبر وغیرہ سب نوٹ کیا۔ جلد ہی آنے کی حامی بھری۔

اذان کی دلکش آواز نے جیسے میرے تیزی سے لکھتے ہاتھوں کو روک دیا۔ بے اختیار میں نے آسمان کو دیکھا۔ پھر اس رنگ رنگیلے بھرے میلے کو۔ ہم میں سے ہر کوئی اس پکار کو سمجھتا تھا۔ خواتین کے ساتھ اُوپر گیلری میں گئے۔ یہاں مزید خواتین سے تعارف ہوا۔ ہاتھ ملائے۔ آنکھوں سے محبتیں چھلکائیں۔ زبانیں اجنبی پر درمیان میں ایک ایسی رشتے داری، ایک ایسا

تعلق، ایک ایسا ناطہ، جو ایک لڑی میں پروئے۔ ملت اسلامیہ کی لڑی۔ گو یہ لڑی بے عملوں کی لڑی تھی۔

اب اپنی زبوں حالی پر آنکھوں کو تو بھیگنا تھا۔ سو جونہی سجدے میں سر گرا وہ بھیگیں اور اشکوں نے جگہ بھگوئی۔ کاش کہیں کوئی انمول ہیرا جنم لے جو اس بکھری ہوئی، ٹکڑوں میں بٹی ہوئی، حرص وہوس اور اقتدار کے پھندوں میں اُلجھی ہوئی ملت کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کردے۔

سلام پھیرا تو اقبال ہونٹوں پر تھا۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اُخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بُتان رنگ و خو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

بھیگتی آنکھوں سے ہی ظہر پڑھی۔ فارغ ہوئی تو مسجد کی اندرونی زیبائش پر نگاہ کی۔ اب کیتھڈرل چرچوں کی رنگینوں اور شوخیوں کا طلسم سر میں سمایا ہوا ہو تو اس بیچاری نے کسی غریب بڑے کی حد درجہ سادی سی لڑکی جیسی ہی دکھنا تھا۔ تاہم اُس کے مینار و گنبد اس کی اندرونی زیبائش میں نیلی ٹائیلوں کا کثرت استعمال اِس گمان میں ڈالتا ہے کہ اِسے استنبول کی شہرہ آفاق نیلی مسجد کی طرح بنانے کی کوشش کی گئی۔

میں نے خود سے ہی یہ سوال کیا تھا۔

''میرا یہ قیافہ بعد میں درست ثابت ہوا۔''

دیکوف کے مطابق مسجد کوئی دو سو سال پرانی ہے۔ دراصل رُوسیوں اور تُرکوں میں آئے دن کی سرحدی جھگڑوں کو نپٹانے اور صلح کروانے میں رُوس کے تاتاریوں کا بڑا کردار ہے۔ یہ

مسجد بھی ایسے ہی کسی خیر سگالی معاہدے کی دین ہے۔ جس کے جوابی نتیجے میں ماسکو نے ترکی میں کلچرل سنٹر اور ترکوں نے یہ مسجد بنائی۔ نیلے رنگ کی کثرت سے اسے نیلی مسجد بھی کہتے ہیں۔ یوں اس کا مرکزی گنبد تو مجھے اسکندریہ کی ابوعباس مسجد جیسا نظر آیا تھا۔

مسجد کے صحن میں بنا ہوا گھر امام مسجد کا ہے۔ خطبہ ماسکو سے منظور ہو کر آتا ہے۔ کیمونسٹ دور میں مسجد خاصی خستہ حال تھی۔ بعد کی حکومتوں نے توجہ دی اور مسلمانوں کے تعاون سے اسے خوبصورت بنا دیا۔

بے عمل سی یہ عورت آنسو بہا کر جیسے ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ مسجد کے قریب ہی گھاس کے خوبصورت لان میں بیٹھ کر کلبسا کھایا۔ ٹن پیک کا کولا پیا۔ شکر الحمد اللہ کہا اور پیٹر اینڈ پال فوٹریس کیلئے چلے۔

باب

25

پیٹر اینڈ پال فوٹریس • زار نکولس دوم کا مقبرہ
اس کی گھریلو زندگی کے چند روپ • دوستوو سکی، لیون ٹراٹسکی
میکسم گورکی کے عقوبت خانے

Пётер И Палски Крепост
Мовзеле Зара Николае Втрой, Чест Его Домашни Жизнь.
Пытка Достоески, Лёненд Траски И Максим Горки.

نیوا کے پانیوں پر تیرتا بیضوی صورت کا یہ چھوٹا سا جزیرہ جو خوبصورت رنگوں والے عمارتی اور نباتاتی حُسن کے ساتھ قریب قریب پڑی چھوٹی بڑی ٹکڑیوں میں منقسم بس کی کھڑکیوں سے اگر ایک سے بڑا دیدہ زیب نظر آتا تو وہیں اگلے لمحے اپنے دُھواں دھار پانی اُچھالتے فواروں کی نقرئی مہین سی چادروں سے اپنی رعنا صورتوں کی چشم پوشی کرتا شاعر کے اُس نازک احساس کا ترجمان بن جاتا۔ جہاں وہ پکار اٹھتا ہے۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

اندر جانے کیلئے ہم لکڑی کے سینٹ جان برج پر آ گئے تھے۔ پُل کی ریلنگ خوبصورت تھی تو نیوا کے کنارے کی ریلنگ خوبصورت ترین۔

پل بہت لمبا تھا۔ سینٹ پال اینڈ پیٹر کیتھڈرل ٹاور اپنی غیر معمولی بلندی کی بنا پر فوراً نگاہوں کی زد میں آتا تھا۔

''تو میں اب سینٹ جان گیٹ سے اندر داخل ہونے والی ہوں۔ اُس قلعے میں جسے پیٹرز برگ کا گہوارہ کہتے ہیں۔''

قدموں کے نیچے وہ جگہ ہے جو اس روایت کی امین ہے کہ جب پیٹر دی گریٹ نے نیوا کے ڈیلٹاؤں پر مستقبل کا ایک تہذیبی شہر آباد کرنے کا فیصلہ کیا تو یہیں 1703ء کے ایک روشن دن اُس نے اپنے سپاہی سے بندوق لی۔

اس کی نال سے زمین پر نشان لگایا اور کہا۔

''بس تو سینٹ پیٹرز برگ یہاں سے شروع ہوگا۔ میری نظریں مستقبل کے اس شہر کی سٹرٹیجک اہمیت اور رُوس پر اس کے دُوررس نتائج کو دیکھتی ہیں۔''

ایک سال میں فصیل کی چھ بُرجیاں کھڑی کر دی گئیں۔ پیٹر دی گریٹ اپنے اس پروجیکٹ کیلئے بڑا حساس تھا۔ اس لئے اُس کے بہت قابل اعتماد ساتھیوں نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ یوں ان برجیوں کو اُن کے نام دیئے گئے۔ آغاز میں فصیل اور بُرجیاں مٹی سے بنائی گئیں 1740ء میں انہیں پختہ کر دیا گیا۔

یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے کہ ایک حکومتی فرمان جاری ہوا کہ رُوس میں کوئی پتھر کی عمارت نہیں بنائی جائے گی۔ معماروں مزدوروں فوجیوں اور جنگی قیدیوں کو نیوا کے ساحلوں پر لائن حاضر کر دیا گیا۔ ہر کشتی اور ہر گھوڑا گاڑی کیلئے لازمی ٹھہرا کہ وہ پتھر کی ایک مخصوص مقدار اپنے ساتھ لائے۔ یہ سٹون ٹول تھا۔

تو ڈھیر سارے وقت، ہاتھوں، دماغوں اور کاوشوں کا حاصل یہ جگہ جس کی فصیل بھی اپنی

ایک تاریخ اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے مختلف النوع عجائب گھر، کہیں خلائی تسخیر، کہیں عماراتی تاریخ، ایک جہاں سمٹا پڑا ہے یہاں۔ ہر چیز قابل دید اور قابل فخر، ان تاریخ سے لبالب بھرے پٹارے کو کیسے کھولوں گی اور کیونکر پڑھ پاؤں گی۔

تو پھر میں دوسرے یعنی سینٹ پیٹرز گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے خود سے کہتی ہوں۔

''مجھے صرف پیٹر اینڈ پال کیتھڈرل دیکھنا ہے جو دراصل زاروں کا شاہی قبرستان ہے اور دوسرے فورٹریس کی اُن کال کوٹھریوں کو جہاں رُوس کی نامور ادبی اور سیاسی شخصیات کو رکھا گیا تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

دو چیزیں بڑی نمایاں ہو کر سامنے آئی تھیں۔ شاہی زاریت کا ''دی اسٹیٹ ایگل'' اپنے دیو ہیکل سائز کے ساتھ آگے بڑھنے سے روکتا تھا۔ لیڈ کا ایک ٹن سے وزن کیا کم ہوگا۔ اُسے دیکھنا پڑا تھا۔ گارڈ ہاؤس کے سامنے پیٹر دی گریٹ کا مجسمہ کرسی پر بیٹھا نظر آیا۔ بھونچکی سی ہو کر میں نے اُسے دیکھا اور دیکھتے ہی ایک جھٹکا کھایا۔

یہ بوڑھا، یہ گنجا، چہرے پر جامد سناٹا لئے یہ پیٹر دی گریٹ ہے۔

ظالموں اتنی ننگی سچائی اور تلخی پر اُترنے کی کیا ضرورت تھی؟ پہلے دلیری، وجاہت، شجاعت، ذہانت و فطانت اور جہانبانی کے مسالموں سے اُس کا رنگ و رُوپ سُلفے کی لاٹ کا سا بنا کر سیاحوں کے قلب و جگر میں گھُسیڑ دیا۔ اب اُس کا یہ روپ یہاں سجا کر اُس کے ذہنی تراشیدہ مجسمے کو پاش پاش کر دیا۔ یوں دیکھو تو ذرا نہیں۔ بڑے تخلیقی بنے پھرتے ہیں۔ یہ میخائل شامیکن کچھ اور بنا کر خود کو نمایاں نہیں کر سکتا تھا۔

اِسے 1992ء میں یہاں نصب کیا گیا۔ آغاز میں بڑی لے دے ہوئی۔ ناقدین کا کہنا تھا کہ یہ تو اُس زار کی شخصیت سے کوئی لگا ہی نہیں کھاتا جو فاتح تھا۔ جو تخلق کار تھا۔ جسکا عزم آہنی تھا اور جو تضادات کا مجموعہ تھا۔

تاہم اِسے ہٹانے کی بجائے یہیں پڑا رہنے دیا گیا حتیٰ کہ اس کی موجودگی معمول کا حصہ بن گئی۔

اُس وقت چند بچے اور چند بڑے اُس کی گنجی ٹنڈ پر ہاتھ پھیرتے کانسی کے اس مجسمے کے پاس مختلف پوزوں میں تصویریں بنواتے ہوئے گزرے کل کی اس عہد ساز شخصیت کے بارے میں خدا جانے کچھ جانتے بھی ہیں یا نہیں۔

''لعنت ہے وزارت سیاحت پر۔ اتنی دلبری شخصیت کی فینٹسی کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے۔'' میں بڑبڑائی تھی۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی کوئی محبوب شخصیت مر جائے تو اُس کا مردہ چہرہ دیکھنے سے دل منکر ہو جاتا ہے کہ یادوں میں بسی شگفتگی اس نئی تبدیلی کو قبول کرنے سے انکاری ہوتی ہے۔ تو عین اُس لمحے میں بھی ایسے ہی جذبات سے دوچار ہوئی تھی۔ بس تو کڑھتی سڑتی آگے بڑھ گئی۔

راستے کے دونوں جانب ملٹری کی بلڈنگز تھیں۔ 1787ء میں پورے قلعے کو گرینائٹ کا پیرھن پہنا دیا گیا جس کی آب وتاب اور شان آج تک اسی طرح قائم ہے۔ سگنل ٹاور فلیگ پول جس پر قلعے کا اپنا جھنڈا لہراتا تھا دیکھتے مرکزی عمارت پیٹر اینڈ پال کیتھڈرل کی طرف بڑھ گئے تھے۔

اندر داخلے سے قبل میں نے گہری تنقیدی نگاہ اُس کے وجود پر ڈالی۔ لکھے ہوئے کے مطابق یہ اپنی صورت میں اٹھارویں صدی کے بحری جہاز کے ڈیزائن جیسی تھی۔ واقعی تھی۔

ہلکے اور گہرے کچے پیلے رنگ کے دلکش امتزاج کی حامل اس عمارت کا سنہری کلس نیچے سے تین بالکونیاں بناتا اُوپر سے سیخ سلائی کی طرح باریک اور نوکیلا ہوتا آسمان کی بیکراں وسعتوں کی طرف کسی گولی کی طرح بھاگتا نظر آتا ہے کہ جیسے آنکھ جھپکتے میں اُس کا سینہ پھاڑ کر کسی آہ مظلوم کی مانند ٹھک سے یزداں کے سینے سے جا لگے گا۔

اس ملمع زدہ 122 میٹر اونچے کلس کی چوٹی پر صلیب تھامے فرشتہ لوگوں کے مطابق شہر کا

محافظ ہے۔

''ہوگا بھئی۔عقیدے اور اعتقادات ہیں اپنے اپنے۔ ہمارے ہاں بھی تو یار لوگوں نے لاہور کی حفاظت داتا صاحب کو سونپ رکھی ہے۔'' بے نیازی سے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

کبھی یہ شہر چھوڑ پورے رُوس کا بلندترین ٹاور تھا۔ پر اب یہ اعزاز ٹی وی ٹاور کو نصیب ہو گیا ہے۔ گردش لیل ونہار کی باتیں ہیں نا۔

اندر جا کر اس کیتھڈرل کی انفرادیت سامنے آئی تھی۔ یہاں آرتھوڈاکس اور کیتھولک دونوں عیسائی فرقوں کے عقائد پہلو بہ پہلو مکمل ہم آہنگی کے خوبصورت امتزاج کے ساتھ نظر آئے تھے۔ اگر آئی وان کی آئی کونسٹ آرائش دیدہ زیب تھی اور کوئین Bath Sheba اور سینٹ الیگزینڈر الیکسی کے شاہکار دِکھتے تھے تو وہیں عنابی ویلوٹ کے منبر بھی تھے جو کیتھولک چرچوں کا ضروری حصہ ہیں۔

خوبصورت کیتھڈرل کا اندرونی حصہ ایک تقریباتی ہال کے طور ڈیزائن ہوا ہے۔ قیمتی گرینائٹ کے مختلف رنگوں کے پیل پائے چرچ کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اس کا دلچسپ حصہ لکڑی کی آراستہ پیراستہ کنوپی کے نیچے وہ جگہ تھی جہاں زار یا زارینہ کھڑے ہوتے تھے۔ منبر زار کے بالکل سامنے ہوتا جو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں پیٹر اینڈ پال اور چاروں انجیل نویسوں (Matthew Mark Luke) اور جان (Jhon) کے چوبی مجسموں سے سجا تھا۔

مقدس رُوح بادلوں میں ہمکتے معصوم بچے کی صورت میں منڈلاتی۔

حقیقتاً چوبی (Carving) کا یہ بہت شاندار اور شاہکار کام تھا۔ جو میں نے وہاں دیکھا اور جسے 1732ء میں تقریباتی رسم کے بعد یہاں سجایا گیا۔

زندگی اگر سونے کے محلوں میں گذاری تو مر کر جہاں لیٹے انہیں بھی قابل دید جگہیں بنا

گئے۔ کیا نفسیات ہے شاہوں کی بھی کہ خود سے وابستہ ہر شے کو عجوبہ بنا دو۔ اب یہ تابوت خانہ کیا کم شاندار تھا، آرٹ کی فنکاریاں یہاں بھی تھیں۔ پیٹر دی گریٹ کے تابوت کے عین سامنے دیوار گیر روپہلی سٹینڈ پر ایک مردہ جسم کے گرد مختلف انداز میں بیٹھے نسوانی کرداروں کے چھوٹے چھوٹے مجسموں میں آرٹ کی جو فنکاری مترشح تھی اس کی کیا بات تھی۔ مدفون والٹ میں تابوت کے گرد سیاہ شاندار ریلنگ، قیمتی سنگ مرمر، کونوں پر طلائی پھول پتے، وسط میں بنے صلیبی نشان، پیٹر کے سرہانے تو پھول بھی تھے اور اُس رجمنٹ کا جھنڈا بھی جس نے سویڈن کی جنگ جیتی تھی۔

خدا کا شکر تھا کہ یہاں شاہوں اور شاہی افراد میں کوئی تخصیص نہیں تھی سبھی سفید ماربل کا یونیفارم پہنے آرام فرماتے ہیں۔ انفرادیت اگر ہے تو الیگزینڈر اور اس کی بیوی ماریا کے تابوتوں میں جو سرخ اور گرے رنگوں میں ہیں۔ یہ دونوں تابوت یورال کے اُن کارکنوں کی طرف سے احسان مندی کا اظہار یہ ہے جو شاہ نے زرعی زمینوں پر ان ہاریوں کی مستقل طوق غلامی کے خاتمے کیلئے سخت قانونی صورت میں لاگو کیا تھا۔

سندھ آنکھوں کے سامنے اُبھرا تھا۔ جنوبی پنجاب اور بلوچستان کب پیچھے تھے۔ چیختے چلاّتے ظلم و بربریت کی کہانیاں سناتے آ گئے تھے۔

اچھے کام بھی خوشبو کی طرح ہیں جن کی مہک صدیوں تک محسوس ہوتی ہے۔ تاریخ کے صفحات پر بکھری اس خوشبو کو میں نے سونگھتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

کاش کوئی میرے ملک میں بھی ایسا جری جنم لے، جو صدیوں پرانے اس کلچر کو ختم کرے اور انسان کو اس کی انسانیت لوٹائے۔

اب بھلا الیگزینڈر دوم کے تابوتوں کے پاس کیوں نہ دیر تک کھڑی ہوتی۔ لوگوں کا زیادہ مجمع انہی دو جگہوں پر تھا۔ پیٹر دی گریٹ کے سامنے یا یہاں اس انقلابی زار کے سامنے۔ وہ تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی کہ لوگوں کا ایک ہجوم بے کراں زار کو گھیرے میں لئے کھڑا ہے۔ داڑھیوں والے بوڑھے رُوسی، جوان لڑکے، زار اوور کوٹ پہنے، سر پر پی کیپ سجائے،

ہاتھوں میں شاہی فرمان پکڑے اصلاحات کا اعلان کر رہا ہے۔

رومانوف خاندان کے اقتدار کا سورج 1917ء کے انقلاب میں ڈوب گیا۔ نکولس دوم بمعہ خاندان اپریل 1918ء یورال میں ایکاترن برگ (Ekaterin Burg) لے جایا گیا جہاں سولہ اور سترہ جولائی کی درمیانی شب کمیونسٹوں نے انہیں بے رحمی سے قتل کر دیا۔

1998ء میں یورال کے اُس سیلر سے اُن کی ہڈیوں کی باقیات یہاں کیتھڈرل لائی گئیں اور انہیں دفنایا گیا۔ 20 اگست 2000ء میں رُوس کے آرتھوڈکس چرچ نے شاہ اور شاہی خاندان کو Passion bearers کا خطاب دیتے ہوئے ان کے اس صبر اور استقامت جس کا اظہار انہوں نے آخری دنوں میں کیا تھا۔ خراج پیش کیا۔

کچھ تم ہی کہو۔ کچھ تم ہی بتاؤ۔ اے چارہ گر۔

عالی مقام اور عالی نسب تھے وہ۔ خون بڑا سُرخ تھا اُن کا۔ اور جو پیلس سکوائیر میں ایک ایک اینٹ پر ڈھیر ہوئے۔ بیچارے کمی کمین تھے نا۔ اُن کا خون سفید تھا۔ واہ مذہب کے ان اجارہ داروں کے پرکھنے کے معیار و پیمانے۔

پر بڑی مصیبت تھی کہ زار زارینہ دونوں آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔ ایک تصویری کہانی متحرک ہو کر میرے ذہنی پردۂ سیمیں پر اُبھر رہی تھی اور میں اُس میں گم ہو رہی تھی۔ پہلا سین کچھ ایسا تھا۔

یہ 1904ء ہے۔ ایک پُر مسرت خاندان چار بیٹیوں اور ایک بیٹے پر مشتمل، دس سالہ بیٹی نے باپ کا بازو محبت سے تھاما ہوا ہے۔ زار نے اپنے قدموں میں بیٹھی سب سے چھوٹی بیٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے۔ زارینہ ماریا گود میں بیٹے کو لئے ہوئے ہے. ایک بیٹی ماں کے بازو سے چمٹی ہوئی اور چوتھی اُس کی ٹانگوں سے جھولتی ہوئی۔ ایک پُر مسرت خوشحال گھرانہ۔

ایک خوبصورت جوڑا اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ پیٹر ہاف کے سبزہ زاروں پر محوِ خرام تھا۔ دوسرا سین آنکھوں کے سامنے تھا۔ زار زارینہ اور بچے، بے حد خوبصورت لباسوں میں ایک

دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے۔ 1906ء کا سال اور سہ پہر کا وقت۔ گھاس پر اُن کے لمبے لمبے سائے نمایاں تھے۔ زارینہ کا لباس، اُس کے ہاتھ میں پکڑی چھتری، چال کا بانکپن، خدمت گاروں کی ایک فوج تعاقب میں۔

زار کی نجی زندگی کا ایک اور خوبصورت مشفق پہلو۔ سال 1917ء تین خوبصورت نوجوان شہزادیاں باپ اور ماں کی پُشت پر کھڑی۔ نوخیز حسین چہرے، بیٹا ماں اور باپ کے قدموں میں بیٹھا ہوا۔ معصوم صورت بچے نے محبت بھرے انداز میں باپ کی ایک ٹانگ اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے رکھی تھی۔ چھوٹی چہیتی اور دُلاری بیٹی باپ کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ ایک محبت بھرا خاندان۔

''ایسی حسین اور دل آویز صورتوں کا قتل۔''

سچ ہے اقتدار کسی کا میت نہیں۔ اس کے سینے میں دل اور جذبات نہیں بے حسی اور پتھر ہوتے ہیں۔

فوٹریس ملٹری مقاصد کیلئے کبھی استعمال نہیں ہوا۔ ہاں البتہ سیاسی قیدیوں اور انہیں اذیتیں دینے کیلئے اسے بڑی موزوں جگہ سمجھا گیا۔ یہ اٹھارویں صدی میں رُوسی زاروں اور بعد میں آنے والی کیمونسٹ حکومتوں کے انداز تھے۔ بیسویں صدی کے وسط اور آخری چند دہائیوں میں پاکستانی حکمرانوں کے طرزِ عمل بھی ایسے ہی تھے۔ اٹک اور لاہور کے شاہی قلعے، ان کی کال کوٹھڑیاں، عقوبت خانے، کہیں راولپنڈی، کہیں اگرتلہ سازش کیسوں میں دانشور، ادیب، شاعر، سیاستدان اور کہیں بھٹو کے جیالے وفادار ننگے بدنوں پر کوڑے کھاتے یادداشتوں میں اُبھرے تھے۔ کہاں فرق تھا۔ کہیں بھی نہیں۔

سینکڑوں سال پہلے بھی یہی سوچ تھی اور آج بھی وہی ذہنیت ہے۔ قومیں وحشی ہوں جاہل ہوں یا متمدّن وتہذیب یافتہ۔ ان کے انداز واطوار اور طریقوں میں رتّی برابر فرق نہیں۔ گوانتاموبے اور ابوغریب کی جیلوں میں صدیوں کی وحشی اور خونخوار تاریخ دہرائی جارہی ہے۔

میرے اُوپر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری تھی جب ہم زردئی اور ہلکے مسٹرڈ رنگوں کی دومنزلہ عمارتوں میں گھرے کشادہ کھلے راستے کو پار کر کے سیاہ آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ لمبے تاریک برآمدے جنکی دیواریں چھت کومحراب درمحراب صورت دیتی بہت دور تک چلی گئی تھیں۔ ٹھنڈے، یخ، سیلن زدہ نیم تاریک کمرے، کال کوٹھڑیوں اورعقوبت خانے۔ان کوٹھریوں میں ایک لوہے کی چارپائی دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی، ایک چھوٹی سی میز کرسی، آہنی سلاخوں والا چھت کے ساتھ جڑا ایک روشن دان۔ کس قدر ہیبت ناک ماحول تھا۔ جون کے مہینے میں خنکی کی لہریں رگ و پے میں اُتر رہی تھیں۔ شدید ٹھنڈ کے مہینوں میں کیا حال ہوتا ہوگا۔

دوسو سال سے اُوپر تک کے عرصے میں رُوسی سلطنت کے ان گنت لوگ اس کے مہمان بنے۔ بے شمار جانوں سے گئے اور کچھ خوش قسمت بچ بھی گئے۔

یہ فروری کے دن تھے اور سن 1718ء کا جب پیٹر اعظم اپنے بیٹے الیکسی کو یہاں لایا۔ اٹھائیس سالہ اکلوتا الیکسی جس کے ساتھ اس کے ڈھیر سارے ساتھی بھی تھے۔ باپ کے خلاف سازشوں اورریشہ دوانیوں کے جرم میں۔

پیٹر ہاف میں پیٹر دی گریٹ کے محل میں دیکھی گئی ایک تصویر میری یاداشتوں میں بجلی کے کسی کوندے کی طرح لپک کر آئی تھی۔ پُر اسرار سانیم تاریک کمرہ، جس کے سفید اور سیاہ شطرنجی ڈیزائن کے فرش کے وسط میں دھری میز پر ایک سُرخ بڑے بڑے پھولوں والے قالین نما کور پر پیٹر دی گریٹ کی ٹوپی، پروں والا ایک قلمدان اور چند کاغذات پڑے ہیں۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ سادہ کرسیوں کی لمبی قطار ہے۔ میز کے سامنے کرسی کا رُخ میز کی سمت سے موڑ لیا گیا ہے۔ اس کرسی پر پیٹر تنگ مہری کی براؤن پینٹ پہنے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا ہے۔ سبز کوٹ جس کے بازوؤں کی اگلی پٹی سرخ اور بڑے بٹنوں سے سجی ہے پہنے ہوئے ہے، سامنے میز کے ساتھ بیٹا کھڑا ہے۔ اُبھری ہوئی غیر معمولی چوڑی پیشانی، ساڑھے چھ فٹی قامت پر دُبلا پتلا جسم جس پر سیاہ ویلوٹ ٹائپ لمبا کوٹ فل بوٹ بالوں کی چندلٹیں گردن پر ہیں۔ نگاہیں جھکی ہوئیں اور

چہرے پر مسکینی کا پورا جام انڈیلا ہوا۔ پر باپ کا انداز دید، اس نگاہ میں کیا کچھ نہ تھا۔ مصور نے اُس کی پوری شخصیت اُن ترچھی نگاہوں میں سمودی تھی۔

اور سچ تو تھا کہ بس اُس کا یہ انداز ہی اس پوری تصویر کی جان تھا۔

یہاں تحقیق ہو رہی تھی۔ سازش بے نقاب ہوگئی تھی۔ وہ سازش جس میں بیٹا باپ کی اصلاحات کا مخالف ہو کر اُس کے خلاف مورچہ بند ہو رہا تھا۔ بیٹا اور ساتھی پکڑے گئے تھے یہیں فوٹریس کے ٹارچر سیل میں دردناک اذیتوں کے بعد باپ کی موجودگی میں بیٹے کو پھانسی کے گھاٹ پر چڑھا دیا گیا تھا۔

آہ یہ تاج و تخت ماضی اور حال کے۔

میں اس وقت Trubetskoi Bastion Prison. میں تھی۔ برآمدوں کا فرش ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ موٹا رف سا لمبا دو فٹ چوڑا میٹ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہ چلنے والوں کیلئے تھا تا کہ جوتے مزید فرش کو خراب نہ کریں اور چیزیں انکی اصلی حالت میں ممکن حد تک نظر آسکیں۔ بوڑھا سا بندوق بردار اور یونیفارم میں ایک کرخت چہرہ یہاں پہرہ داری پر ہیں۔ قیدیوں کے کوٹ اور جوتے بھی نمائش کیلئے رکھے ہوئے ہیں۔

ایک اور تصویر نے بہت متاثر کیا۔

حد درجہ خوبصورت جوان لڑکی رسٹ اور اف وائٹ امتزاج کی لمبی میکسی پہنے کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے عالم حزن و یاس میں کھڑی ہے۔

یہ 1775ء ہے کیتھرائن دی گریٹ یعنی کیتھرائن دوم کا زمانہ ہے جب اُس کے حکم پر ایک نوجوان لڑکی تاراکانویا (Tarakanovei) نامی لائی گئی۔ لڑکی کا دعویٰ تھا کہ وہ ایلزبتھ پیٹرووونہ کی بیٹی اور پیٹر دی گریٹ کی نواسی ہے۔ اس دعوے میں کتنی جان تھی۔ اس کی تحقیق نہیں کی گئی۔ ایلزبتھ پیٹرووونہ انتہائی خوبصورت شہزادی تھی اور جس پر عاشق تھی کوسک الیکسی بھی کمال کا رعنا جوان۔ طویل عرصہ رومان رہا۔ عین ممکن ہے کہ لڑکی اُسی دور کی ہو۔

لڑکی تپ دق کی مریض تھی اور یہی بیماری اس کی موت کا سبب بنی یہ اور بات کہ اُس کی موت کو 1777ء کے سیلاب سے منسوب کرتے ہوئے اِس باب کو بند کر دیا گیا۔

پرترا کا نو وائے تو زندہ ہو گئی تھی، Flavitsky کے ہاتھوں۔

اُنیسویں صدی کے وسط میں دانشور اور ادیب اِن کال کوٹھریوں کی زینت بنے۔ میکسم گورکی، لیون ٹراٹسکی۔ ویرا فگنر (Vera Figner) اور اٹھائیس سالہ دوستووسکی۔

میں باہر نکل آئی تھی۔ وہاں دم گھٹتا تھا۔ چند لمحوں کیلئے میں نے زندگی اور موت کے درمیان اُن کربناک لمحوں کا تصور کیا۔ کہیں پل پل مرنے کی اذیت تھی اور کہیں کیتھڈرل کی گھنٹیوں کی مترنم آوازوں میں زندگی کی آس دیتے ''شاید'' والے لمحوں کی موجودگی تھی دن رات کا کاٹنا گویا ہر لمحہ سولی پر چڑھنا تھا۔ موت اپنے کتنے حربوں سے اُن پر حملے کرتی کہیں کمروں کی سڑانڈ اور غلاظت، کبھی طاعون سے مر جاتے۔ کبھی سیلاب کے ریلے، طوفان، کبھی جسمانی اذیتیں اور کبھی پھانسی کے پھندے سانسوں کا رشتہ توڑ کر جسم و جان کو مصائب سے آزاد کر دیتے۔

قلعے اور اُن سے وابستہ داستانوں کی تاریخ ہمیشہ سے بڑی خوفناک ہے۔ اس کے آخری مہمان صوبائی حکومتوں کے وزراء اور زاروں کے پوتے نواسے تھے۔ اب یہ سب سیاحوں کیلئے ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہوں میں۔

مہرانساء اُوپر چھت کی سیر کرنا چاہتی تھی۔ فصیل اور بُرجیوں کا خوبصورت نظارہ تو سچی بات ہے پوری طرح اُوپر سے ہی ہو سکتا تھا۔ پر نہیں کھوتوں کی طرح صبح سے جُتتے ہوئے تھے اور اب دھڑام سے گرنے والی بات تھی۔

باب

26

لتویا کی انستاسیا • بالٹک ریاستوں پر اظہار خیال • رُوسی شادی بیاہ سوویت دور میں طلباء وطالبات کی لازمی فوجی تربیت کے دو سال

Интация Из Латвия. Руская Свадба.
Студентов Обеязност Слчжит Армию.2, Года,
В Время eeep.

البم کیا کھلا، کلچر اور ثقافت کا ایک پٹارہ کُھل گیا تھا۔ انستاسیا تو کسی مقامی ڈریس کمپنی کی ماڈل لگتی تھی جو لتویا کی نمائندگی کرتی ہو۔

میں نے بھرپور ستائشی نظروں سے البم کے پورے صفحے پر چھپاں اُس کی قدآدم تصویر کو دیکھا تھا۔ اُس کے سنہری بالوں پر تکونی صورت کی خوبصورت کشیدہ کاری سے بجی چھوٹی سی درمیان سے اُبھری ہوئی ٹوپی دھری تھی۔ گھٹنوں سے نیچے بل کھاتا پوری آستین کا فراک اپنے کالروں، کندھوں اور گلے کے اگلے حصّے کی کڑھائی اور گول بڑے سے پیتل کے بٹن سے سجا بہار دکھا رہا تھا۔ کمر کی بیلٹ کا تانبے والا بکل اپنی ساخت، ڈیزائن اور سائز کے اعتبار سے نہ صرف بہت بڑا تھا بلکہ خوبصورت بھی تھا۔ مُسکراتا چہرہ اور اس کی جوانی کا رنگ سب نمایاں تھے۔

’’مجھے تصویر کشی کا جنون ہے۔ یہ میرے کالج کے ایک فنکشن کی تصویر ہے۔ یہ میرا

قومی لباس ہے۔''

لتویا (Latvia) پہاڑوں سے گھری، جنگلوں سے ڈھکی، دلکش جھیلوں سے بجی اور خوبصورت وادیوں کے گل وگلزار میں بسی بالٹک سمندر کے گہرے کٹاؤ میں ایک چھوٹی سی ریپبلک ہے۔

تصویریں بولتی تھیں۔ انستاسیا بولتی تھی۔ مرکزی شہر ریگا (Riga) میں بہنے والے دریاداؤ گاوا کے ساحل پر چڈی اور براہ پہنے اُس کا توبہ شکن حُسن بولتا تھا۔ اتنا خوبصورت جسم جس کا ایک ایک عضو گویا سانچے میں ڈھلا ہو۔ تصویروں کی وہ واقعی دیوانی تھی۔ کہیں جھیل ''کیش'' کے رتیلے کناروں پر اُس کا دھوپ میں لیٹے ہونا۔ صنوبر کے جھنڈوں کے پس منظر میں سُرخ اور بسنتی پھولوں کی گود میں بیٹھے ہونا، کہیں کشتی رانی کرتے ہوئے، منفرد سی ساخت والے چوبی گرجا گھر کے سامنے والدین کے ساتھ، اُس کے کتنے روپ سامنے آئے تھے۔ شہر کی قدامت، زمانوں پرانی اُس کی چھوٹی چھوٹی گلیوں، سڑکوں، شہ نشینوں اور ٹائل کی چھتوں والے گھروں، جنگلوں، پھولوں، شہر کے تھیٹر، سکول، اُس کے والدین، بھائی، بہن، رشتہ دار، سکھی سہیلیوں، سب سے ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ البم کب تھا۔ ریگا (Riga) جیسے قدیم تہذیبی شہر کا بھرپور تعارف تھا۔

اور جب میں تصویروں میں مُست تھی۔ میں نے ایک ایسی تصویر دیکھی جن کی شکلیں نہیں ہاتھ نمایاں تھے جو زنجیر بناتے تھے۔ حیرت سے میں نے پوچھا تھا انستاسیا نے کہا۔

''یہ ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چین کی صورت بالٹک کی تینوں ریاستوں لتویا، استھونیا اور لتھونیا کا سوویت کے غلبے کے خلاف اور آزادی کے لیے احتجاجی مظاہرہ تھا۔''

''پیٹرز برگ میں آپ کیسا محسوس کرتی تھی جب آپ کے لوگ رُوسیوں کے مقابلے پر تھے؟''

''آزادی ہمارا حق تھا۔ جدوجہد سے اُسے واپس لینا ضروری تھا۔ وسط ایشیاء کی ریاستیں تو 1980ء سے سوویت راج کے خلاف سرگرم عمل تھیں۔ بالٹک ریاستوں میں تحریک قدرے دیر

سے شروع ہوئی۔ اُن کا ٹارگٹ اپنے 1940ء سے پہلے والے سٹیٹس کا حصول تھا۔

1990ء میں پہلی بار لتھونیا میں مظاہرین نے پیلے، سرخ اور ہرے رنگوں والے جھنڈے لہرائے۔ مرکزی جگہوں پر قبضہ کیا اور آزادی کا اعلان کر دیا۔ یلسن بھی ایک نمبر شاطر لتھونینوں کی حمایت کی۔ پر رُوسی حکومت ذلالت پر اُتر آئی۔ معاشی پابندیاں جن میں 80% گیس سپلائی کی بندش تھی۔ اب دوسری ریاستیں لیتھونیا کے ساتھ آگے بڑھیں اور اعلان کیا کہ ہم تو آئینی طور پر سوویت کا حصہ ہی نہیں۔ یہ تو اُن کی نری بدمعاشی ہے۔ گورباچوف نے معاشی سہولتوں کی ترغیب اور لولوپوپو (چکنی چپڑی باتیں) سے معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی تڑی بھی لگا دی کہ یہ تمہاری نعرہ بازیاں اور علیحدگی کی دھمکیاں تو میرے کام کو مشکل کر دیں گی۔ میں تمام ریپبلکوں کی بہتری کا خواہاں ہوں۔ وقتی طور پر تحریک دَب سی گئی پر بجھی نہیں۔

1991ء کا آغاز ہی خونی منظروں سے ہوا۔ یلسن نے فوجی دستوں کی مدد چاہی۔ اُس نے معاملے کو اور اُچھال دیا اور مختلف ریپبلکیں سوویت راج کے خلاف ایک دوسرے کی حمایت میں کھڑی ہوگئیں۔ آخری اور فیصلہ کن حمایت تو خود رُوسیوں کی تھی۔ جنہوں نے چلاّ کر حکومت سے کہا۔ دفع کرو انہیں۔ پرے مارو۔ جونکیں چمٹی ہوئی ہیں۔''

اِس میں کوئی شک نہیں کہ رُوسی ریپبلک وسائل کے اعتبار سے امیر ترین تھی۔ لیکن رُوسی کارکنوں کی تنخواہیں اور سہولتیں کچھ ریپبلکوں کے مقابلے میں کم تھیں۔ ماسکو میں حال یہ تھا کہ بلیک مارکیٹ کی خدمات کے بغیر پانی کے نلکے تک کی مرمت نہیں ہوسکتی تھی۔ ڈبل روٹی نہیں ملتی تھی۔ پیٹرزبرگ میں جو اُس وقت لینن گراڈ تھا۔ ہم کھانے کی اشیاء راشن کے ذریعے سے لیتے تھے۔

اُف بہت اَبتر حالات تھے۔ انستاسیا نے جھرجھری سی لی۔

''شاہد کہاں ملے تھے؟''

میں نے اُس کی شادی کا البم اُٹھالیا۔

وہ ہنسی۔ میں پیٹرز برگ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹ تھی۔ بک شاپ پر پہلی ملاقات ہوئی۔ اب ظاہر ہے کہ اِس وقت دو بچوں کے والدین ہیں اور خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں تو ملاقاتیں بڑھی ہوں گی اور اکٹھے رہنا بھی شروع ہو گئے تھے اور ہر قسم کے تعلقات بھی قائم ہو گئے تو بس پھر شادی کا سوچ لیا۔

شادی بڑی رنگ رنگیلی سی تھی۔ کہیں ساڑھی پہنے کھڑی ہے اور اُونچے لمبے لڑکے ہاتھ پھیلائے کچھ مانگتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ ماسکو اور پیٹرز برگ کے ہندوستانی اور پاکستانی طلبہ ہی نہیں دوسری جگہوں سے بھی بہت ساروں نے شرکت کی اور پورے چار دن شادی منائی۔

شادی تو گڈ مڈ ہوئی پڑی تھی۔ ایشیائی کمیونٹی نے اپنا رنگ بیچ میں گھسیڑا ہوا تھا کہ کہیں چست پاجامے کُرتے ڈوپٹے میں بیٹھی تھی اور کہیں غرارہ بہاریں دکھا رہا تھا۔ میرے کہنے پر کہ خالص رُوسی شادی سے روشناس کروائیں۔ انستاسیا نے کہا۔

ہمارا کلچر بھی اپنی قومیتوں اور علاقوں کے حوالے سے تھوڑا بہت مختلف ہے۔ شہروں پر اب یورپی رنگ کے عکس نظر آتے ہیں۔ تاہم کچھ خاص رُوسی رسمیں بھی بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔

ہم دونوں یوں بھی بڑے سوشل اور مہمان نواز ٹائپ کے لوگ تھے اس لئے ہمارے سب دوستوں نے دل کھول کر رنگ رلیاں منائیں اور موج میلے کئے۔

رُوسی شادی کے دو اہم اور خاص آئیٹم ہیں۔ وافر مقدار میں شراب ہونا اور اچھے کھانے کی فراہمی۔

''کیف'' سے ہمارے گہرے دوست نکولائی میخائلوف کا فون تھا۔ جو ہنستے ہوئے کہتا تھا۔

''اب اگر تمہارا خیال ہو کہ ہمیں واڈکا اور بیئر پر ٹرخانا ہے تو سُن لو، شمپئین (Champagne) کے بغیر بات نہیں بنے گی۔ اپنی فریج میں ڈھیر ساری caviare بھی سٹور کر
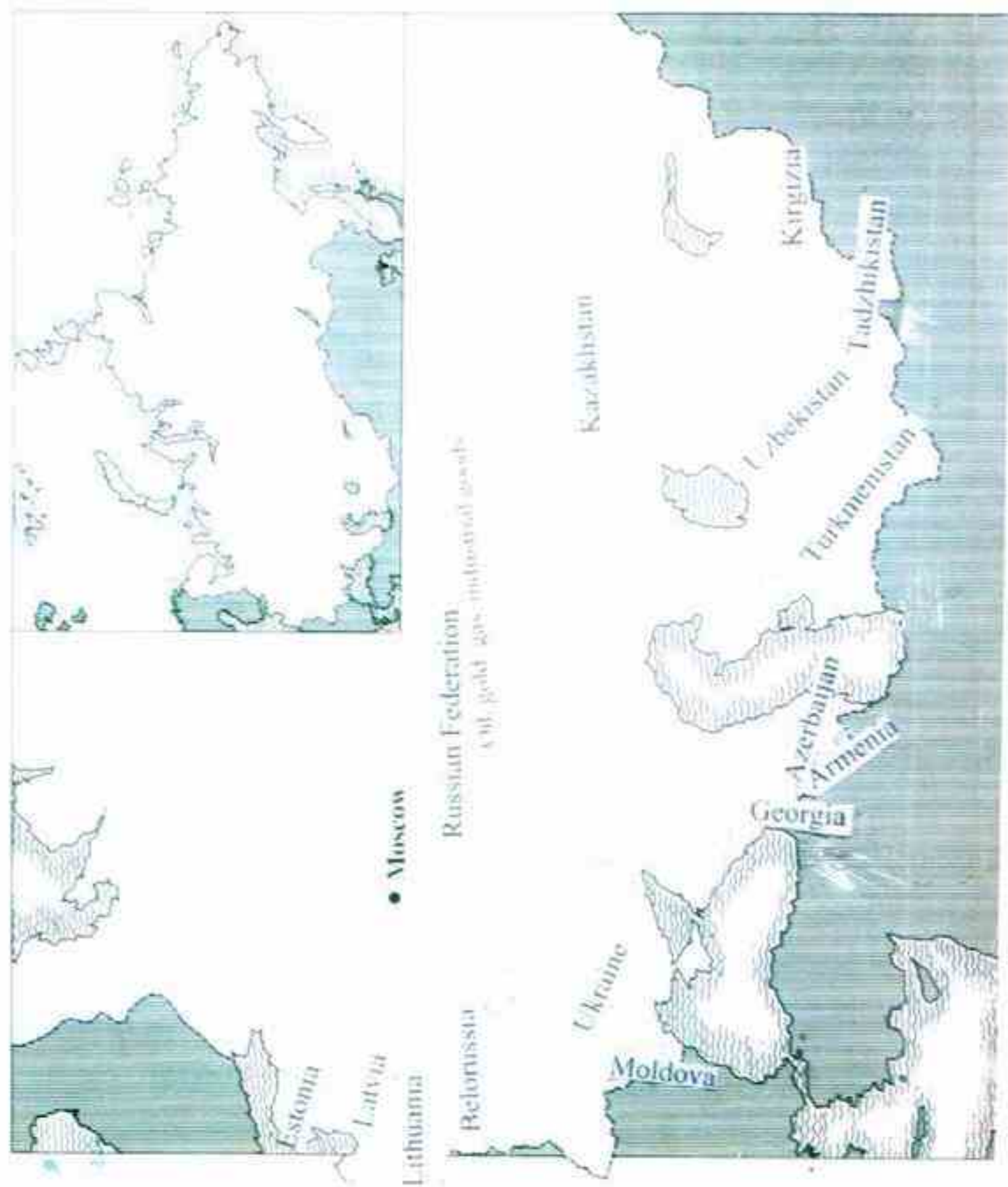
روسی فیڈریشن اور چودہ ریپبلکس

بالٹک ریاستوں لیتھویا، استھونیا اور لیتھونیا کے لوگ اگست 1989ء میں آزادی کیلئے احتجاجی مظاہرہ کرتے ہوئے یکجہتی کے طور پر ہاتھوں کی چین بنا رہے ہیں

چیچن خواتین آزادی کیلئے روسی فوجیوں کے ظلم کے خلاف احتجاج کر رہی ہیں

◀ انستاسیا اور شاہد اپنے پہلے بچے کے ساتھ

لینا۔''

اب اتنے محبت بھرے اصرار ہوں تو پھر سوچنا پڑا۔ ابتر ملکی حالات کے باوجود خاص الخاص دوستوں کے لئے نہ صرف شمپئین کا بندوبست کیا بلکہ شمپئین فلوٹ بھی خریدا۔

البم کے کچھ صفحے پلٹتے ہوئے اُس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''پہلا مرحلہ رجسٹریشن کا ہوتا ہے۔ چرچ میں بھی شادی ہو تب بھی اگر زیگز (Zags) (شادی، موت، پیدائش کا حساب کتاب رکھنے والا ادارہ) میں اندراج نہیں ہوا تو شادی تسلیم نہیں کی جائیگی۔ زیگز اندراج کے بعد کوئی سی تاریخ دیتا ہے۔ پہلا مرحلہ اہم نہیں ہوتا۔ لڑکا لڑکی جا کر بھی تاریخ لے لیتے ہیں۔ پر ہمارے دوستوں نے اسے بھی خاص بنادیا۔''

اُس نے ایک تصویر پر اُنگلی رکھی اور میں نے دیکھا تھا۔ ڈھیر سارے لوگ ایک عمارت کے سامنے دولہا دُلہن کو اپنے نرغے میں لئے کھڑے ہیں۔

دو ماہ بعد کی تاریخ ملی۔

یہ سال 1992ء کا تھا۔ ملک کرائسس کی لپیٹ میں تھا۔ افراط زر اور قحط کے سے حالات تھے۔ پر ہمارے دوستوں نے کسی بات کا اثر نہیں لیا تھا۔ وہ نہ صرف ماسکو سے ہی بلکہ کوئیبشیف، دون، اومسک اور کیف سے مار دھاڑ کرتے آئے۔ جیسے انہیں مل بیٹھنے اور پریشانیوں سے چھٹکارے کے لئے کسی ہلّے گُلّے کی ضرورت تھی۔ اُس وقت گھر بھی چھوٹا تھا۔ تنخواہوں کی بھی بے قاعدگی تھی۔ میں فطرتاً سلیقہ مند عورت ہوں۔ پیسہ ہمیشہ سنبھال کر رکھتی ہوں۔ کچھ میرے پاس تھا اور کچھ ہمارے دوستوں نے بھی تحائف کی صورت میں دیا۔

اب وہ ہمیں ایک ایسی تصویر دکھا رہی تھی جو بہت بڑی تھی۔ یہ زیگز شادی کے لئے جانے کا دن تھا۔ بڑی بڑی گاڑیوں کی ایک قطار تھی۔ رنگا رنگ ربنوں (Ribbns) سے سجی ہوئیں۔

سوویت کے زمانوں میں انگوٹھیوں کی فراہمی سٹیٹ کی ذمہ داری تھی۔ اب ایسا نہیں تھا۔ ہم نے اپنی خریدی ہوئی انگوٹھیاں ایک دوسرے کو پہنائیں۔

تصویر میں دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو انگوٹھیاں پہناتے اور کِس کرتے تھے۔

باہر نکل کر شہر کے گرد چکر لگا۔ ہماری ایک بڑی دلچسپ رسم دُلہن کو گود میں اُٹھا کر کوئی پُل پار کرنا ہوتا ہے۔

پیٹرز برگ کے خوبصورت ترین پُل اوکتنسکایا (Okhtinsky) کا انتخاب ہوا۔ شاہد نے مجھے گود میں اُٹھا کر پُل پار کیا۔

کنارے پر کھڑے مرد و زن کی تالیاں اور قہقہے تھے۔ تصویروں نے یادگار لمحوں کو زندہ کر رکھا تھا۔ اتنی خوبصورت تصویر کشی تھی کہ ایک ایک چہرہ نمایاں تھا۔ اِس سارے وقت میں دولہا کو ایک بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دُلہن اُس کی نظروں کی زد میں رہے۔ اِس سلسلے میں ذرا سی چُوک ہو جانے پر دُلہن کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور پھر بھاری تاوان دولہا کے گلے پڑ جاتا ہے۔ اسے ہم کرازہ نویسٹی (Krazha Nevesty) کہتے ہیں۔ یوں دُلہن کو گود میں بھر کر پُل پار کروانا ہمارے ساحلی علاقوں کا رواج ہے۔ میری خواہش پر یہ رسم شامل ہوئی تھی۔

ویڈنگ ریسپشن جو ہماری رُوسی زبان میں گلیانکا (Gulyanka) ہے۔ شام کو گھر اگر بڑا ہے تو وہاں۔ وگرنہ ہوٹل میں۔

ہمارے پاکستانی اور ہندوستانی دوستوں کا اصرار تھا کہ میں اُن کی بُہو بنی ہوں تو مجھے لباس بھی اُن کا پہننا ہے۔ بس تو ساڑھی پہنی۔ نقلی جواہرات پہنے۔

اچھا تو یہ خوبصورت ساڑھی والی تصویر ریسپشن کی ہے کم از کم دو بالشت چوڑا بناری باڈر تھا۔ اب یہ تو اللہ جانتا ہے سچا تھا یا جھوٹا۔ لمبے لمبے بالے تھے۔ ٹیکا اور ماتھا پٹی تھی۔ گلے میں بڑے اور چھوٹے ہار تھے۔

یہ زیور مسز ورما کا تھا جو انہوں نے عارضی طور پر مجھے پہنایا۔ یوں تھا یہ بھی آرٹیفیشل۔

میں نے ایک تصویر پر اُنگلی رکھی۔ تصویر میں چند لڑکیاں ایک بند نما بڑی سی بریڈ پر درمیان میں رکھی شیشے کی مُنی سی کٹوری میں کچھ سفید سی چیز لئے کھڑی تھیں سفید نمک تھا۔ یہ بڑی

اہم رسم ہے جو نئے جوڑے کی خوشحالی، سلامتی اور درازی عمر کے لئے ادا کی جاتی ہے۔ دولہا دلہن روٹی کا ٹکڑا نمک میں ڈبو کر کھاتے ہیں۔ دونوں کی کوشش بڑا ٹکڑا کاٹنے کی ہوتی ہے۔ جو اس میں کامیاب ہو وہ فیملی کا سربراہ۔

واقعی تصویر میں شاہد اور انستاسیا دونوں اس میں ہلکان ہو رہے تھے۔

یہ رسم بالعموم لڑکی یا لڑکے کے والدین ادا کرتے ہیں۔ پر چونکہ ہماری شادی میں دونوں کے والدین نہیں تھے اس لئے ہمارے دوستوں نے یہ رسم نبھائی۔

''آپ کے والدین کیوں نہیں آئے تھے؟''

میں نے تصویروں پر سے آنکھیں اُٹھائیں۔

''میں نے بلایا نہیں تھا۔'' اُس نے سادگی سے کہا۔ مزید کھوج کی بجائے میں تصویروں پر جھک گئی تھی اور جب ہماری خوشحال زندگی کے لئے جام نوشی شروع ہوئی۔ فضاء میں آوازیں گونجیں۔

''بئیر کھٹی ہے۔ بدمزہ ہے۔ اس کی مٹھاس کا بندوبست ہو۔''

ہنستے ہوئے ہم نے ایک دوسرے کو طویل بوسہ دیا۔ یوں بیئر میٹھی ہوئی۔ ساری رات ہمارے چھوٹے سے گھر میں ہلڑ بازی اور شراب نوشی ہوئی۔ صبح کا منظر کچھ یوں تھا کہ ہر بندہ ادھ موا ہوا کمروں میں صوفوں پر فرش پر برآمدے میں جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا۔

اور یہ تماشا پورے چار دن چلا۔

اس پیارے سے گھر اور گھرانے کے ساتھ ہماری یہ شام یادگار شاموں میں سے ایک تھی۔ کھانے کے اعتبار سے انتہائی بے سوادی۔ پر معلوماتی اور تصویری لحاظ سے لاجواب۔

پیٹر اینڈ پال فوٹریس کی سیر سے فارغ ہو کر جب ہم ستاتے اور بیر وشکی کھاتے تھے۔ میں نے شاہد لوگوں کی طرف جانے کا کہا کہ اب فاصلے کے لحاظ سے عین درمیان میں بیٹھے ہیں۔ کہ چلو ایک تو شام اچھی گذر جائے گی۔ دوسرے شاید رات کا کھانا بھی مل جائے۔

مہر النساء نے کہا۔ ''پہلے فون کرو۔ کام والے لوگ ہیں۔ گھر پر ہیں۔ ہمیں قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہیں یا نہیں۔''

دانشمندانہ بات تھی۔ سو فون کیا۔ اثبات میں جواب ملنے پر گھر جا پہنچے۔

شاہد نے کہا تھا۔ آپ کو آج خاص الخاص رُوسی کھانا کھلاتے ہیں۔

تو جب باورچی خانے میں گئے اور میز کو دیکھا تو وہ بھری ہوئی تھی۔ کرسیوں پر بیٹھے اور ساتھ شاہد کی کمنٹری شروع ہوگئی۔ یہ سُوپ ہے، سلیان کا اور اب پیش کرتے چورنا یا اقرا۔

پتہ چلا تھا کہ یہ کھانا مچھلی کے کالے انڈوں سے بنتا ہے۔

یا اللہ مچھلی کے انڈے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔

انستاسیا نے براؤن بریڈ کے سلائس پر مکھن کی تہہ لگائی۔ شاہد نے پنیر کی ایک لیئر اس پر جمائی اور ان پر چھوٹے چھوٹے سیاہ انڈوں کا جال سا بچھا دیا۔

''ہائے وے ربا پتہ نہیں کیسا ذائقہ ہوگا۔ آنکھیں دیکھتی تھیں اور دل ڈوبتا تھا۔ اور شاہد انڈوں کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا تھا۔ مہنگا ترین کھانے کا آئیٹم، پسندیدہ ترین کھانے کا آئیٹم۔

اب کہیں تو کیسے؟ سلائس پر اس کھیت کو سجانے کی بجائے ویسے ہی ہمیں دے دیتے۔ پر وہ تو ہمیں یہ انمول سوغات کھلانے پر تلے بیٹھے تھے۔ بس تو بائٹ لی۔ یوں محسوس ہوا جیسے انتڑیاں نکل کر باہر آ جائیں گی۔ فوراً پلیٹ میں سجی چیری اُٹھائی اور منہ میں ڈالی۔ اب سوپ میں ڈبکی لگائی۔ شکر ہے کچھ دال دلیا تھا۔ عزت رہ گئی تھی۔ کہیں اُبکائی آ جاتی تو کیا بنتا۔ نظر بچا کر سلائس بائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبا لیا۔ خاک کچھ کھانا تھا۔

اُوپر سے شاہد کا معذرت خواہانہ انداز۔ جلدی میں کچھ نہیں کر سکے۔

''شاہد اور کیا کرنا تھا۔ میز تو بھر دی ہے۔ دراصل مقامی کھانوں کے لئے ہمارا ٹیسٹ بھی تو نہیں ہے۔'' میں نے دلداری کی۔

دراصل مجھے تو انستا سیا کی قربت اور اُس کے ذخیرے سے اتنا کچھ حاصل ہوا تھا کہ لذیذ ترین کھانے اس پر قربان کیے جا سکتے تھے۔

شام کے اِس سیشن کا سب سے زیادہ دلچسپ وہ اپیسوڈ (Episode) تھا جو انستا سیا کی ملٹری ٹریننگ سے متعلقہ تھا۔ دو سالہ لازمی فوجی تربیت سوویت کے مختلف حصوں، کہیں یوکرائن، کہیں بیلا رس، کہیں سائبیریا کے برف زاروں میں نوجوان لڑکیوں کی تربیت کے جان لیوا مراحل۔ میں گُنگ بیٹھی ورق پلٹتے ہوئے سوچے چلی جاتی تھی۔

یہ لوگ اپنی نسلوں کو فولادی انسان بنانے کے متمنی تھے اور بناتے تھے اب؟ اس نئے نظام میں؟ انستا سیا نے لمبی سانس لیتے ہوئے تصویریں سمیٹ دی تھیں اور دُکھ سے بولی تھی۔

اب تم ہماری نئی نسل کو دیکھ تو رہی ہو۔

باب

27

ژوکوفسکی اور کشف المحجوب • اینا بلینڈی اور نیٹ واڈ کا (Neat Vodka)

روسو سٹریٹ اور انچیکو محل

Зуковский И Разоблачель АлмахджуБ
Анна Бландина И Нет Водки
Улидца Русскйи И Анчико , Дверец

شام کی جگمگاتی روشنیوں میں آسٹرووسکایا سکوائیر Ostrovsky Square کی عظیم الشان عمارتوں، شاندار دوکانوں اور ادھر اُدھر گھومتے پھرتے لوگوں کے پُرے دیکھنا کتنا خوبصورت اور دل موہ لینے والا منظر تھا۔

ذراسی بھول ہوگئی تھی۔ اسٹیشن اُنگلیوں پر گننے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے صبر کو بھی بار بار پوچھ پوچھ کر آزمایا کرتے تھے۔ اُس دن شاید زیادہ پُر اعتماد تھے یہ سوچتے ہوئے کہ اب تو میٹرو میں سفر کرتے کرتے بوڑھے ہونے لگے ہیں۔ سدوایا کب آیا اور کب گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ جب اُترے تو مانوسیت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔

''چلو چھوڑو نکلو باہر۔'' ایک دو سٹیشن کا ہی ہیر پھیر ہوگا۔ ہم نے سوچا۔

بالعموم ایسی بھول بہت لطف دیتی تھی۔ فی الفور دوسری سمت جا کر کھڑے ہو جاتے اور

پل جھپکتے میں گڑگڑاتی دھرتی کی آخری تہوں کو ہلاتی شور مچاتی اور ہوائیں اُڑاتی گاڑی ٹھک سے پاؤں کے قریب آ کر رُک جاتی۔

یہ گوستنی داور (Gostiny Dvor) تھا۔ سٹیشن سے نکل کر باہر آئے۔ ''کیتھرائن دی گریٹ'' کے تعمیر کردہ اس تجارتی کمپلیکس کی بھی کیا شان تھی۔ آنکھیں پھٹتی تھیں۔ لومنوسو (Lomonoso) پر تو عماراتی حُسن کی انتہا تھی۔ الیگزینڈرن سکائے تھیٹر اور ملحقہ عمارتیں ماہر تعمیر روسو (Rossi) تعمیری شاہکار ہیں۔ روسو سٹریٹ میں ان عمارتوں کی سمٹری قابل دید تھی اور ان کے رنگ وروپ بھی آنکھوں میں کھُبے جاتے تھے۔

Yeliscev's Shop کی دیواروں پر آرٹ کے شاہکاریوں بکھرے ہوئے تھے کہ جیسے کسی قمیص کا دامن اور بازو دست کاری کی مہارت سے سجا ہو۔ سامنے لمبے لمبے بینچ پڑے تھے۔ اُن پر جا بیٹھے۔ مجھے ہمیشہ یوں بیٹھ کر چپ چاپ ماحول کی سحر انگیزیوں کو دیکھنا اور انہیں اپنے اندر جذب کرنا بہت دلچسپ اور مزے کا شغل لگتا ہے۔

یہ بڑی بڑی دکانیں ان میں خریداری کرتے صاحب ثروت لوگ رُوس کے بورژوائی معاشرے کے عکاس ہیں۔

لیکن اس پُر لطف کام کو کرتے کرتے میرا ذہن پلٹا کھا کر اُس زمانے میں چلا گیا تھا۔ جب کسانوں کی تحریکیں، مزدُوروں کی ہڑتالیں اور رُوس کے طبقاتی حلقوں میں زار شاہی کی مطلق العنانیت کے خلاف متحدہ جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ فیکٹریوں پر تالے لگ رہے تھے۔ مزدوروں کو اٹھا کر باہر پھینکا جا رہا تھا۔ بیروزگار مزدُوروں کی سوچ میں کتنی کڑواہٹ تھی اسے کامریڈ مالسیشیف کے الفاظ میں ذرا سُنیئے۔

''پراسپکٹ نیوسکی کے کنارے آوارہ گردی کرتے ہوئے ہم کس قدر حسرت سے شاندار بگھیوں میں سوار آسودگی سے مالا مال اپر کلاس کے لوگوں کو دیکھا کرتے تھے۔ اُن کے فاخرانہ لباس، اُن کی بگھیوں کی شان وشوکت، اُن میں جُتے خوبصورت اور پلے ہوئے گھوڑے کیسے ہمارا

کلیجہ جلاتے تھے؟

آسٹروو سکائے سکوائر، سادوو ایا اور گوسٹن روڈ پر اُن کے جھتے دکانوں پر خریداریاں کرتے۔ ہم جیسے کتنے مزدور اُن کا سامان اٹھائے ان کے عالیشان گھروں تک جاتے۔ اِن دکانوں اِن سٹوروں پر موجود تمام اشیاء سرمایہ داروں کی بنائی ہوئی اور امیروں کے لئے ہی تھیں۔ ہماری جیب میں روبل چھوڑ کوپک بھی نہ ہوتا کہ ایک پیروشکی ہی خرید لیتے۔ دل میں کیسے کیسے طوفان اٹھتے۔ پھر یوں ہوتا ہم قسمیں کھاتے بورژوا کلاس کو لعن طعن کر کے اپنے جذبات کو ٹھنڈا کرتے اور بانہوں میں بانہیں ڈال کر نوسکی سے منہ موڑ لیتے۔

اللہ یہ محرومیاں کیسے کیسے جان و دل جلاتی ہیں۔ ہر دور ہر عہد کا محروم انسان ان جذبات واحساسات سے گذرتا رہا ہے۔ مئی جون کی تپتی دوپہروں میں کالج واپسی پر گھنٹوں بس کے انتظار میں کھڑے ہونا اور قریب سے گذرتی کاروں کو دیکھنا کتنے دل گردے کا کام تھا کہ اُس وقت میرا جی یہی چاہا کرتا تھا کہ اینٹیں مار مار کر ان کا توبھرتہ بنادو۔"

مجھے کیا کیا نہیں یاد آیا تھا۔

پتہ نہیں انقلاب نے انہیں کچھ دیا بھی یا وہ اپنی حسرتوں کے ساتھ ہی زمین کے سینے میں اُتر گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم الیگزینڈرن سکائے (Alxexandrin) تھیٹر کی خوبصورت عمارت دیکھنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آسٹروو سکی سکوائر کی خوبصورت ترین عمارتوں میں سے ایک یہ تھیٹر بھی ہے جو رُوس کی عظیم تعمیری کلاسیکل روایات کا امین ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹرزبرگ کا لینڈ مارک بھی ہے۔ دائیں بائیں شاندار عمارتوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے سچی بات ہے کہ ان کی پیشانیوں کے وقار، دبدبوں اور حُسن میں بے شمار ہنرمندوں کے ہاتھ ہیں۔

الزبتھ پٹرو ونہ کے لئے بنایا گیا انچیکو و پیلس اگر ایک طرف سے آسٹروسکائے پیلس کی خوبصورتی سے خود کو متاثر کرتا ہے تو دوسری سمت فونٹینیکا نہر کے نظارے بھی اس کے حُسن کی

رنگینی کو تازگی اور رعنائی دیتے ہیں۔

یوں یہ محل کسی بادشاہ کے حرم کی سینکڑوں بیویوں اور لونڈیوں میں سے اُس ایک کی طرح ہی تھا کہ جس کا نام کبھی کبھار شاہ کی شب بسری کے لئے منتخب ہوتا تھا۔ اکتوبر انقلاب سے پہلے شاہی خاندان بھی سال میں ایک آدھ دفعہ اسے رونق بخشنے اور اس کی عزت افزائی کے لئے یہاں آ کر ٹھہرتا تھا۔

اور اب اس پر کیا تبصرہ آرائی ہو کہ خیر سے ملکہ محترمہ نے یہ محل اپنے محبوب الیکسی راظمو سکائے (Razumovsky) کو پیش کیا تھا۔ الیکسی انتہا درجے کا خوبصورت اور دلبر نوجوان تھا۔ نسلاً وہ کوسک (Cossuck) تھا۔ کوسک اُن رُوسی اور یوکرائنی کسان غلاموں کی اولاد تھے۔ جو اپنے آقاؤں سے فرار ہونے کے باعث رُوس کے جنوبی اور مشرقی ویران سرحدی خطوں میں آباد ہو گئے تھے اور روس کے تُرک اور پولش دشمنوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔

ان کا پس منظر زبردست فوجی روایات کا حامل تھا۔ انہیں بالعموم زاروں کی مخالفت کرنے والوں، ہڑتالوں اور مظاہرین کے خلاف پولیس کے معاون و مددگار کے طور پر تعینات کیا جاتا تھا۔

یونہی نظر بازی کرتے کرتے ہم درختوں اور گھاس کے قطعوں سے گھرے سکوائر میں آ گئے۔ میلے کا سا منظر تھا یہاں۔ رنگوں کی دُنیا تھی۔ ٹولیاں تھیں لوگوں کی یہاں وہاں بکھری ہوئیں جیسے کسی نے خوبصورت رنگا رنگ موتی فضا میں اُچھال دیئے ہوں۔ کھانے پینے کے شغل تھے۔

سکوائر کے وسط میں براؤن اور سیاہی مائل گرے گرینائیٹ کے چبوترے پر کیتھرائین دی گریٹ اپنے بھاری بھرکم پہناووں کے ساتھ تمکنت سے کھڑی ہے۔ جاہ و جلال ایک ایک شے سے ٹپکتا ہے۔ ٹاور کے قدموں میں اس کے وقتوں کی اہم شخصیتیں موجود ہیں۔ ملٹری کمانڈرز، سائنس دان، آرٹسٹ، موسیقار۔ کھڑے اور بیٹھے۔ یہ یادگار یہاں 1873ء میں نصب کی گئی۔ اور یہ اسے بے حد خوبصورتی دیتی ہے۔

Yeliseev ایک ایسی مارکیٹ ہے جس کے مالک پیٹرز برگ کے مشہور و معروف تاجر ہیں۔

یہیں سے ہم نوسکی پراسپکٹ میں آ گئے تھے۔

ملحقہ گلیوں میں گھستے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ایک بہت بڑی بک شاپ انجلیا (Anglia) نظر آئی۔ اندر گئے۔ دوکان تھی یا کتابوں کا ایک محل تھا۔ انگریزی کے سیکشن میں ایک سانولا سلونا مرد نظر آیا۔ مقناطیس کی طرح میں اُس کی طرف بڑھی۔ انڈین تھا اور دس سال سے رُوس میں تھا۔ کوئی چار سال ماسکو رہا پھر یہاں آ گیا۔

رُوسی مزاج کی تھوڑی بہت نمائندگی کے بارے میں کسی کتاب پر اُس کی راہنمائی مانگی گئی۔ وہ تیزی سے پلٹ کر خوبصورت شیلفوں کی طرف مڑا اور ایک کتاب نکال کر لایا۔

نیٹ واڈ کا (Neat Vodka) مصنفہ اینا بلینڈی تھی۔ خوبصورت کتاب ہے۔ ارون نے کہا۔ ٹائٹل پر رُوسی میتھروسکا ڈول (Mathryska Doll) بنی ہوئی تھی۔

الماریاں کلاسیکل لٹریچر سے بھری ہوئی تھیں۔ اتنی موٹی اتنی ضخیم۔ میرے لئے اُنہیں خریدنا آسان، اُٹھانا دُشوار۔

ارون نے ایک سمت اشارہ کیا۔ میری نظریں اُس تعاقب میں اُوپر سے نیچے تک آئی تھیں۔

گوگول، گورکی، چیخوف، ٹالسٹائی، دوستوفسکی، پُشکن، ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔

چارلس ڈکنز، تھامس ہارڈی، برنارڈ شا، وکٹر ہیوگو، شیکسپیئر، موپساں، فلوبیئر اور زولا کے رُوسی تراجم سے بجی الماریاں میں نے ارون کی نشان دہی پر دیکھیں۔

پڑھنے کی دیوانی ہے یہ قوم۔ مغرب میں چھپنے والی ہر اچھی کتاب کو پبلیشرز نے ترجمہ کر کے چھاپ لینا ہے۔ نہ انہیں مصنف کی اجازت کی ضرورت ہے اور نہ پبلیشرز کی۔ یہ کسی قسم کے

اخلاقی ضابطے کے پابند نہیں اور نہ انہیں کوئی پرواہ ہے۔

یہ تو ہندوستان پاکستان والا معاملہ ہے۔ میں ہنس پڑی۔

اروِن نے بھی ہنستے ہوئے تائید کی۔

اروِن کے بتانے پر میں نے بورس اور مارشک کے انگریزی تراجم بھی دیکھے۔ بورس کی آخری عمر ترجمے کرنے میں ہی گزری تھی۔

اروِن سے میں نے کشف المحجوب کے بارے میں پوچھا۔ ژوکوفسکی جیسے ماہر شرقیات کا ایک عظیم کارنامہ۔

لیکن اروِن لاعلم تھا۔ بلکہ اُس نے کہا کہ وہ پہلی مرتبہ یہ سن رہا ہے۔ ژوکوفسکی کا نام البتہ اُس نے ضرور سنا ہوا ہے۔

اور پھر اس درخواست پر کہ کیا وہ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرسکتا ہے۔ اُس نے وعدہ کیا تھا۔ یوں اپنے طور پر میں نے بھی طے کر رکھا تھا کہ مجھے تھوڑا سا وقت نکال کر پیٹرز برگ کی لائبریری میں ضرور جانا ہے اور اُس عظیم کتاب کو دیکھنا ہے۔

سالوں پہلے کہیں ستار طاہر سے باتیں کرتے ہوئے سُنا تھا کہ کشف المحجوب کا بڑا مستند ترین ایڈیشن ژوکوفسکی کا مرتب کردہ ہے۔ انہوں نے اُس کی ترتیب اور تکمیل وتدوین میں بُہت سال لگائے اور بُہت محنت کی۔ غالباً 1905ء میں ژوکوفسکی کے طویل دیباچے کے ساتھ یہ شائع ہوا۔ ژوکوفسکی کی وفات کے بعد سوویت حکومت نے اِسے کچھ مزید اضافوں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا تھا۔ اس کے چند ایک نسخے لینن گراڈ اور تاشقند کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

''تو اب جب یہاں آ گئی ہوں تو چلتے چلتے اُس عظیم کتاب کو بوسہ اور ژوکوفسکی کو خراج تحسین تو پیش کرتی جاؤں۔''

باب

28

تے شوقن محلاں دی...... میرن سکائے تھیٹر میں ایک شام

برج لفٹنگ...... بورس پاسترنک کے ساتھ چند لمحے

Жаркой Женшина
Вечер В Миранском Театере
Магновения С Борие Пастром

میں تو اُس وقت چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی کھڑکی کے شیشوں سے باہر سہ طرفی بلند عمارتوں کے بنریوں میں پھنسے آسمان کے چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھتی تھی جو روشن تھا۔خوب نیلا تھا۔ جب میں نے سنا اور محسوس کیا کہ آواز میں خفگی ہی نہیں ۔رعد کی سی کڑک بھی ہے۔تعاقب میں الٹی میٹم میں لپٹے الفاظ دوڑتے چلے آئے تھے۔

''واپسی میں بس دو دن ہیں ۔کل ہفتہ اور پرسوں اتوار اور ابھی تک کیتھرائن دی گریٹ کا محل Tsarkoye Selo سارسکائیوسیلو نہیں دیکھا۔نہیں جاؤ گی تو میں اکیلی ہی نکل جاؤں گی۔''

تپ سی تپ چڑھی تھی۔مانو جیسے تن میں غصے سے بھرا اُبال سا اُٹھنے لگا۔بات ہی ایسی تھی۔شاید اسی لئے میری زبان بھی گڑگڑاہٹ میں ڈولنے لگی۔

اپنے لئے کچن سے چائے کا دوسرا کپ لاتے ہوئے مہر النساء کرسی پر بعد میں بیٹھی اور یہ سب بولی پہلے تھی۔

''نہ ابھی کسر باقی ہے۔ رجی نہیں ہو سونا دیکھ دیکھ کر۔''

میں بھی پھٹ پڑی تھی۔

''یہی بات ہے کمبخت ان زاروں اور اُن کی آل اولادوں نے غریبوں کی ہڈیوں اور خون پسینوں کی کمائیوں پر جو اپنے محل مینارے کھڑے کرنے اور انہیں سونے سے پیلا کرنے کا سلسلہ شروع کیا وہ کہیں رُکنے اور کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ کہیں کسی محل میں تو شاید رتی برابر جگہ خالی ہی ہوگی پر اس کیتھرائن دوم یعنی کیتھرائن دی گریٹ نے تو غضب ڈھایا ہے۔ ایک انچ جگہ ایسی نہیں جہاں سونا نہ مڑھا ہو۔ سارے زار ایک دوسرے کو مات دینے پر تلے ہوئے تھے۔ پیٹرز برگ کی اینٹ اُٹھاؤ نیچے سے آنکھوں کو خیرہ کرتا محل برآمد ہوتا ہے۔''

''تم جیسی فُقری نے اسی انداز میں سوچنا ہے۔ یہاں تو بس یہی کچھ تھا۔ آئی کیا کرنے تھیں؟''

''چلو شکر ہے کہ تم تو ہوئیں ناڈچز آف ونڈسر کی پوتی۔''

پھر سوچا۔ لعنت ڈالو۔ مٹی پاؤ اس چخ چخ تخ تخ پر۔ بڑھاپے میں داخل ان دو عورتوں کا ایک دوسرے کو برداشت کئے جانا بھی تو بڑا معرکہ ہے۔

کمر سیدھی کروں۔ بیچاری سیاحت کی مشقتوں کے ہاتھوں تختہ ہوئی پڑی ہے۔

گھنٹہ بھر آرام کے بعد سوچا۔

''اب اُٹھوں اور ٹکٹوں کا پتہ کروں۔''

جب آئے تھے ریسیپشن پر کوئی نہیں تھا اور جب مہر النساء چائے کا خالی کپ تپائی پر رکھ رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر کہ تم نے ٹکٹوں کا پتہ کیا اُس نے رکھائی سے کہا تھا۔

''کوئی ہوتا بھی وہاں۔ اب دیواروں سے تو پوچھنے سے رہی؟''

''غصہ کیسے ناک پر دھرا ہے؟ چلو کوئی بات ہوئی۔ بول برار ہوا۔ تُو تو میں میں بھی ہوگئی۔ ٹھیک۔ بھئی ہوگئی۔ اب ختم کرو۔ جانے دو۔ بیٹھی غصہ پیس رہی ہے۔ پیسو۔ جہنم میں جاؤ۔''

میں تپتی بلتی اٹھی۔ اپنا اور اُس کا چائے کا کپ اٹھایا۔ کچن میں جا کر انہیں دھویا۔ ریک پر لٹکایا۔ ریسیپشن پر آئی۔

چلو شکر مسٹر پال وہاں تھے۔ میری صورت دیکھتے ہی اُنہوں نے ٹکٹ کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ 3800 فی کس روبل والا ٹکٹ اٹھاتے ہوئے میرے دل کو صبح کی طرح پھر دھچکا لگا تھا۔ صبح کی طرح اب پھر اس کا اظہار ہو گیا۔

مسٹر پال کا لہجہ عام رُوسیوں کے برعکس نرم اور میٹھا تھا۔

''آپ نے رُوسی بیلے اور اوپیرا نہیں دیکھا۔ تھیٹر سے باہر آنے پر آپ کا ردعمل مختلف ہوگا۔ خود سے یہ کہے بغیر کہ اگر یہ نہ دیکھتی تو رُوس آنا بیکار ہوتا ممکن ہی نہیں۔ رُوسی بیلے میں جو مہارت جو حسن اور جو کمال ہے وہ دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ یہ درست ہے کہ بیلے کا آغاز اٹلی میں ہوا مگر اسے فن کی انتہاؤں تک لے جانے میں رُوس کا کردار ہے۔ آپ موسیقی پر سر دُھنیں گی۔ آپ فنکاروں کے حُسن اور ان کی ادائیگی سراہیں گی۔ آپ اُس خوابناک ماحول پر واری صدقے ہوں گی۔ آپ کو تو سمجھ ہی نہیں آئے گی کہ کریں کیا۔ کل میرے اس سوال کے جواب کیلئے تیار رہیے کہ آپ کو ٹکٹ مہنگا لگا یا سستا۔''

میں مسکرا دی تھی۔ ''چلو تو ہاتھ کنگن کو آرسی کرتے ہیں۔''

ابھی میں نے رُخ بدلا ہی تھا۔ ابھی میری پشت بمشکل مسٹر پال کی جانب ہوئی ہی ہوگی جب اُن کی آواز نے میرے بڑھتے قدموں کو روک کر مجھے دوبارہ اُن کی طرف دیکھنے پر متوجہ کیا تھا۔

ہلکی سی مسکراہٹ اُن کے لبوں پر بکھری ہوئی تھی جب انہوں نے کہا تھا۔

''ایک تو کوشش کیجئے کہ آپ کچھ پھول اپنے ساتھ لے کر جائیں۔ شو کے بعد آرٹسٹوں کو پیش کر کے اپنی تصاویر اُن کے ساتھ ضرور بنوائیں۔ دوسرے اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر جائیے۔ بیلے اُوپیرا کلاسیک روایات کا حامل ہے۔ اُس کے چلن میں رکھ رکھاؤ اور شاہانہ رنگ ڈھنگ کا امتزاج ضروری ہے۔

بظاہر میں نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپسی کی۔ پر اپنے کمرے میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑی دھیمی سی تنبیہی سرگوشی اپنے آپ سے کی تھی۔

''اب بھلا مجھ نگوڑی اُجڈ جاہل اور گنوار عورت کو ان سب کا کہاں علم تھا؟ چلو پھولوں کے لئے تو سو پچاس روبل کی قربانی خیر صلاّ۔ پر اب ان ننگے بُچّے ہاتھ کانوں کا کیا کروں۔ اور ڈھنگ کے دو تین سوٹ جنہیں آج کے دن پہنا جا سکتا تھا وہ تو ماسکو میں ہی چھوڑ آئی۔ ہلکی ہونے کا بڑا شوق تھا نا مجھے۔ بدرنگے میل خورے سے یہ تین جوڑے ہفتہ بھر کے لئے کافی سمجھتے ہوئے اُٹھا لائی۔

پھر اُٹھی۔ ایک جوڑا جسے شام کو دھویا تھا اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ پریس کرنے سے یہ کتنا دیدہ زیب لگ سکتا ہے؟ اس امکان پر غور کیا۔

اُس سمے میرا جی جوڑے کو چولہے میں جھونک دینے کو چاہ رہا تھا۔ ساتھ میں ڈالروں کی تھیلی بھی۔

''کمبخت تو نے صرفے کرتی کرتی مر جانا ہے۔ ساری زندگی تیرے پاس چج صواد (ڈھنگ) کا کپڑا نہ ہوا۔ تیرے کانوں ہاتھوں میں رتی بھر سونا نہ سجا۔ کرلے بچتیں۔''

کچھ دیر کھولتی رہی۔ پھر خود کو نارمل کیا۔ چلو جو ہے اُسے طریقے سلیقے سے تو پہنوں۔

میرن سکائے تھیٹر (The Marinsky Theater) وہیں سینٹ آ یزک کیتھڈرل سے ذرا آگے پوسٹ آفس کے پاس نیو ہالینڈ کے سامنے ہے۔

مہرالنساء بیڈ پر چت لیٹی تھی۔ میں نے ٹکٹ اُس کے سینے پر پھنکا۔ اور کہا۔

''پروگرام کا سے سات ہے۔ چھ بجے یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

اُسے سجنے سنورنے کا کہنا فضول تھا کہ وہ تولیپا پوتی اور کنگھی پٹی کے بغیر باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''اور کھانا۔''

اُس نے گولی کی طرح اٹھتے ہوئے کہا۔

''Idiot ایڈیٹ وتحیٹیرئن ہے۔ دوستووسکی کا پسندیدہ ہوٹل۔ فارغ ہوکر وہاں جائیں گے۔''

غصے میں وہ شاہد کے ہاں کھائی گئی بوٹیاں یکسر بھول گئی تھی۔

''کچھ خوف خدا کرو۔ سات دن ہوتے ہیں دانتوں تلے بوٹی نہیں آئی۔''

''اللہ ماری بوٹیوں کی یہاں کیا کمی ہے؟ پر اُن کے ساتھ جو مسئلے مسائل جڑے ہیں۔ اُن پر خود سوچ لو۔''

اس کی دکھتی رگ تو میرے ہاتھ میں ہی تھی سو اسی کو پکڑ لیا۔

صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

اب تیاری کی کیا تفصیل بتاؤں؟ شکر ہے جوتا ڈھنگ کا تھا۔ جی جان سے پریس کیا ہوا جوڑا تھوڑا بہت سج ہی گیا۔ لپ اسٹک پوروں پر لگا کر گالوں پر بھی لگالی اور ہونٹوں پر بھی۔ گھنے بالوں کی مونڈھی سی مروڑنے کی بجائے انہیں کھلا چھوڑ دیا۔ اپنے حسابوں میں نے بیلے کو ضرورت سے زیادہ احترام دے دیا تھا۔

میرن سکائے تھیٹر تو مبہوت کرنے والی عمارت تھی۔ روشنیاں اسکے مختلف حصوں پر جس جس انداز میں منعکس ہورہی تھیں۔ انہوں نے بلڈنگ کو مختلف شیڈ دیتے ہوئے اِسے پُراسراریت بھی دے رکھی تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جس میں شامل ہم بھی بہتے چلے جارہے تھے۔ ٹکٹ ضرور ہاتھ میں تھے پر جانتے کچھ نہیں تھے۔ ایک جادونگری تھی۔ اب اس کے سوا کیا

چارہ تھا کہ تیزی سے بھاگتے لوگوں کو بلا تکلف بازو سے پکڑ کر روک لیں۔ ٹکٹ دکھائیں اور رہنمائی چاہیں۔ کچھ اگر دھتکار کر آگے بڑھ جائیں تو ذرا افسردہ اور ملول نہ ہوں کہ کوئی اللہ کا بندہ رُکے گا بھی۔ ہمارا تو روز کا ہی یہ وطیرہ تھا۔ چلو ایک جوڑے نے ہاتھ تھام لئے اور آڈیٹوریم میں لے گئے۔

آڈیٹوریم کیا تھا۔ ایک طلسماتی نگار خانہ تھا۔ ہماری بیچاری غریبڑی سی آنکھیں ایسے پر شکوہ تھیٹروں کی کہاں عادی؟ پھٹی جا رہی تھیں۔ یہ ڈر الگ جان کھائے جا رہا تھا کہ کہیں یہ نظر بازی اوندھے منہ گرا کر کسی گئے گوڈے کو نہ توڑ بیٹھے۔ اور پردیس میں نوا (نیا) سیاپا پڑ جائے۔ جوڑا بھی بڑا پیبا تھا۔ ٹکٹوں کے نمبر دیکھ کر بوڑھیوں کو ٹھکانے لگا کر پھر کہیں اپنی نشستوں کی طرف گیا۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد ذرا اپنا سانس درست کیا۔ پسینہ پونچھا اور تھوڑی دیر تفصیلاً دائیں بائیں دیکھا۔

میرن سکائے تھیٹر نے اپنے پہلے سیزن کا آغاز 2 اکتوبر 1860ء میں کیا۔ میخائل گلنکا (Mikhail Glinka) کا پہلا اوپیرا A life for the Tsar جس کی موسیقی مشہور روسی کمپوزر رمسکائے نے دی۔ اینا پاولیوا (Anna Pavlova) ماتھیلڈا (Mathilda) گیلینا اُولانوا (Galina Ulanova) اور تیمرا (Tamara) شہرہ آفاق ڈانسر جنہوں نے رقص کی دنیا میں تہلکہ مچایا۔ اینا پاولیوا تو اپنی زندگی میں ہی ایک لیجنڈری کردار بن گئی تھی۔ اس کے پیر نہیں تھے پر تھے۔ وہ ایک گیت تھی۔ فضاؤں میں تھرکتا خوشی و انبساط بکھیرتا گیت۔ جس کے نام پر ٹکٹ بکتے اور تھیٹر کچا کھچ بھرتے۔

الیگزینڈر Benios بھی ایک ایسا ہی آرٹسٹ تھا جس نے بے شمار پروڈکشنز کے ساتھ سٹیج اور حتیٰ کہ پردوں تک کی ڈیزائننگ میں ندرت کی۔ یہ سٹائل اور ڈیزائن آج تک قائم ہے۔

رشین سکول آف اوپیرا نے بھی اسے سنوارنے میں بہت کام کیا۔ اور مشہور موسیقار ویلری (Valery) کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔

پانچ منزلہ سیمی سرکل سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ ہال بھی فل تھا۔ جب میں دیدے گھما گھما کر دائیں بائیں اُوپر نیچے دیکھتی تھی۔ مجھے چھت نظر آئی تھی۔ گولائی میں نقش ونگاری سے بجی لاجواب سی۔

سٹیج کی سجاوٹ اور اس کے پردے۔ تہہ در تہہ زردوزی اور پیچ ورک کا کام۔ ہر تہہ کے بعد ایک نیا رنگ نیا ڈیزائن۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں والی کیفیت تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں کہ مجھے محسوس ہوا تھا اب اُن میں مزید کچھ جذب کرنے کا یارا نہیں تھا کہ میری ہر بار کی نظر میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہورہا تھا۔ اطراف میں قد آدم آئینے طلائی اور چوبی ڈیزائن کے عمدہ نمونے تھے۔

The Swan Lake صدی پہلے کی کہانی جو کل بھی بہت پسندیدہ تھی اور آج بھی۔ The Sleeping Beauty بھی سٹیج ہورہی تھی۔ یہیں۔ اسی جگہ۔ پر دن گیارہ جون کا تھا اور ہم نے یہاں نہیں ہونا تھا۔

الفاظ کب ہیں میرے پاس جو میرے اُن تاثرات کو لکھیں جو میں نے اُس شب دیکھے۔ اب مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں زمین پر تو ہوں نہیں۔ کہیں کسی ماورائی دنیا میں ہوں۔ جیسے میرے سامنے کوئی تخیلاتی دنیا ہو۔ یوں جیسے میں ایلس ان ونڈر لینڈ کی طرح کسی انوکھی، کسی نرالی سرزمین پر جا نکلی ہوں۔ جہاں مرمریں بازو اور سبک سر وجود فضا میں جل پریوں کی طرح تیر رہے تھے۔ فرش کو اگر چھوا ہے تو لمحہ بھر پنجوں نے۔ کہتے ہیں کہ یہ ڈانس پیروں کے پنجوں پر ہوتا ہے پر کہاں؟ یہاں تو جیسے فضا میں تتلیوں کا رقص ہے۔ پانچ نہیں دس نہیں درجنوں حسین مہ لقا ہیں فضاؤں میں ہواؤں میں تیر رہی ہیں۔

اُن کے پیرہن اُن کی زیبائش اور رنگا رنگی۔ کس کو دیکھوں کس کو چھوڑوں؟ اُن کے وجود یوں لگتا تھا جیسے یونہی اُڑتے پھرتے، ناچتے ناچتے فضا میں تحلیل ہوجائیں گے موسیقی کا سحر جیسے پوری کائنات کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھا۔ کبھی یہ سُر بادِ صبا کے نرم ملائم جھونکوں کی طرح

محسوس ہوتے۔ یوں جیسے یہ پھولوں کے تختوں پر سے دھیرے دھیرے بہتے ہوں جیسے ندی کے سُبک خرام پانی ہلکی ہلکی سی گنگناہٹ سے رواں دواں ہوں۔ جھیل چاند درخت اور بیلے جنگل سبھی وہاں پیدا ہو گئے۔ بے چین مضطرب انتہاؤں کو چھونے والے حُسن کا مالک شہزادہ آسمان میں چھلانگیں مارتا نمودار ہوتا ہے۔

پھر کہیں سے ولن نمودار ہوا۔ ایک دیو پیکر۔ لڑائی ہوتی ہے۔ دل دہلانے تڑپانے اور مضطرب کرنے والے جانگسل لمحات۔ موسیقی کے سُر تال رعد و برق جیسی کیفیات کے نمائندے ہوئے۔ ایسی تیز آوازیں جیسے بادل گرجتے ہوں۔ کہیں طوفان اُٹھتے ہوں۔ خدایا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔

پھر خوشگوار انجام۔ محبت کا فتح یاب ہونا۔ دونوں محبت کرنے والوں کا خوبصورت ملاپ۔

لوگوں کی تالیاں تھیں سیٹیاں تھیں پر ہم دونوں تو گم سم تھیں۔ جیسے مسمیرزم کے زیر اثر ہوں۔ ایک کیف آور کیفیت تھی۔ یہ رقص کب تھا۔ یہ تو ایک جان لیوا آرٹ تھا۔ انسان کے انتہائے کمال کی کہانی تھی۔

پھول تو سچی بات ہے لا ہی نہ سکے کہ جب نکلے تو ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ بھاگم ڈور میں ڈر تھا کہ دیر ہی نہ ہو جائے۔ اور تصویریں میں ضرور چاہتی تھی پر وہاں سٹیج پر کوئی خلقت تھی۔ گو ہڑبونگ اور بدنظمی ہرگز نہیں تھی۔ پر پھول پیش کرنے اور تصاویر کا جو سلسلہ جاری تھا وہ بڑا لمبا تھا۔ چھوڑو کہتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔

میں باہر ضرور آ گئی تھی سڑک پر چل رہی تھی۔ پر جیسے اُسی خمار میں ڈوبی ہوئی۔ اُسی سحر میں کھوئی ہوئی۔ وقت گیارہ سے اُوپر تھا۔

اب پیلس برج جانا تھا۔ برج لفٹنگ دیکھنی تھی۔ سینٹ پیٹرزبرگ کے بڑے بڑے برج مختلف اوقات میں اُوپر اٹھ کر بحری جہازوں کو گذرنے کا راستہ دیتے ہیں۔ پیلس برج کا

وقت 1:25 کا تھا اور سننے میں آیا تھا کہ ایک توجون کی سفید راتوں کا حسن اوپر سے برج کا اٹھنا منظروں کی شراب دوآتشنہ ہوکر وہ ستم ڈھاتی ہے کہ بندہ تو کلیجہ تھام لیتا ہے۔

خیر اس کلیجے کو تو یہاں قدم قدم پر تھامنا پڑتا ہے۔

پر پیلس برج پر پہنچنے سے پہلے پیٹ پوجا ضروری تھی۔ دو صورتیں تھیں۔ ٹیکسی پکڑتے اور سودوایا کی وزیسنکا یا (Voznesensky) سٹریٹ پر انڈین کیسینو میں جاتے اور تندوری کھانا کھاتے۔ پر سدووایا دور تھا۔

شامت اعمال سے اس کا اظہار ہو گیا۔

''کوہ قاف میں تو نہیں۔ ٹیکسیاں کس لئے ہیں۔''

ترکی بہ ترکی جواب آیا تھا۔

جی تو چاہا کہوں۔

''ارے اوندھی کوہ قاف یہیں تو ہے۔ اسی روس میں۔ میری تیری گرفت میں۔'' پر چپکی رہی۔ علمیت جھاڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اب سیدھے سبھاؤ چلنے ہی میں عافیت تھی۔ سو وہاں پہنچے۔ یہاں حیرت مسرت تپاک ماں بولی اور قومی بولی بولنے والے سب ملے۔ سانوے سلونے چہرے، اس پر باچھیں کھلی ہوئیں، اوپر سے محبت کا بے پایاں اظہار۔ گہرے سرخ رنگ کے درو دیوار کے ساتھ ہندوستانی ثقافتی رنگوں کے نمونے اپنی پہچان اور انفرادیت دیتے تھے۔

کاش کوئی پاکستانی ریستوران بھی یہاں ہوتا۔ یہ خواہش سینے میں اٹھنے سے باز نہیں آئی تھی۔

ماش کی دال کا پوچھا اور مل سکنے کا جان کر گویا خوشی سے اُچھل پڑنے والی بات تھی۔ کئی ہری مرچ، ادرک، سلاد اور تندوری پراٹھے۔ خوب کھایا اور اگلے دن کیلئے پیک بھی کروایا۔

تو مجھے اب سمجھ آئی تھی کہ پیٹرزبرگ کو دل میں سما جانے آنکھوں میں کھب جانے والا

شہر بنانے میں جن مختلف عناصر کا دخل ہے اس میں سے ایک بہت اہم یہاں کی سفید راتیں ہیں۔ سچی بات ہے اس حسن کو تو ہم نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اتنے دنوں سے تھک ٹوٹ کر سرِ شام گھوڑے بیچ کر سونے والے محاورے پر عمل پیرا تھے۔ چلو برج لفٹنگ کا سر صدقہ کہ ہمیں یہ حسن بھی دیکھنے کو نصیب ہوا۔ ٹیکسی جہاں جہاں سے گزرتی آئی تھی ہنگاموں خوشیوں اور قہقہوں کی کہانیوں نے خودکو دہرایا تھا۔

اوراب پتھر بنے کھڑے تھے۔ کسی لوہار کی بھٹی میں دہکتے لوہے کے آتشیں رنگ جیسا سورج کا گولا مغربی افقی کناروں پر جما کھڑا تھا۔ ہلکے پھلکے بادل اور اُفقی کنارے سب شفق میں نہاتے ہوئے اپنی رنگوں کی پچکاریاں نیوا کے پانیوں پر پھینک رہے تھے۔ سارا ماحول دودھیا رنگ میں نہا رہا تھا۔

مجھے زمانوں پہلے پدما کی لہروں پر سفر کرتے ہوئے صبح بنگال کسی ستارہ سحری کی مانند نظر آئی تھی۔

سری لنکا کی آدم پیک پر طلوع آفتاب کا دلکش نظارہ اپنی نوعیت میں منفرد میری یادوں کے دریچوں میں مستقل ڈیرے جمائے بیٹھا تھا۔ اوراب ویسا ہی منظر پھر میرے سامنے تھا۔

کاش میں مصور ہوتی تو شاید آسمان پر رنگوں کی دوڑتی پھرتی یلغار کو جو کسی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی تھیں برش سے قابو کر لیتی۔

کاش میں کوئی جوہری ہوتی تو منظروں کی رعنائی سے کوئی ہیرا تراش لیتی۔

اگر میں کوئی موسیقار ہوتی تو جذبات واحسات کے تلاطم جس میں میرا مُومُو ڈوبا ہوا تھا اور جس کی نغمگی میں میرا پورا وجود غوطے کھا رہا تھا۔ کوئی دلنواز لے تخلیق کر لیتی۔

بس عبودیت کے اتھاہ گہرے جذبات نے زمین اور آسماں کے گرد بار بار چکر لگاتے ہوئے تخلیق کائنات کے مالک کے حضور پلکوں پر اٹکے دو آنسو رخسار وں پر گرا کر اُسے خراج پیش کیا تھا۔

قدرت کی بُوقلمونیاں اپنے شاہکار جلووں کے ساتھ اگر قابلِ دید تھیں تو وہیں انسانی ہاتھوں اور دماغوں کے شاہکاروں نے بھی ہزاروں لاکھوں کے مجمع کو ساکت کر دیا تھا کہ ایک بج کر پچیس منٹ پر سیٹل کے پیلن اوپر اٹھنا شروع ہوئے اور پھر ایک دوسرے کے مقابل قدرے عمودی جھکاؤ کے ساتھ اوپر سے کھلی محراب کی سی صورت بناتے ہوئے یوں معلق ہو گئے کہ جیسے کسی میدان جنگ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوں۔ بڑے بڑے بحری جہازوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ آنے اور جانے کے الگ الگ راستے۔ قدرت کی شاندار تخلیق انسان نے بے کراں وسعتوں سے بھرے پانیوں کو اپنے مقاصد کیلئے کیسے نتھ ڈال دی تھی۔

اہل پیٹرز برگ کو شاید آمدورفت کے اِن ذرائع کے منقطع ہونے پر تکلیف ہوتی ہو پر میرا ذاتی خیال ہے کہ اِس منفرد اور انوکھے منظر میں روسیوں کے آہنی اور عظیم ہونے کا جو احساس پوشیدہ ہے وہ یقیناً اُن کے لئے باعث افتخار و تفاخر ہے۔

اب نیوا کے ساحلوں پر لوگوں کے جتھے یوں مست خرامیاں کرتے پھرتے تھے کہ جیسے کہکشاں زمین کے اس قطعے پر اُتری ہوئی ہو۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی پر آسمان کے جنوبی کنارے لالیوں اور اودے رنگوں کے ساتھ بڑی دلکش تصویریں بنا رہے تھے۔

میرا وجود مناظر کے اس سحر آگیں نظاروں کی تاب نہ لاتے ہوئے تحیّر آمیز احساسات کی زد میں تھا کہ جس نے میری دھڑکنوں کو تیز اور میرے بازوؤں کے بالوں کو سرشاری اور حسن کے تحیر سے کھڑے کر دیا تھا۔

پیلس برج نگاہوں کے فوکس پر تھا۔ چار پچیس 4:25 پر اس کی لینڈنگ ہونی تھی۔ وہاں لڑکوں کا ایک گروپ گٹار بجاتا اور گاتا تھا۔ کوئی روسی گیت۔ پھر چند اور لڑکے نئی آوازوں کے جلو میں گانے اور جھومنے لگے بول سمجھ آنے لگے۔ ساز اور آواز کا جادو ختم ہوا۔ لڑکوں نے بند آنکھیں کھولیں اور میں نے تماش بینوں کے ہجوم سے آگے بڑھ کر اُن سے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟

وہ تو لندن سے آنے والا ٹولا تھا اور ''بورس پاسٹرنیک'' (Boris Pasternak) کے

ترجمہ شدہ اشعار گا رہا تھا۔ اس ماہ کی نظم ان دنوں کے اشعار۔

We should have punched the crazy snow
And deafened by our noise and play
unstopped the mouldly window frames
Like bottled wine and hailed the day.

بورس منفرد قلم کار شہرہ آفاق ناول ڈاکٹر ژواگو کا مصنف۔ مجھے انجانی سی خوشی ہوئی تھی۔ پڑھی ہوئی اچھی کتابیں اُن دوستوں کیطرح سے ہوتی ہیں جن سے آپ ہمیشہ قربت کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔

بورس رُوس کا عظیم شاعر تھا۔ میرا جی چاہتا تھا میں لڑکوں سے پوچھوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس اتنے بڑے شاعر کے ساتھ کیا ہوا؟ میں اُن بے فکرے حال مست لڑکوں سے کوئی سوال نہ کر سکی کہ میں جانتی تھی انہیں تو کچھ بھی پتہ نہیں ہوگا۔

اُس کی شاعری کا پہلا مجموعہ اس وقت چھپا جب وہ صرف چوبیس سال کا تھا۔ اُس کی "My Sister Life" نے اُس کی شہرت کو بام عروج پر پہنچایا۔ پر 1930ء کی کمیونسٹ حکومت نے اُس کی شاعری کو زندہ درگور کر دیا۔ ایک طویل تاریکی کا دور۔ جہاں وہ ترجمے جیسے کاموں سے زندگی کو گھسیٹا رہا تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ انقلاب کے ساتھ ردِّ انقلاب کا لاحقہ بھی جڑا ہوتا ہے۔ شاعروں، مصنفوں، موسیقاروں اور فنونِ لطیفہ کے ماہروں نے اکتوبر انقلاب کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ ٹراٹسکی، میکسم گورکی، مایا کوفسکی۔

لیکن وہ جو انقلاب میں کہیں عقبی سیٹوں پر تھے، ناقابل اعتبار تھے۔ فرنٹ لائن پر آ گئے اور شاعر کی اس شعر کی تفسیر بن گئے۔

''منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔''

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اپنے ملک کی تاریخ چھوٹی بڑی جزئیات کے ساتھ میرے سامنے آ

قدرت کی بوقلمونیاں اپنے شاہکار جلوؤں کے ساتھ اگر قابل دید تھیں تو وہیں انسانی ہاتھوں اور دماغوں کے شاہکاروں نے بھی ہزاروں لاکھوں کے مجمع کو ساکت کر دیا تھا کہ ایک بج کر پچیس منٹ پر پیٹل کے پین اوپر اٹھنا شروع ہوئے اور پھر ایک دوسرے کے مقابل قدرے عمودی جھکاؤ کے ساتھ اوپر سے کھلی محراب کی سی صورت بناتے ہوئے یوں معلق ہو گئے کہ جیسے کسی میدان جنگ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوں۔ بڑے بڑے بحری جہازوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ آنے اور جانے کے الگ الگ راستے۔ قدرت کی شاندار تخلیق انسان نے بے کراں وسعتوں سے بھرے پانیوں کو اپنے مقاصد کیلئے کیسے نتھ ڈال دی تھی۔

اہل پیٹرز برگ کو شاید آمدورفت کے ان ذرائع کے منقطع ہونے پر تکلیف ہوتی ہو پر میرا ذاتی خیال ہے کہ اس منفرد اور انوکھے منظر میں روسیوں کے آہنی اور عظیم ہونے کا جو احساس پوشیدہ ہے وہ یقیناً اُن کے لئے باعث افتخار و تفاخر ہے۔

اب نیوا کے ساحلوں پر لوگوں کے جھتے یوں مست خرامیاں کرتے پھرتے تھے کہ جیسے کہکشاں زمین کے اس قطعے پر اُتری ہوئی ہو۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی پر آسمان کے جنوبی کنارے لالیوں اور اودے رنگوں کے ساتھ بڑی دلکش تصویریں بنا رہے تھے۔

میرا وجود مناظر کے اس سحر آگیں نظاروں کی تاب نہ لاتے ہوئے تحیّر آمیز احساسات کی زد میں تھا کہ جس نے میری دھڑکنوں کو تیز اور میرے بازوؤں کے بالوں کو سرشاری اور حسن کے تحیر سے کھڑے کر دیا تھا۔

پیلس برج نگاہوں کے فوکس پر تھا۔ چار پچیس 4:25 پر اس کی لینڈنگ ہونی تھی۔ وہاں لڑکوں کا ایک گروپ گٹار بجاتا اور گاتا تھا۔ کوئی روسی گیت. پھر چند اور لڑکے نئی آوازوں کے جلو میں گانے اور جھومنے لگے بول سمجھ آنے لگے۔ ساز اور آواز کا جادو ختم ہوا۔ لڑکوں نے بند آنکھیں کھولیں اور میں نے تماش بینوں کے ہجوم سے آگے بڑھ کر اُن سے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟

وہ تو لندن سے آنے والا ٹولا تھا اور ''بورس پاسٹرنیک'' (Boris Pasternak) کے

ترجمہ شدہ اشعار گا رہا تھا۔ اس ماہ کی نظم اِن دنوں کے اشعار۔

We should have punched the crazy snow
And deafened by our noise and play
unstopped the mouldly window frames
Like bottled wine and hailed the day.

بورس منفرد قلم کار شہرہ آفاق ناول ڈاکٹر ژواگو کا مصنف۔ مجھے انجانی سی خوشی ہوئی تھی۔ پڑھی ہوئی اچھی کتابیں اُن دوستوں کیطرح سے ہوتی ہیں جن سے آپ ہمیشہ قربت کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔

بورس رُوس کا عظیم شاعر تھا۔ میرا جی چاہتا تھا میں لڑکوں سے پوچھوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس اتنے بڑے شاعر کے ساتھ کیا ہوا؟ میں اُن بے فکرے حال مست لڑکوں سے کوئی سوال نہ کر سکی کہ میں جانتی تھی انہیں تو کچھ بھی پتہ نہیں ہوگا۔

اُس کی شاعری کا پہلا مجموعہ اس وقت چھپا جب وہ صرف چوبیس سال کا تھا۔ اُس کی "My Sister Life" نے اُس کی شہرت کو بام عروج پر پہنچایا۔ پر 1930ء کی کمیونسٹ حکومت نے اُس کی شاعری کو زندہ درگور کر دیا۔ ایک طویل تاریکی کا دور۔ جہاں وہ ترجمے جیسے کاموں سے زندگی کو گھسیٹتا رہا تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ انقلاب کے ساتھ ردِّ انقلاب کا لاحقہ بھی جڑا ہوتا ہے۔ شاعروں، مصنفوں، موسیقاروں اور فنونِ لطیفہ کے ماہروں نے اکتوبر انقلاب کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ ٹراٹسکی، میکسم گورکی، مایا کوفسکی۔

لیکن وہ جو انقلاب میں کہیں عقبی سیٹوں پر تھے، ناقابل اعتبار تھے۔ فرنٹ لائن پر آ گئے اور شاعر کی اس شعر کی تفسیر بن گئے۔

''منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔''

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اپنے ملک کی تاریخ چھوٹی بڑی جزئیات کے ساتھ میرے سامنے آ

گئی تھی۔

اور پھر وہ تاریخ کا آگے بڑھا ہوا پہیہ گھما کر اُسے وہیں لے جاتے ہیں جہاں سے وہ شروع ہوا تھا۔ ''انقلاب کے نقیب'' کا خطاب پانے والا مایا کوفسکی جیسا شاعر اور ڈرامہ نگار نہ سٹالن سے ہضم ہو رہا تھا نہ اُس کی بیوروکریسی سے۔ 1930ء میں اُس کی خودکشی اس نوکرشاہی کے خلاف بڑا واضح احتجاج تھی۔

ٹراٹسکی جیسے دانشور کو سٹالن کے ایجنٹ رامون مرکیڈور نے 1940ء میں میکسیکو میں قتل کروا دیا اور 1960ء میں اُسے سیاسیات پر لنین ایوارڈ سے نوازا گیا۔

عظیم شاعر اوسپ مینڈل کا بھی یہی حشر ہوا۔

شوستاکووچ کی چھٹی سمفنی پر سٹالن نے خود پابندی لگائی۔

بورس پاسٹرنک نے خودکشی تو نہ کی۔ پر زندگی کی تلخیوں نے اُسے پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا کر دیا تھا۔ 1858ء میں سویڈن نے جب ڈاکٹر ژواگو پر اُسے نوبیل پرائز دیا۔ اُس نے خوشی کا اظہار کیا کیا۔ جیسے اُس کے خلاف نفرت کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ اُسے غدار کہا جانے لگا۔ الزامات اور اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ملک بدری پر اصرار ہوا۔

ہندوستان اور پاکستان کے اہلِ قلم آنکھوں کے سامنے آ گئے تھے۔

میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں کیونکہ اس کی اپیل مجھے یاد آئی تھی صدرِ مملکت کے نام۔

''کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے کہ رُوس میرے لئے کیا ہے؟ میرا کام میرا نام میری عزت اور موت سب رُوس سے ہیں۔ مجھے کسی نوبیل پرائز کی نہیں صرف اپنے وطن کی ضرورت ہے۔ میرا وطن رُوس۔''

اور نوبیل پرائز لینے سے اُس کا انکار ہوا۔

اور آنسوؤں کی بوچھاڑ تھی جو میرے گالوں پر بہہ رہی تھی۔ اُسے اتنی تاویلیں دینے کی ضرورت تھی۔ ہائے یہ اہلِ اقتدار۔

باب
29

پیٹرز برگ نہروں کے آئینے میں
Пётр Бург В Зеркале Обводных Кналах.

تو شوقن محلاں دی ترکے ہی غائب ہوگئی تھی۔ مقام حیرت تھا کہ اُس کی تیاری کی کھڑ پٹر میں بھی میں نیند کے مزے لوٹتی رہی۔کل رات سونا تو کوئی چار بجے کے لگ بھگ ہوا۔ کوئی نو کے قریب جاگی تو وہ نہیں تھی۔نہانا، ناشتہ، پھر دن بھر کا پروگرام مرتب کرنا مختلف جگہوں کے اندرونی سیر سپاٹوں میں تو ہماری کبھی سُر رلی ہی نہیں تھی۔البتہ صُبح اور شام کا جانا آنا ہمیشہ پیار ومحبت سے ہی ہوتا۔

آج اُس کا بھی خانہ خراب ہوگیا تھا۔چلو خیر لعنت بھیجو۔

دو دنوں سے بوٹ میں بیٹھنے پیٹرز برگ کے پلوں کے نیچے سے گزرنے اور اس کی گلیوں میں گھومنے کی خواہش بے حال کئے ہوئے تھی۔سو پیلس برج پر اس خواہش کی تکمیل کے لئے کشتی میں جا سوار ہوئی۔

شہر کی تعمیر میں تو نہریں بنیادی حیثیت کی حامل تھیں کہ سانپ کی طرح بل کھاتی چھوٹی بڑی اس کے وجود میں شریانوں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ نیوا پر پلوں کی بجائے پیٹر اعظم نے لوگوں کے ہاتھوں میں چپو پکڑانے اور انہیں کشتیوں کو کھیتے دیکھنا پسند کیا تھا۔یقیناً

وہ اپنے لوگوں کو پانیوں کی دہشت سے مانوس کرنے، اُس کے طوفان سے نبرد آزما ہونے اور اس کی بے کراں موجوں کو لگام ڈالنے کی عملی تربیت دینے کا متمنی تھا۔ اس کے زمانے میں آمد ورفت کا واحد ذریعہ صرف کشتیاں تھیں۔

یہ شاید اس کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کے حلقہ احباب کے بیشتر لوگ اور اس کی رعایا دُور دراز مقدس آئی کونوں کی زیارتوں، دعاؤں اور لطف اندوزی کیلئے بے کراں پانیوں پر سفر کرنا ایک مزے کا سیر سپاٹا خیال کرتی۔

بعد میں تین فلوٹنگ برج بنائے گئے۔ پر جونہی موسم بدلا۔ دھوپ نے اپنے جلوے دکھائے برفیں پگھلیں۔ پھر سردیوں کی طوفانی ہوائیں چلیں۔ پانی برف بنے تو برج کاغذوں کے پُرزوں کی مانند فضاؤں میں بکھر گئے۔

اُنیسویں صدی کے وسط میں سو سے کچھ زیادہ اِن پلوں کو دھات سے پکا اور مستقل کیا گیا۔ اور اب تو کوئی پانچ سو پلوں کا شہر بنا ہوا ہے۔

اس وقت جب میں چپوؤں سے کھینے والی کشتی کی بجائے ایک چھوٹی سی برقی بوٹ میں بیٹھی خود کو بڑا ہشاش بشاش محسوس کرتے ہوئے اپنی یادوں کے ڈانڈے تب سے ملاتی تھیں جب ہفتے کی شام ڈھلے ہم ڈھاکہ یونیورسٹی کی چند طالبات بوڑھی گنگا کے سینے پر دوڑتے پھرتے کسی دخانی سٹیمر یا چھوٹی سی چپوؤں والی کشتی میں سیر کرنے جایا کرتی تھیں۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ بوڑھی گنگا کنارے منظروں کی جاذبیت اور اُن کی بدنمائیاں کیسے کیسے میرا جی جلایا کرتی تھیں۔ میں الہٰ دین کے چراغ کی تمنا کرتی کہ کہیں وہ میرے پاس ہو اور پل جھپکنے میں اس حسین دھرتی کے سینے پر پھیلے ہوئے غریبی کے کوڑھ داغوں کو ختم کر دوں۔ میری بے بسی میری آنکھوں کو گیلا کر دیا کرتی تھی۔ اور آج اتنے ڈھیروں سال گزرنے کے باوجود میری آنکھیں بار بار بھیگتی ہیں۔ کہیں سینے سے ہوک بھی اُٹھتی رہتی ہے۔ اپنے وطن کی محرومیاں دل تڑپاتی ہیں۔ دُعا نکلتی ہے کہ میرا ملک بھی ملکوں کی صف میں معتبر ہو جائے اور نئے خوبصورت دل موہ لینے

والے انداز اُس کا سنگار بن جائیں۔

میں بھانت بھانت کے لوگوں میں اکیلی بیٹھی خود کو کیسی مسرور محسوس کرتی ہوں۔ میرے بائیں ہاتھ بیٹھنے والے کوئی نصف درجن خوش خصال لوگوں کا ٹولہ بوڈاپسٹ سے ہے چار عورتوں اور دو مردوں پر مشتمل۔ بڑی ستھری انگریزی بول سکتے ہیں۔ مسکراہٹ عورتوں کی آنکھوں میں ہنستی ہے۔ مردوں کی مونچھوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ لبوں پر بکھری ہوئی ہے اور نتھنوں کو پھڑکاتی ہے۔ اتنی جلدی گھل مل گئے ہیں۔

شور مچاتی کشتی پیلس برج کے پُلوں سے گزر کر ''Mokia canal'' میں داخل ہو گئی ہے۔ یہ ایک سحر انگیز منظر ہے۔ نہر کے بلند و بالا بادامی گرینائٹ کے کناروں پر ایستادہ پُر وقار بلند و بالا عمارتوں کے سلسلے کس قدر خوبصورت لگتے تھے۔ مجھے یہاں بیٹھے ہوئے انکے ناف تک کے وجودی حصے نظر آتے ہیں۔ ''موکیاء'' خم کھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ آئزک کیتھڈرل کا گنبد بہت نمایاں ہے۔ پُلوں پر گاڑیوں اور پیدل چلتے لوگوں کا رَش ہے۔ گاڑیوں کے سرخ، نیلے، اُودے رنگ اچھے لگتے ہیں۔ قریب قریب بنے ہوئے پُلوں پر جھکے سرو چراغوں کے شاندار نمونے اور پُلوں کی منفرد ریلنگ دلآویز ہے۔

کشتی چکر کاٹتی ہوئی گریباڑو کینال (Griboyedova Canal) میں آ گئی ہے۔

Church on the spilled blood. ہمارے دائیں ہاتھ ہے۔

''ارے نوسکی پراسپکٹ پُل بھی سامنے نظر آتا ہے۔ اسی نہر کے موڑ پر شیروں والے برج کے پاس ہی تو ہمارا ہوٹل ہے۔ پر آگے جانے کی بجائے کشتی فونٹینکا (Fontanka) دریا میں آ گئی ہے۔

ٹھنڈی ٹھار ہوائیں زوروں پر ہیں۔ ذرا فاصلے پر بیٹھے دو منچلے لڑکے اپنی ساتھی لڑکیوں کی بغلوں میں گھسے جا رہے ہیں۔

کشتی Anichkov Bridge کے پاس پہنچ گئی ہے۔ فنکاری کا شاہکار پُل اس کے

چاروں کونوں پر بنے ننگے انسانی مجسمے گھوڑوں کو سدھارنے کا عمل سرانجام دیتے نظر آتے ہیں۔
پل کی ریلنگ بھی کمال کی تھی۔ چوکھٹوں پر مشتمل اور ہر چوکھٹ میں دو گھوڑوں کی صورتیں ایک دوسرے کے مقابل اگلی ٹانگیں اٹھائے جیسے مرنے مارنے پر تلے ہوں۔

یہ 1715ء کے ابتدائی پُلوں میں سے ایک ہے۔ دو باتوں کیلئے یہ پل خصوصیت کا حامل ہے۔ کہ سنگ تراش Piotr Klodt کی خواہش پر مجسموں کو یہاں رکھا گیا۔ اسے نام دیا گیا ہے۔ ''The Taiming of horse.''

کسی گھوڑے کی ٹیمنگ کے دوران کسی ٹرینر کی استقامت، اُس کا صبر، اُس کے چہرے کے تاثرات اور پیشہ ورانہ باریکیاں جنکا اُس کے چہرے، اُس کے جسم، اُس کی حرکات سے مترشح ہونا ضروری ہے۔ وہ سب ان ننگی انسانی صورتوں پر تحریر تھیں۔ پل کے پار Beloselsky پیلس اپنے ہلکے پیازی رنگوں سے جھلکیاں دکھا رہا تھا۔

کشتی کی رفتار یہاں بہت آہستہ تھی۔ منظروں کو اُن کی تفصیلات سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے نیوا کے کناروں پر بنے Bolsheokhtinsky Bridge اور 17 اکتوبر عظیم انقلابی مرکز سمولنی انسٹیٹیوٹ کو دیکھنا تھا۔

میں قریب ترین جگہ پر تھی۔ پر اُتر نہیں سکتی تھی۔

''اللہ اتنے قریب آ کر۔ پر نہیں جی۔ مجھے پیلس برج پر ہی اُترنا تھا جہاں سے میں سوار ہوئی تھی۔''

باب
30

یوسوپوف محل • راسپوٹین کا عروج وزوال
Дворец Юсопов, Подём И Опадка Рспутина

یہاں مویا کا (Moyka) کینال کے گدلے پانیوں کو دیکھتے ہوئے زیرِلب خود کلامی کے سے انداز میں تھوڑے سے ملال کی آمیزش کے رچاؤ میں گُھلے لہجے نے بے اختیار ہی کہا تھا۔

''یاراب محل دیکھنے تو میں بھی آ گئی ہوں۔کیا تھا جو مہر النساء کی بات مان لیتی۔ پہلے سارسکایا سلو (Tsarskaye Selo) دیکھ لیتے پھر یہاں یوسوپوف آ جاتے۔''

پر اگلے لمحے میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے تھے۔ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کی طرز تعمیر کا شاہکار زارینہ کیتھرائن دی گریٹ کی شان وشوکت کے مظہر چھ سو ہیکٹر رقبے پر پھیلے باغوں اور کمروں کو دیکھنے کی تو مجھے تاب نہیں تھی۔ باز آئی میں۔

یوں پشکن کے حوالے سے شہرت تھی کہ اُس نے محل سے ملحقہ سارسکایا سلو لائیسیم سکول میں پڑھا تھا جو اب میوزیم ہے۔

اب رہا یوسوپوف۔ بڑی خصوصی شہرت کا حامل ہے یہ۔ یہاں رُوسی تاریخ کے اہم کرداروں کی ریشہ دوانیوں کے تانے بانے بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے درودیواروں پر وہ فیصلے رقم ہیں جو بتاتے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کی زندگیوں میں انقلاب کیوں آتے ہیں؟ اُس

کے تہہ خانے میں سائبیریا کے گاؤں ''پوکروسکو'' کے گریگوری راسپوٹین کے قتل کی کہانی ہے، جسے میں نے سالوں پہلے پڑھا تھا۔ سن یاد نہیں۔ پر اتنا یاد ہے کہ اُردو ڈائجسٹ میں لکھی گئی اس تحریر کا مرکزی کردار راسپوٹین مجھے وقت گزرنے کے باوجود کبھی نہیں بھولا تھا۔ ایک پُر اسرار تحیّر کی مانند وہ میری یادداشتوں میں محفوظ تھا۔

مویا کا کے کناروں کی ریلنگ سے اپنی پشت ٹکائے ہوئے کبھی سہ منزلہ پیلس کبھی پانیوں اور گاہے گاہے اردگرد کی عمارتوں کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

تب راسپوٹین کو پڑھتے ہوئے کیا میں نے ایک پل کیلئے یہ سوچا تھا کہ میری زندگی میں ایک دن ایسا بھی آ سکتا ہے جب میں اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے اُس جگہ کو دیکھوں گی جہاں وہ خبیث فطرت انسان رہتا تھا۔

تشکر سے لبالب بھری مسکراہٹ نے میرے ہونٹوں پر بکھر کر میری نگاہوں کو نیلے آسمان کی طرف اٹھا دیا تھا۔

چوبی کندہ کاری سے سجے چھوٹے سے دروازے سے میں اندر داخل ہوئی۔ ٹکٹ چیکنگ کے مرحلے طے ہوئے۔

محل باہر سے سادہ تھا پر اندرونی آرائش غضب کی تھی۔

اس کا ہوم تھیٹر آڈیٹوریم کمال کا تھا۔

جب میں کمروں میں گھومتی پھرتی تھی۔ میں نے اُس خوبصورت شہزادی کا پوٹریٹ دیکھا تھا۔ جو بودئیور (Boudior) تھی۔ زارینہ کی رازدار اور راسپوٹین کی بھی دست راست۔

راسپوٹین کون تھا۔

پوکروسکو کا ایک دیہاتی جس کا بچپن چوریوں اور آوارہ گردیوں میں گذرا۔ مختلف خانقاہوں، گرجاؤں، اُن کے پادریوں سے مذاکروں، مباحثوں، مناظروں اور الٹے سیدھے مخفی علوم پر دسترس سے وہ کچھ ماورائی قوتوں کا حامل ایک پیر بزرگ انسان کے طور پر مشہور ہوا۔

قسمت اُسے پیٹرز برگ لے آئی جہاں اُس نے اپنی روحانی و سفلی قوتوں سے لوگوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔

اب کار شاہی میں اُس کا غلبہ اور سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک بننے کا معجزہ نکولس دوم کی نالائقیوں اور کمزوریوں کے باعث ہوا۔ نکولس دوم اپنے بہادر اور جی دار باپ الیگزینڈر سوم کے برعکس بُزدل، اعتماد اور قوت فیصلہ سے محروم۔ تیز حکومتی فہم و فراست سے عاری اور بیوی کے اشاروں پر ناچنے والا زار تھا۔ شاید تربیت میں جھول تھا۔ اندازِ جہانبانی میں کمزور تھا۔ مزاجاً وہ رُوس جیسی وسیع و عریض سلطنت کے قابل ہی نہ تھا۔

۱۹۰۴ء میں جاپان کے ساتھ ذلت آمیز شکست، ۱۹۰۵ء کی انقلابی تحریک، ملک میں کمزور سرمایہ کاری۔ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم میں فوج کی بے چینی، غیر معیاری اسلحے پر عدم اطمینان و معیشت کی زبوں حالی، بیروزگاری اور نوکر شاہی کے رویوں نے رُوس جیسی وسیع و عریض سلطنت جس میں چلنے والی مارکسٹ تحریکیں اپنے ایجی ٹیشنوں کے ساتھ پولیس اور کوساکوں کیلئے عذاب بنی ہوئی تھیں۔

زار شاہی کے لئے یہ سب امور لمحہ فکریہ تھے پر وہاں روم جلتا تھا اور نیرو بانسری بجاتا تھا والی بات تھی۔

چار بیٹیوں کے بعد پیدا ہونے والا بیٹا الیکسی ہوموفلیا (Homophilia) کا مریض (خون بہنے اور بند نہ ہونے کی بیماری) تھا۔ جس کی بیماری نے ماں باپ دونوں کو پریشان کر رکھا تھا۔

اس پس منظر میں راسپوٹین بچے کا معالج بن کر شاہی محل میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی سامرانہ اور ساحرانہ کاوشیں بچے کو اس کے درد اور تکالیف سے نجات دلانے کا باعث بنتی ہیں۔ شاہی خاندان کی کمزوریوں کو آلہ کار بنا کر اپنی معجزانہ چالوں سے امورِ مملکت پر وہ دھیرے دھیرے اپنے اثر و رسوخ کو گہرا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

بودیور (Boudoir) زار رُوس کے ایک بڑے عہدے دار کی بیٹی انتہائی حسین و جمیل

طلاق یافتہ۔ جھوٹے سچے عقیدت کے اظہار سے زارینہ رُوس کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ راسپوٹین اُس کے دل ودماغ پر قابض ہو کر اُسے اپنا شریک کار کر لیتا ہے۔ یوں یہ تکون ملک کا بیڑا غرق کرنے کے لئے بقیہ معروضی حالات کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔

میں بودئیور (Bourdir) کے کمرے دیکھنے کیلئے سیڑھیاں چڑھتی ہوں۔ کمال کی عورت تھی۔

راسپوٹین کے کمروں کا شاہانہ انداز حیران کرتا تھا۔

میں نیچے بیسمنٹ میں اُتر گئی تھی۔ نیچے بھی ایک پورا جہان تھا۔ اس لمبے چوڑے جھمیلے میں سے مجھے اپنا ہدف وہ کمرہ دیکھنا تھا جہاں اُسے اگلے جہان پہنچایا گیا تھا۔ آسٹریلوی مردوں نے رہنمائی کی۔

سیاح بہت کم تھے۔ اور جو تھے وہ بڑے ہنس مکھ سے نظر آتے تھے۔ آتے جاتے جب بھی ٹکراؤ ہوا۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ ضروری ٹھہرا۔

شاہی زاریت پسند کو شاید اُمید تھی کہ سازشوں کے اِس سرغنہ مقدس باپ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے سے زار کو راہ راست پر لانا مشکل نہ ہوگا۔ مصیبت یہ بھی تو تھی۔ آٹوکریسی ٹولے کے ساتھ آخری دم تک ہمیشہ اُس کے ذاتی مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ اسلام آباد کے صدارتی محل، اُن محلوں میں رہنے والوں کی کہانیوں میں سے کبھی کوئی کہانی، کوئی واقعہ کسی دروازے کسی کھڑکی کی چھوٹی موٹی درز سے باہر نکل آئے اور ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں کے علم میں آجائے تو کیسی حسرت اور کیسا دُکھ آنکھوں اور ہونٹوں سے عیاں ہوتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کا المیہ کتنے بڑے زخموں اور ناسوروں کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔ پر کس نے سبق سیکھا۔ کسی نے نہیں۔ وہ مہیب طوفان نظر نہیں آتے جو بالآخر ایک دن سب کچھ خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتے ہیں۔

بیسمنٹ میں بھی ایک جہاں آباد تھا۔ تو میں اب اسی کمرے میں تھی جہاں وہ یوسوپوف

راسپوٹین کو بہلا پھسلا کر لایا تھا۔ یہیں کرسی پر بیٹھ کر اُس نے سفید انگوری شراب کا جام اٹھایا جس میں سی نائیڈ کی زہر ملی ہوئی تھی۔ وہ عام آدمی نہیں تھا۔ آسانی سے مرنے والا۔ ریوالور سے بہت ساری گولیاں خالی ہوئیں۔ سر پر ضربیں لگائی گئیں پھر لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر نیوا کے پانیوں میں ڈبویا گیا۔

ایلیٹ کلاس اُس کے قتل پر خوشیاں منا رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ ایک عام آدمی کے دل میں زمانوں سے پلتا طوفان اب اُس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ خونخوار آنکھوں اور مضطرب ہاتھوں میں جسے ایک خبیث کے مرنے سے نہیں پورے سسٹم کو مارنے سے دلچسپی تھی۔

باب

31

سمولنی میوزیم • انقلاب کا حقیقی گڑھ اور گھر

Музеи Смольны , Дом И Крепость Революция

ایسا تو ہرگز نہیں تھا کہ میں نے ان کے حُسن وخوبصورتی کو سراہا نہ ہو۔ یا یونہی آنکھیں بند کر کے پاس سے گزر گئی ہوں۔ نیوا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس کے بالائی کنارے کے خوبصورت کٹاؤ پر ہی قریب قریب سمولنی مناسٹری، سمولنی انسٹی ٹیوٹ اور ذرا آگے شاندار فن انجینئرنگ کا شاہکار بالشویکتن سکائے Bolsheokhtinsky برج تھے۔ اور تینوں اپنی اپنی جگہ بے مثال تھے۔

سمولنی مناسٹری عین دریائے نیوا کے پہلے خم پر رسٹریلی کی شاہکار عمارتوں میں سے ایک ہے آغاز میں یہ پیٹر دی گریٹ کی صاحبزادی الیزبتھ کا کنٹری پیلس تھا۔ بعد میں خواتین کیلئے کونونٹ بنا دیا گیا۔ دلکش پانیوں میں جھانکتی اور اپنے جلوے دکھاتی سبزہ زاروں میں گھری اس سفید اور آسمانی رنگوں میں چمکتی دمکتی عمارت کو دُور دُور سے ہی دیکھنے پر اکتفا کیا اور اندر جانے پر قطعاً دل نہ چاہا۔

ٹیکسی پیلس برج سے ہی لی تھی۔ ٹیکسی کا ہرگز کوئی پروگرام نہیں تھا۔ یونہی ذرا چسکہ لینے کو نقشہ ٹیکسی ڈرائیور کو دکھا بیٹھی۔ وہ بھی کوئی خاندانی دِکھتا تھا۔ سو روبل کا کہا اور اسی پر ڈٹا۔ بھاؤ تاؤ

کروانے والی ہماری طبیعت نے بھی مان لیا کہ بندہ راستی پر ہے۔ بس کیلئے اب نوسکی پراسپکٹ تک مارو ماری کرنی پڑنی تھی۔ سوغنیمت سمجھتے ہوئے فی الفور بیٹھ گئے۔

جب میں خوبصورت کشادہ سڑک پر چلتی تھی۔ اور دورویہ سفید ستونوں پر تعمیر کردہ گارڈ روموں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتی تھی تو تاریخ مجھے پیچھے اٹھائے لئے جاتی تھی اُن دنوں میں جب سمولنی کو ایک قلعے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس کی چھتوں پر مشین گنیں نصب تھیں اور بالشویکوں کے جتھے اس سڑک پر اضطرابی انداز میں بھاگتے اور جیپیں دوڑاتے پھرتے تھے۔

سفید نیلے اور سرخ پٹیوں والے رُوسی جھنڈے کے نیچے یونانی طرز کے منہ متھے والی پیلے رنگ کی پرشکوہ عمارت درختوں اور سرسبز لانوں میں گھری ہوئی تھی۔ دوطرفہ راستوں کے درمیان پھولوں کی لمبی کیاریاں راستے پر بچھے سفید اور سرخ قالینوں کی مانند دِکھتی تھیں۔ بادامی گرینائٹ کے اُونچے گول چبوترے پر لینن اپنے دائیں ہاتھ کو اٹھائے کھڑا تھا۔

ڈھیر ساری سیڑھیاں تھیں جنہیں چڑھ کر میں چوکور ستونوں پر محرابی کٹ والی گزرگاہوں میں سے ایک کے راستے برآمدے میں داخل ہوئی۔

انقلاب ایسے نہیں آتے۔ حقوق کیلئے شعور و آگہی کا ادراک بنیادی ضرورت ہے۔ اس ادراک کیلئے جاننے کی لگن اور تڑپ چاہیے۔ رُوسی عوام نے اس کا عملی مظاہرہ کیا تھا۔ رُوس پڑھنا سیکھ رہا تھا۔ سیاست سے اُس کی دلچسپی تاریخ اور فلسفہ میں اُس کا انہماک، سماجی و معاشی نظریات کو جاننے میں اُس کا شوق بے پایاں تھا۔

جان ریڈ کی ایک تحریر اس جذبے کی عکاس ہے۔

اُنیسویں صدی کی آخری دہائی ''ریگا'' کی بیک پر بارھویں فوج کا محاذ، کیچڑ بھری خندقوں میں، ننگے پاؤں، فاقہ زدہ اور بیمار فوجیوں جنکے چہرے پیلے، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جنہوں نے ہمیں دیکھتے ہی پہلا مطالبہ یہ کیا تھا۔ ہمارے پڑھنے کیلئے کیا لائے ہو؟

یہ جذبہ یونہی پیدا نہیں ہوا۔ انقلابی لیڈروں نے اپنا سارا فوکس لوگوں کو علم اور شعور دینے پر صرف کر دیا تھا۔

برآمدے میں گھومتے پھرتے ہوئے میرے تصور میں محنت کے پھولوں سے سجے وہ ہزاروں کھردرے ہاتھ ابھرے تھے جو "داس کیپٹل" کی کئی جلدوں کو پھاڑ کر انکے صفحے بانٹ لیتے اور اپنی جسمانی تھکن کو انہیں پڑھتے ہوئے اُتارتے۔

کرپسکایا کی ایک تحریر ان دنوں کے بارے میں ہے۔ جب تحریک عروج پر پہنچ گئی۔ اور لینن پیٹرزبرگ میں موجود تھا۔

اُن دنوں پیٹرزبرگ کی گلیاں عجیب سے منظر پیش کرتی تھیں۔ لوگ گروپوں میں کھڑے ٹولیوں میں بکھرے بحث مباحثے میں اُلجھے ہوئے نظر آتے تھے۔ میں جس گھر میں رہتی تھی۔ اس گھر کی کھڑکی کھول کر جب بھی باہر دیکھتی مجھے زور شور سے باتوں کی آوازیں آتیں۔

ڈیوٹی پر متعین سپاہی کے پاس ہمیشہ سامعین ہوتے۔ نوکر خانسامے بالشویک، منشویک، زار زار، زارینہ، ڈوما، سب کے بخیے اپنی اپنی فہم و فراست کے مطابق اُدھیڑ رہے ہوتے۔

میں اُن چاندنی راتوں کی شب بھر جاری رہنے والی سیاسی بحثوں کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ سب ہمارے لئے بہت اہم ہوتا تھا۔ یہ رُوسی عوام کی بیداری تھی۔ یہ ان کی اپنے حقوق کیلئے جنگ تھی۔

تو پھر میں بلند و بالا سفید ستونوں، دوہری دیواری کھڑکیوں اور اُونچی چھت والے ہال میں داخل ہوتی ہوں۔ ایک وسیع و عریض ہال جسکی چھتوں سے لٹکتے شینڈ لیرز جلتی موم بتیوں کی صورت روشنیاں بکھیرتے تھے۔ اس سمولنی نے بھی رُوس کے اُفق پر چھائے ظلم و ستم کے بادلوں کو اُڑانے میں تیز اور شوریدہ سر ہواؤں جیسا کردار ادا کیا تھا۔

میں ہال میں سیاحوں کیلئے رکھی گئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی تھی۔ یقیناً میں اپنی کھلی آنکھوں سے اُن مناظر کو دیکھنا چاہتی تھی جو کبھی البرٹ ولیم نے دیکھے تھے۔ جن کے بارے میں

اُس نے اور جان ریڈ نے لکھا تھا۔

تو یہاں اسی سمولنی ہال میں سپاہیوں اور کارکنوں کے جھتے تھے۔ گیت تھے۔ سیٹیاں اور شور تھا۔

مشہور زمانہ جنگی جہاز ''ارورا'' کی گولے داغتی توپیں پرانے نظام کے خاتمہ اور ایک نئے نظام کا اعلان تھیں۔

جب چیئرمین کا یہ اعلان کامریڈ لینن خطاب کرینگے۔ ''ریڈ'' کہتا ہے میں نے دم سادھ لیا تھا اور خود سے کہا تھا ''تو کیا وہ ایسا ہی ہوگا؟ جیسا ہم نے سوچا ہے۔''

وہ ہماری تصوراتی سوچوں کے بالکل برعکس تھا۔ چھوٹا، گٹھیلا سا، اسکی داڑھی اور مونچھوں کے بال اکڑے ہوئے، بہت کھردرے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی بیٹھی ہوئی ناک، چوڑا دہانہ اور بھاری ٹھوڑی۔ گندے مندے سے کپڑے۔ پتلون تو بہت لمبی تھی۔ قطعی طور پر ایک غیر موثر شخصیت۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر اُس پورٹریٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی جو دیوار پر آویزاں تھا۔ لینن خطاب کرتا اور لوگوں کا جم غفیر اس کے گرد جمع تھا۔

میں نے اُسے بغور دیکھا۔ وہ ایسا ہی تھا جیسا ریڈ اور البرٹ ولیم نے محسوس کیا۔ اس کا ماتھا فراخ تھا اور چھوٹی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ پر وہ اُن سب کے دلوں کی دھڑکن تھا جو چہروں پر جذبات کا جہان سجائے اُسے دیکھتے اور سنتے تھے۔ کہیں کچھ ہاتھوں میں لہراتی بندوقیں بھی تھیں۔ وہ لیڈر تھا، ایک دانشور، رنگ و نسل سے بالا، نہ بکنے، نہ جھکنے والا۔

البرٹ بالشویکوں کی جرأت، دلیری اور تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی کاوشوں پر متاثر تھا پر اُن کے لیڈر کو دیکھ کر مایوس ہوا تھا۔

میں اور ''جولیس ویسٹ'' شاید اُسے تمام خوبیوں کا مجسمہ سمجھے بیٹھے تھے۔ پر وہ کس قدر غیر مؤثر نظر آیا تھا جولیس نے سرگوشی کی تھی۔

یہ کسی بوژوا میئر یا کسی بنک کا بینکر نظر آتا ہے بس۔ ایک چھوٹے سے آدمی سے اتنا بڑا کام کیونکر ہوا۔

میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔ کیا مجھے بھی کوئی ایسا احساس ہوا ہے؟

''ارے کہاں۔ ہم تو خوبصورتیوں اور دراز قامتوں کے ڈسے ہوئے ہیں۔''

میں نے وسیع و عریض ہال کی دیواروں پر لگی ساری پینٹنگز کو تفصیلاً دیکھا۔

اس تاریخی عمارت کے شب و روز بڑے ہنگامہ پرور تھے۔ یہ ہال روشنیوں سے جگمگاتا رہتا۔ اس کے دن ہی نہیں راتیں بھی بڑی ہنگامہ خیز تھیں۔ تحریک کے بڑے اور سرکردہ لیڈر اور ان کی بیویاں بچے یہیں پڑے رہتے۔ لیون ٹراٹسکی کی بیوی لکھتی ہیں۔

''گھر تو ریڈ سٹریٹ میں تھا۔ پر اکتوبر انقلاب کی تیاریوں کے سلسلے میں ٹراٹسکی کو سارا دن سمولنی میں گزارنا پڑتا۔ میں بھی چار پانچ بار وہاں جاتی۔ اُن دنوں ہر جگہ شورش کی باتیں تھیں۔ ہم کم کھاتے، کم سوتے اور چوبیس گھنٹے کام کرتے۔ بیٹے جس سکول میں پڑھتے تھے وہ اکیلے بالشویک تھے۔ میں اُن کے بارے میں بھی خوف زدہ رہتی تھی۔ پھر ٹراٹسکی کے ایک انجینئر دوست نے انہیں اپنے پاس رکھنے کی ذمہ داری اٹھائی تو میں بھی سمولنی میں رہنے لگی۔

مجھے ابھی یاد ہے۔ لینن اور ٹراٹسکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور چہرے سُتے ہوئے ہوتے۔ کپڑے میلے۔ کبھی کبھی ایسے لگتا جیسے نیند میں چلتے ہوں۔ مجھے یہ خوف ستانے لگتا کہ اگر ان کی یہی حالت رہی تو انقلاب خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

ایک دن ماریا (لینن کی بہن) نے مجھ سے کہا۔ لینن کے کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں اُسے صاف کپڑوں کی ضرورت ہے۔

ہاں واقعی۔ پر پھر اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ صاف کپڑوں کا مسئلہ تو اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔

اس وقت یہ ہال خوبصورتی سے آراستہ ہے۔ پر اُن دنوں یہاں چمڑے کے صوفے اور

کرسیاں دھری ہوتیں بچے باہر درختوں کے نیچے کھیلتے تھک جاتے تو آ کر یہاں سو جاتے۔

انقلاب کی تاریخ مرحلہ وار دیواروں پر آویزاں تھی۔

ہال سے ملحقہ وہ کمرہ تھا جہاں لینن اور ٹراٹسکی کبھی کبھار ہال سے اُٹھ کر چند لمحوں کیلئے آرام کر لیتے تھے۔اس وقت اسکی آرائش و رزیبائش متاثر کرتی تھی۔ پر اُن دنوں یہ خالی ڈھنڈار سا تھا۔بس چند کرسیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہوتیں۔ انقلاب کی شام ٹراٹسکی اور لینن چند لمحوں کیلئے اندر آئے۔ وہ تھکے ہوئے تھے۔فرش پر پرانا پھٹا ہوا کمبل کسی نے بچھایا تھا۔کوئی بھاگ کر دو تکیے لایا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ لیٹے۔انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنے جسموں کو تنے ہوئے تاروں کی طرح محسوس کرتے تھے۔

اور جب لینن نے کہا تھا۔ یہ کیسا حیرت انگیز نظارہ ہے۔محنت کش نے سپاہی کے پہلو بہ پہلو رائفل ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے۔

پھر میں ایک اور کمرے میں داخل ہوئی۔اس کمرے کی تاریخ اُس کی پیشانی پر رقم ہے۔ یہ کمرہ جہاں وہ تاریخی شخصیت میز پر بیٹھی لوگوں سے گھری ہوئی ہے۔

اور جہاں بیٹھے بیٹھے وہ کہتا ہے۔

اب حکومت قائم کرنی ہے۔اسکا نام کیا ہونا چاہیے؟

''سوویت'' ٹراٹسکی کہتا ہے۔عوام کی سوویٹ۔

لینن کو یہ نام بہت پسند آتا ہے۔ بہت خوب۔ یہ انقلابی لگتا ہے۔

لینن انقلاب سے متعلق چیزوں کے بارے میں زیادہ پُر جوش نہیں تھا وہ اس کی گہرائی اور روح کا متمنی تھا۔

لینن کا کمرہ۔ کمرے میں سجی یہ میز اور کرسی کیا وہی ہے یا بدل دی گئی ہے۔میں نے خود سے سوال کیا۔

ڈھیروں ڈھیر کمرے اپنے اندر انقلاب کی کہانیاں سناتے ہیں۔جو طویل بھی ہیں اور

مشکل بھی۔

میں نے چند پڑھیں اور باقی چھوڑ دیں۔ اتنے سے وقت میں کتنا کچھ اور پڑھا جا سکتا ہے۔

پر اُس چمکتی دوپہر میں ماتمی گیت میرے لبوں پر آ گیا تھا۔ کوئی سچا بے لوث مقصد کے لئے زندگی داؤ پر لگانے والا لیڈر میری کتنی بڑی تمنا تھی۔

You fell in the fetal fight.

For the liberty of the people.

For the hounour of the people.

You gave up your life and every thing dear to you.

You suffered in horrible prisons.

You went to exile in chains.

Without a word you carried your chains because you.

Could not ignore your suffering brothers.

Because you belived that justice is stronger than the sword.

باب
32

رُوس کا بے بدل عظیم قومی شاعر الیگزینڈر پُشکن
مالداویائی ''ساشا'' سے ملاقات • پُشکن کے عشق اور نتالیا

Не Повтиримой Руский Вилики Поет "Пушкин"
Вестреча Мольдавяй Сашой
Любовь Пушкина И Наталия

اس اپارٹمنٹ کی کونسی چیز ایسی تھی جو اپنی تاریخی حیثیت میں کم قیمتی ہونے کے باعث کم تر توجہ کے قابل تھی۔ شاید کوئی بھی نہیں۔ پھر میں نے اُس کمرے میں کیوں ڈیرہ لگا لیا تھا جو اُن کی خواب گاہ تھی اور جہاں نتالیا کا دلکش پورٹریٹ اور تصویریں آویزاں تھیں۔

کوئی چہرہ اس ظالمانہ حد تک بھی خوبصورت ہوسکتا ہے۔ جیسا دیواروں پر ٹنگا یہ۔ میری آنکھوں کی ایکس رے مشین اس کے ایک ایک نقش کی باریکی میں اُتری تھی۔ اس کے بالوں کے براؤن سنہری شیڈ نے بے اختیار ساحلوں پر ڈوبتے سورج کے شفق رنگوں کی مجھے یاد دلائی تھی۔ یہ فنکار کے نوک برش کا مبالغہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ ماسکو اور دارالحکومت پیٹرز برگ کی کورٹ سوسائٹی کی سب سے زیادہ زبان زد شخصیت۔

یہ رُوس کے بے بدل عظیم قومی شاعر اور نثر کے بڑے لکھاری الیگزینڈر سرگیوچ پشکن

(Aleksandr Sergeevich Pushkin) کا گھر تھا ویسے تو دراصل یہ جگہ شہزادی والکنو سکایا کی ملکیت تھی۔ پر زار شاہی کی طرف سے پشکن کو رہائش کے لئے عنایت ہوئی تھی۔ یہاں اُس نے اپنی زندگی کا ایک سال گذارا۔ اس کی موت کے بعد اسے میوزیم بنا دیا گیا۔

بڑی تھوڑی سی زندگی۔ 26 مئی 1799ء کی پیدائش اور 10 فروری 1837ء کو وفات۔ درمیانہ مختصر سا وقت ہنگاموں، باغیانہ سرگرمیوں، بغاوتوں، رومانوں اور تخلیقی کاموں میں بسر ہوا۔

''کیٹس کی طرح بھلا اتنی کم عمر کیوں لکھوا کر آیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔''

ہماری واپسی اب سر پر تھی سات دنوں کا ہواؤں میں اُڑتے ہوئے پتہ بھی نہ چلا تھا۔ اور ابھی تک اسے دیکھا نہیں گیا تھا۔ پشکن میوزیم نہ دیکھا جاتا تو میرے لیے آگرہ پہنچ کر تاج محل نہ دیکھنے والی بات ہو جاتی تھی۔ جو مجھے قطعاً قبول نہ تھی۔ پس بھاگی۔ الیگزینڈر کالم کے پاس مویا کا نہر کے کنارے پر خوبصورت سہ منزلہ اور دو منزلہ عمارتوں کے حصار میں گھری نمبر بارہ کے سامنے جا رکی۔

میں نے پشکن کو نہیں پڑھا تھا۔ جب رُوس کیلئے تیاری کے مراحل میں تھی ذوالفقار تابش ایک دن فون پر تھے۔ تابش صاحب میرے دیرینہ کرم فرما ہیں، محبت سے گویا ہوئے۔

''تم نے کن کن رُوسی لکھاریوں کو پڑھا ہے۔''

جنہیں پڑھا تھا گنوا دیا۔ سوال ہوا۔ پشکن نہیں پڑھا۔ میں کتاب بھیج رہا ہوں۔ اُسے پڑھے بغیر نہ جانا۔

سچی بات ہے میں ممنون بھی ہوئی اور دعا بھی دی کہ چلو میرا ایک عظیم شاعر سے ابتدائی تعارف تو ہوا۔ انصاری صاحب کا منظوم ترجمہ بھی کمال کی چیز تھی۔

بلند و بالا براؤن محرابی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ تو ایک شاہانہ عظمت کا پَرتو ہر سو

بکھرا ہوا نظر آیا تھا۔ یہ میوزیم دوستو وسکی سے بہت مختلف تھا۔ محرابی صورت والے برآمدوں سے آگے وسیع لان جس میں گول چبوترے پر کھڑا پشکن دراصل اپنی عظمت کے بلند مینار پر کھڑا ہے جس کا اعتراف اس کی موت کے بعد ہوا۔

شاعر اپنے ددھیالی حوالے سے رُوسی اشرافیہ کی اونچی کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ ماں ایتھوپیا کے ابرام پیٹرووچ ہنی بال کی نواسی تھی جسے افریقہ میں اغوا کر کے قسطنطنیہ لایا گیا اور عثمانی سلطان نے اسے پیٹر اعظم کو تحفے کے طور پر بھیجا۔ پیٹر اعظم کو اپنا یہ خادم بے حد پسند تھا۔ اُس کی شادی خاص طور پر منصب دار گھرانے میں کی گئی۔

میں اُس وقت ڈرائینگ روم میں تھی۔ آسمانی رنگ کی دیواروں والا کمرہ جس کا سامان آرائش بے حد سادہ اور مختصر تھا۔ دیوار پر پشکن کا پورٹریٹ سجا ہوا تھا۔

اُلجھے اُلجھے گنگھریالے بال موٹی آنکھیں اور موٹے ہونٹ رخساروں پر پھیلی پر ٹھوڑی پر کٹی ہوئی داڑھی۔ پشکن اپنے افریقہ سے تعلق پر ہمیشہ نازاں رہا۔ اور جب کبھی بھی اس کا سانولا رنگ اس کی گرم مزاجی اس کی باغیانہ طبیعت اور خودسری زیرِ بحث آئی اُس نے ہمیشہ مسرور لہجے میں کہا۔

''مجھے اپنے مشرق سے تعلق پر فخر ہے اور افریقیوں سے مجھے قلبی محبت ہے۔''

اور اُس کا اظہار اس کی شاعری میں کہیں کہیں پر کہانیوں اور تاریخی ناولوں میں خاصی مقدار میں ہوا۔

کمرے میں رکھی میزوں پر خوبصورت شمع دان، ٹیبل لیمپ اور اُس کی شاعری کے دستی نمونے سجے تھے۔

جس ماحول میں اُس نے آنکھ کھولی تھی وہ گھر بھی علم وادب کا گہوارہ تھا۔ اُس کا چچا شاعر، اُس کی پھوپھیاں ادب شناس اور اُس کے گھر میں اُس وقت کے رُوسی ادب کے مایہ ناز ادیبوں جن میں نکولائیا کرامزن (Nilolai Karmzin) اور ویسلے ژکوسکائے۔

Vsily Zhulov Sky کا کثرت سے آنا جانا تھا۔ اُس کے باپ کے گھر کی الماریاں اگر فرانسیسی ادب سے مالا مال تھیں تو جس گھر میں اُس نے اپنی آخری سانسیں لیں وہاں بھی فرنچ لٹریچر کثرت سے تھا۔

میں اُس وقت اُس کے سٹڈی روم میں تھی۔ جہاں سبز دیواروں کی چھتوں کو ہاتھ لگاتی الماریاں پاؤں سے سرتک انتہائی قیمتی کتابوں سے سجی ہوئی تھیں۔ دراصل اُس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی اس میں فرانسیسی کلچراورادب رُوسی کلچراورادب کے ساتھ بُہت نمایاں تھا۔ اُس کے گھرانے کے بچوں کے لئے نوکر چاکر اگر دیہاتوں سے آتے تو ایک اتالیق کا فرانسیسی ہونا بھی ضروری تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ وہ بُہت چھوٹی عمر میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فرانسیسی ادب سے روشناس ہو چکا تھا۔

اُس کی میز پر کاغذ پڑے تھے۔ بڑا خوبصورت ٹیبل لیمپ سجا ہوا تھا۔ ایک جانب کتابوں کا ڈھیر تھا۔ ایش ٹرے، ڈیکوریشن پیس اور بڑے خوبصورت پیپر ویٹ تھے۔ کُرسی کا رُخ ذرا سا ٹیڑھا تھا یوں جیسے کوئی لکھتے لکھتے کسی کام سے اُٹھ کر باہر چلا جائے۔ وہ بھی تو شاید اُٹھ کر باہر ہی گیا تھا اور پھر اس کرسی پر دوبارہ بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا۔

اُس کی پیدائش ماسکو کی تھی۔ ابھی ابھی اُس کے والدین اور رشتہ داروں کی تصویریں دیکھتی ہوئی باہر آئی تھی۔ باپ سرجی لیووِوچ (Lvovich) اگر اپنی ظاہری ہیت میں رومانوف کے زبردست زاروں جیسا تھا تو ماں نادیزداہنی بال بالشت بھر لمبی گردن پر ٹکے خوبصورت چہرے والی متکبراور نخوت پسند عورت نظر آئی تھی۔ یوں عملی زندگی میں وہ تھی بھی ایسی ہی۔ بچوں سے لاپرواہ اور لاتعلق سی۔ پُشکن کی شاعری میں ماں کا ذکر نہیں۔ ہاں البتہ اپنی آیا سے محبت کا کئی بار اظہار ہے۔

اس شرارتی ضدی اور ہٹ دھرم سے بچے کو گیارہ سال کی عمر میں سکول کے جس بورڈنگ ہاؤس میں بھیجا گیا۔ وہ الیگزینڈر اوّل نے روس کے اعلیٰ طبقے کے بچوں کیلئے

Tsarkoye Selo میں امپرئل لائسیم کے نام سے قائم کیا تھا۔ پُشکن منفرد اور مشکل بچہ تھا۔ رُوسی اور فرانسیسی لٹریچر میں اس کی کارکردگی بہت نمایاں تھی۔ باقی مضامین میں بس گذارہ تھا۔

اُس کی شاعرانہ صلاحیتوں نے بھی اسی عمر میں پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے تھے۔ یہاں اُس کا ہدف اُس کے ناپسندیدہ ہم جماعت اُستاد خاص طور پر مذہبی تعلیم اور سرکاری کارندے بنتے مگر اس قیام نے اُسے ذہنی اور فکری بلوغت بھی دی۔

صرف سولہ سال کی عمر میں اُسنے رُوسی اشرافیہ کے ایک بڑے اجتماع میں اپنی نظم سنائی۔ داد سمیٹی اور لوگوں نے یک زبان کہا: ''مستقبل میں روس کا عظیم شاعر ہوگا۔''

''ریپن'' کی یہ پینٹنگ میں نے بڑے کمرے میں دیکھی تھی۔ کرسیوں پر بیٹھے عمر رسیدہ اُدھیڑ اور نوجوان مردوں عورتوں کا ایک ہجوم ایک طرف دھری میزوں کے آگے کرسیوں پر بیٹھے غالباً جج صاحبان اور عین درمیان میں نوخیز سا لڑکا ہاتھ اٹھائے نظم پڑھتا ہوا۔ کس غضب کا انداز تھا۔

نپولین کا رُوس پر حملہ آور ہونا اور اُس کا شکست کھانا۔ فوجی جوانوں کا سکول کے دیوار کے پاس سے مارچ کرتے اور ترانے گاتے ہوئے گذرنا اور اُس کا انہیں دیکھنا اُس کی اوائل عمری کے وہ نقش تھے کہ جن کی کیفیات کے عکس اُس کی آئندہ شاعری میں نمایاں ہوئے۔ اسی طرح یورپ سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ترقی پسند خیالات کے ساتھ واپس آ کر مجلسوں اور محفلوں میں لکچر دینا، مباحثے اور مذاکرے کرنا اور اس کی اُن میں مسلسل شرکت نے اُس کے فکری شعور کی تربیت کی۔

میوزیم کے کمروں کے دروازے اندر ہی اندر ایک دوسرے میں کھلتے چلے جاتے تھے۔ کہیں بچوں کے کمرے، کوئی نشست گاہ تو کوئی نتالیا کا ڈریسنگ روم۔ کمروں کا جداگانہ رنگ و روپ انہیں انفرادیت دینے کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق کا بھی حامل تھا۔

تھوڑی سی دیر کیلئے برآمدے میں پڑی بینچ پر بیٹھی تو پُشکن کی زندگی کے کچھ نئے پہلو

سامنے آ گئے تھے۔ ملازمت سرکاری ملی اور اونچی بھی تھی۔ رئیسانہ ٹھاٹ بھاٹ تو پہلے ہی تھے۔ یہ دور مکمل لعو و لعب اور عیاشیوں میں گذرا۔ ناچ گانے، تھیٹر جوئے بازی، شراب نوشی، مذہب اور حکومتی اراکین پر طنز و مذاق تو خیر عام سی باتیں تھیں۔

جلد باز بھی تھا اور جذباتی بھی۔ ذرا سی بات پر گولی سے فیصلہ کرانے پر مصر ہو جاتا۔ اس کے احساسات و جذبات کی بے باکی نے جنس، رومان اور سیاست پر اُس کی خوبصورت طبع آزمائی کو بطور ایک رومانی شاعر کے اُسے اہم کیا۔

اُس کی طویل بیانیہ نظم ''رسُلان اور لُد میلا'' روسی معاشرے کی ایک فوک عشقیہ داستان منظر عام پر آئی۔ تین ہزار مصرعوں کی اس نظم نے روسی شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے سجا کر دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا۔

پھر ایک حیرت انگیز اور عجیب سی بات ہوئی بے حد عجیب۔

کوئی تیس (30) بتیس (32) کے دائرے میں گھومتی ایک قدرے فربہی مائل جسم کی دراز قامت لڑکی میرے پاس آ کر رُکی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور دو سوال پوچھے۔ پہلا سوال تو چلو سیاحوں سے ہر کوئی پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ آپ کہاں سے ہیں؟ لیکن دوسرے سوال نے مجھے حیرت کے سمندر میں پھینک دیا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھتی تھی کہ آخر اس درجہ باریک بینی سے اُسے میری حرکات کا مشاہدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے مسکراتے ہوئے اُس کا بازو پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔

تاریخ میں اپنا نام بڑے آدمی کے طور پر لکھوانے والے لوگوں کے محبوب یا ان کے زوج کے بارے میں جاننے کا بالعموم فطری تجسس ہر کسی کو ہوتا ہے۔ نتالیا کی تصویروں کے سامنے دیر تک کھڑے ہونے کی وجہ یہی احساس اور یہی فطری تجسس تھا۔

''خبیث عورت۔''

اُس نے ہونٹ سکوڑے اور ایک ایسے لہجے جس میں دُکھ گھلا ہوا تھا بولی۔

روس کی ایک جھلک

روس کا بے بدل شاعر الیگزینڈر پشکن

نتالیہ پشکن

12 مویکا (Moika) نہر کے کنارے عظیم شاعر کا وہ گھر جہاں اس نے زندگی کی آخری سانسیں لیں

رُوس کی ایک جھلک

ریمبراں (Rombrandt) کے شاہکار

قدیم ترین تہذیبوں کا آرٹ

یونانی آرٹ کلاسیکل اور ہیلنسٹک (Hellenistic) ادوار

سترھویں صدی کے فلیمش (Flemish) آرٹ کی ایک جھلک

فرنچ آرٹ

مصری آرٹ

ایسے بے مثال شاعر جس نے تھوڑے سے وقت میں رُوسی ادب کو اتنی بے شمار جہتیں دیں۔ اس کی بے وفائی اور کٹھور پن کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یوں اگر وہ اس کے عاشق جارج دی انتھیس کے ساتھ ڈوئل میں اُس کی گولی کا نشانہ نہ بھی بنتا تب بھی ایک دن اُس نے مرجانا تھا۔ بس یہی ایک دو سال اور جی لیتا۔ گھٹن اور پریشر نے اس کا سینہ پھاڑ دینا تھا۔"

میں بٹر بٹر اس کا چہرہ دیکھتی تھی۔

ایسی سُشتہ انگریزی بولتی تھی کہ اپنے نو دن کے قیام میں ایک دن بھی اتنا رواں لب ولہجہ سننے کو نہ ملا تھا۔ وہ مالداویا کے دارلخلافہ کیشینف (Kishinev) کی ساشا تھی جو لندن کی کسی یونیورسٹی میں رُوسی ادب پڑھاتی تھی۔ ان دنوں پیٹرز برگ آئی ہوئی تھی۔ اور اُس ٹورسٹ گروپ کی منتظر تھی جس نے دو بجے میوزیم پہنچنا تھا۔ پشکن کی سچی عاشق۔

میں گنگ سی بیٹھی اسے اتھاہ حیرت سے دیکھتی تھی۔ مغربی پہناوے میں لپٹی اس لڑکی کے اندر کیسی مشرقی روح تھی۔ ایسے خیالات واحساسات تو ہم تیسری دنیا کی عورتوں کے ہوتے ہیں جنہیں بڑا دقیانوسی کہا جاتا ہے۔

محبت کے خمیر میں گندھی ساشا کی قربت مجھے اُس سردسی سرزمین پر بہار کے کسی معطر جھونکے کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی Ode To Liberty پڑھی ہے آپ نے؟ ساشا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

دراصل اس کی یہی نظم اُس کی جلاوطنی کا باعث بنی تھی۔ اس نظم میں زار رُوس "الیگزینڈر اول" کے اُس ظلم وزیادتی پر بھرپور احتجاج اور دکھ کا اظہار تھا جس کا وہ اپنے والد پال اوّل کو قلعہ میخائل وسکائے میں دھوکے سے قتل کرنے کا مرتکب ہوا تھا۔

پر یہ جلاوطنی بڑی نعمت ثابت ہوئی تھی۔ رُوس کی جنوبی ریاستوں کوہ یورال کوہ قاف کی وادیوں بحیرہ ارل اور بحیرہ کیسپین کے ساحلی علاقوں نے اُس کے مشاہدے، اس کے تجربے اور

انسانی فطری رویوں کے مطالعے نے اس کے علم میں اضافہ اور تخلیقی کام میں رنگ بھرا۔ ترکوں، چرکسوں، تارتاریوں، جارجیائی اور کاکیشیائی قبائل کے لوگوں سے میل جول اور جنوب کے علاقائی حسن، سادگی اور تصنع سے پاک ماحول اس کی شاعری پر کئی جہتوں سے اثر انداز ہوا۔ اس دور کی شاعری پر لارڈ بائرن کا بھی اثر ہے۔ ''Sea'' اس کی واضح مثال ہے جہاں وہ بائرن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اُس کے دنیا سے جانے پر افسردہ ہے۔

''The Caucasian Captive'' کوہ قاف میں رہنے والے قبائل چرکسوں اور کاکیشیوں کے ایک روسی قیدی کی زبان سے اُن کے رہن سہن، اُن کی دلیری شجاعت، اُن کے گھوڑوں کے اوصاف، ان کی مہمان نوازی کا ذکر کرتے ہوئے وہ رُوس کے جیالے سپہ سالاروں کو بھی خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ جنہوں نے ان قبائل کے ساتھ سرحدی لڑائیوں میں دادِ شجاعت دی تھی۔

مستی سلاف کہ جب روسی فوج ماری گئی تھی اور وہ تن تنہا لڑا اور فتح یاب ہوا۔

اس کے لہجے کا فخر اور غرور بہت نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے روس کا دو سروالا عقاب سے سجا پرچم فضا میں لہرایا تو ہم کس قدر مُسرور اور سرخرو تھے۔

روسی جرنیل سیسیانوف کا ذکر کرتے ہوئے بھی اس کا انداز اُسی تفاخر میں ڈوبا ہوا ہے کہ جب شمالی قازقستان کے تیریک دریا کے پانی لہو بن گئے تھے۔ اُن چٹانوں اور پانیوں پر سیسیانوف کی پیشانی کی چمک تھی۔ روسی جرنیل یرمولوف کے بارے میں لکھتے ہوئے قازق لوگوں کو خبردار کرتا ہے۔

''ذرا سن اے قازق یرمولوف آتا ہے۔''

مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ کتنا مانوس سا یہ فقرہ تھا۔ میں نے ساشا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ساشا مجھے تمہارے اس فقرے سے اپنے لوگ یاد آ گئے ہیں جو اپنے اپنے سیاستدانوں کے لئے کہتے ہیں۔

ذرا ٹھہرو قاضی حسین آتا ہے۔ ذرا سنو نواز شریف آتا ہے۔ ذرا سنو بے نظیر آتی ہے۔

ساشا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کی ہنسی مجھے باغیچے میں سبز گھاس پر بکھری دھوپ کی مانند خوبصورت لگی تھی۔

پشکن یوں بھی ریلوف کا بہت مداح تھا کہ وہ زار روس کا مخالف اور دسمبر کے باغیوں کا حمایتی تھا۔

اُن لوگوں کے شب و روز کی پشکن ایک ایسی تصویر پینٹ کرتا ہے کہ ان کی معاشرت کے سبھی رنگ، ان کی فکری سوچ اور علاقے کا حُسن و روپ یوں سامنے آتا ہے کہ قاری خود کو کسی گرفت میں لینے والی فلم کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

یہی صورت The Gypsies میں ہے۔ بلقان کے خانہ بدوشوں کی زندگی کی ایک سچی تصویر جس کے مرکزی کردار شہری مرد الیکو بسرابیہ (بلقان کا ایک علاقہ جس پر روسیوں اور ترکوں کی لڑائی ہوتی رہی) کی زیمفیرا اور اُس کا بوڑھا باپ جسے سنتے ہوئے مجھے احساس ہوا تھا کہ خانہ بدوشوں کے فطری احساسات و جذبات سرحدوں سے اور فاصلوں سے کتنے بلند و بالا ہیں۔ بنجارے ہمارے ہاں بھی ایسے ہی ہیں۔ شاعر نے کیسی سچی ان کی عکاسی کی ہے کہ ایک تابناک تصویر سامنے آ گئی ہے۔

باغیچہ سرائے The Fountain of Bakhchisarai کی اس طویل نظم میں شاعر کا تاریخ پر گہرا مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور ذاتی تجربہ بہت شدت سے نظر آیا۔ روس کے جنوب کی وہ ریاستیں جن پر کبھی تاتاریوں کے جھنڈے لہراتے تھے۔ اور چنگیز خان کے پوتے کے گولڈن ہورڈ (فوجی لشکر) یوکرائن، ماسکو، ہنگری اور پولینڈ تک کے علاقوں کو روندتے پھرتے تھے۔

نظم میں حرم کی عورتوں کی زندگی، ان کے نفسیاتی و جذباتی مسائل، خواجہ سراؤں کے کردار، سلطان کا حرم کے اندر زندگی گزارنے کا ڈھنگ، تاتاری گیت، اُن گیتوں کے کردار زریمہ جو جارجیا کی فتح کے بعد سلطان کے حرم میں داخل ہوئی اور پولینڈ کے شہر باغیچہ سرائے کی

شہزادی ماریا جسے تاتاری خان اپنا دل دے بیٹھا تھا۔ شاعر نے کس کمال سے منظر کشی کی تھی کہ ایک ایک منظر اپنی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ سامنے آتا تھا۔

اس طویل نظم کا وہ حصہ بہت خوبصورت ہے جہاں تاتاریوں کے عروج و زوال کی داستان کو اختتام پذیر کرتے ہوئے ان کے ویران محلوں، افسردہ باغوں اور قبرستانوں کے ساتھ ساتھ اُس فوارے کا بھی ذکر ہے۔ جو شہزادی ماریا کی یاد میں تاتاری خان نے بنایا تھا۔ فوارے کے اوپر ہلال اور صلیب ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُس کا نام محل کی عورتوں نے ''آنسوؤں کا فوارہ'' رکھ چھوڑا تھا کہ باغیچہ سرائے کی شہزادی وہاں بیٹھ کر اپنے محبوب کی یاد میں رویا کرتی تھی۔

ساشا نے کتنے خوبصورت انداز میں اُس کی شاعری کے چند اہم شہ پاروں کو بیان کیا تھا۔ سُن کر مزہ آیا تھا۔

"Prophet" بھی ایک شاہکار مختصر نظم ہے۔ دیکھئے رُوح کی تشنگی سے ہلکان شاعر کو چھ پروں والے فرشتے نے اپنی سبک انگلیوں سے چھو کر اُس کا سینہ چاک کر کے کیسے اس میں سچ کہنے کے انگارے بھر دیئے ہیں۔

''سنو ذرا''۔

میرے دل کی جگہ شعلوں جیسے انگارے رکھ دیئے گئے ہیں۔ آگ بھڑکی۔ سینہ پھٹا۔ کوئی لاش جیسے ویرانے میں پڑی ہو۔ اور پھر کہیں کوسوں دُور سے کسی غیبی آواز کی پکار، کہا گیا، اپنا سر اٹھا۔ آنکھیں کھول کہ تو پیغمبر ہے اور میری رُوح تیرے اندر ہے۔ میرا پیغام سنا کہ سوئے ہوئے لوگ جاگ اٹھیں۔

سچی بات ہے میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ پیغمبروں پر نزول کی ساری کیفیات سامنے آ گئی تھیں۔

ان نظموں کی نغمگی، معنوی خوبصورتی، حد درجہ دلکشی، اشعار کا توازن اور تناسب ان کی جامعیت اور بندش۔ اُس کی چار مصرعوں کے بند والی نظمیں رُوسی زندگی کی حقیقی ترجمان بن گئی

تھیں۔ فطرت کے عناصر ہوا، سُورج، روشنی، اندھیرا زندگی کے ہنگامے اور حقیقتیں اُس کی شاعری کے وجود میں یوں گھستی تھیں جیسے انسان کے وجود میں سانس۔ شہرت کا ہما سر پر بیٹھ گیا تھا۔

اُس کی شاعری کے حسن میں نئے رنگ بھرنے میں اُن ذی علم منچلوں کا بھی ہاتھ ہے جو اپنے حقوق کیلئے جلوس نکالتے، ہڑتالیں کرتے اور زار کے خلاف سازشوں کے جال بنتے رہتے۔

دسمبر 1825ء کی انسانی حقوق کی تحریک (دسمبرسٹ موومنٹ) کے حامیوں کے جلوسوں پر جب گولیاں چلیں۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ باغی سولیوں پر چڑھائے گئے۔ بے شمار جلاوطن ہوئے۔ جانتی ہو۔ ساشا نے میری طرف دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں مجھے عقیدت و محبت کا ایک سمندر نظر آیا تھا۔

اُن کی زبانوں پر اُس کے اشعار تھے۔ اُن کے سامان میں پشکن کے خطوط تھے۔

میں ایک ٹک اس کے چہرے اور اس کے ہونٹوں کو ہلتے دیکھتی تھی۔

''سنو''۔

اُس نے گنگنانا شروع کیا اپنی لے میں وہ گنگناتی چلی گئی یہ سوچے بغیر کہ مجھے روسی نہیں آتی۔ شاید اُسے جلد ہی احساس ہو گیا تھا۔

''اوہ'' وہ انگریزی بولنے لگی تھی۔

سائبیریا کے جنگلوں، بیابانوں میں تمہارے دل اور عزائم بلند رہیں۔ تمہاری قید کے مہیب غاروں میں میری آواز تم تک ہر صورت پہنچے گی۔ تمہاری یہ آہنی بیڑیاں اور تمہارے زندان کی تیلیاں ایک دن ٹوٹ جائیں گی اور وہ صبح طلوع ہوگی کہ جب تمہارے ہم وطن تمہیں خوش آمدید کہیں گے۔ یہ ایک نئی صبح ہوگی جس کا تمہیں انتظار ہے۔

مجھے فیض یاد آیا تھا۔ اور میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''پشکن نے بہت سارے عشق کیے تھے۔'' ابھی اتنا ہی بول پائی تھی۔

اُس کے لہجے میں تیزی تھی۔ اُس نے میری بات کاٹ دی تھی۔ ''شاعر تو ہوتا ہی عشق کرنے کیلئے ہے۔ لڑکیوں اور عورتوں کا اس سے اور اس کی شاعری سے عشق بہت ضروری ہے۔ یہ عمل نہ ہو تو اکثر تخلیق کے سوتے نمو نہیں پاتے۔ تمہارے ہاں شاعر سے عشق نہیں کیا جاتا۔''

''بنیادی طور پر تو دنیا کے ہر خطّے کے انسان اپنی نفسیات اور جبلّت میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کم وبیش ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ دیس کے شاعروں کی لمبی قطار آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔''

''مجھے دیکھو ساشا میری آنکھوں میں جھانکی میں اُس کے عشق میں گرفتار ہوں۔ تمہارے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی ہوں تمہارے لئے نہیں اپنی تسکین کیلئے۔''

پشکن نے اپنی جلا وطنی کا زمانہ مالدوایا میں گزارا۔ تین چار سال۔ اُس نے ہم لوگوں سے محبت کی۔ ہمارے اُوپر لکھا۔ ہماری تہذیبی زندگی اور کارناموں کو اپنی شاعری میں سمو کر اُسے عام کیا۔

کیشنیف میں لینن سٹریٹ پر وہ خوبصورت سفید بڑا سا گھر ابھی بھی ہے جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ کیکر اور لائم کے درختوں سے سجی سڑک پر میرے ابا کے گھر سے تھوڑی ہی دُور ایک ہزار سال پُرانے پتھر کا محرابوں والا پھاٹک ہے جس پر ترکوں سے چھینی ہوئی توپوں سے ایک گھنٹی بنا کر لگائی گئی ہے۔ اُس کے پاس ہی واقع پارک میں جب بھی شام کو کھیلنے جاتے. میں اُس ستون کے پاس ہمیشہ رُکتی۔ اس پر نصب مجسّمے کو دیکھتی اور اپنی بڑی بہن سے پُوچھتی۔ جو مجھے بتاتی۔ یہ بُہت بڑا شاعر ہے۔ ہمارا شاعر یہ الیگزینڈر پشکن ہے۔

مالدوایائی لوگ پشکن سے بُہت پیار کرتے ہیں۔

رُوسی لوگوں اور اُن کے کلچر سے محبت بھی اُنہیں پشکن کی وجہ سے ہے۔

پھر ساشا نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اٹھا کر اُس کمرے میں لے گئی جہاں ٹی وی پر اس

کی زندگی کی ڈاکومنٹری چل رہی تھی۔ہم دونوں میٹ پر بیٹھ گئیں۔میں نے دیوار سے ٹیک لگالی تھی۔

سکرین پر میرے سامنے پسکوف کا شہر آیا اس شہر کا گاؤں میخائلوفسکوے اُس کی خاندانی جاگیر پر بنا ہوا وہ گھر جہاں وہ عظیم شاعر رہتا تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے اس علاقے کو تباہ کر دیا تھا۔رُوسی کلچر کی سب یادگاریں ملیامیٹ ہوگئی تھیں۔ساشا نے مجھے بتایا۔جنگ کے فوراً بعد حکومت نے محفوظ خاکوں کے مطابق گھر دوبارہ اسی انداز میں تعمیر کیا۔پشکن کی آیا آرینا رودیونووناکے گھر کو بھی ٹھیک کیا گیا۔سوویت حکومت نے ہر اُس یادگار کو محفوظ کیا جو کسی نہ کسی حوالے سے شاعر سے متعلق تھی۔
دونوں گھر سکرین پر میرے سامنے آئے۔یہاں اُس نے قید تنہائی کاٹی تھی۔سخت سردیوں میں برف سے ڈھنپے راستے اور گھر کی کھڑکیوں دروازوں سے جھانکتی تنہائی اُداسی اور ویرانی کے گھمبیر سے تاثر نے مجھے افسردہ کر دیا تھا۔

''سویتا گورسک'' کی خانقاہ میں شاعر کی قبر پر ہر سال لگنے والے میلے کی جھلکیاں تھیں۔ لوگوں کا ہجوم بے کراں تھا۔ان کی محبتوں اور چاہتوں کے اظہار تھے۔

''تو آؤ پھر میناوساغر کی بات کریں۔''

جب وہ Tsarkoye Selo میں زیر تعلیم تھا پیلس کے شاہی باغوں میں بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔وہ اپنی نظمیں انہیں سناتا اور مُسکراتے ہوئے کہتا۔

''صرف تمہارے لئے۔''

بحیرہ کیپسین کے ساحلی حصوں جارجیا پاکیشیا، یورال کے پہاڑی سلسلوں قازقستان میں اپنے قیام کے دوران یہاں کی توبہ شکن حسن کی مالک عورتیں اس کی کمزوری بنیں۔

کارولینا سوبنیکائے کمال کی خوبصورت عورت تھی۔عمر میں اُس سے بڑی تھی۔ذہین، حسین اور عیار۔دھڑلے نخرے نخرے اور شاعرانہ ذوق کی حامل، اُس کی شاعری کی نزاکتوں

اور باریکیوں کو سمجھنے والی۔

پشکن بھی اس کی ذہانت اور رسیلی آواز کا شیدائی تھا۔ جارجیا کو روسی گروزین کہتے ہیں اپنی ایک نظم میں گروزینی حسینہ کو مخاطب کرتے ہوئے اُس نے جس دل پذیر انداز میں اُس کے حسن اس کے گروزینی گیتوں اور ان میں چھلکتے اپنے گھر سے دور ایک انسان کے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ اپنی مثال آپ تھا۔

نائٹ اور Beneath the blue sky of her native land وہ اکثر اُس سے فرمائش کر کے سنا کرتی۔

اینا کیرن بوڑھے جرنیل کی بیوی Amalia Riznich کسی بڑے تاجر کی بیوی۔ اینا اولینیا اینا وولف بے شمار عورتوں کا وہ شیدائی اور بے شمار عورتیں اس پر عاشق۔

پشکن انسانوں کو سمجھنے میں تیز تھا پر عورتوں کو سمجھنے میں بودا۔ ان ڈھیر ساری عورتوں میں سے کسی نے بھی اُس سے بے لوث اور دل و روح کی سچائی سے پیار نہیں کیا تھا۔ سوائے اینا وولف کے۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ شاعر اُس کے کیلئے جذبوں کی وہ شدت محسوس نہیں کرتا تھا۔ گو اُس نے کچھ وقت اس کے ساتھ ضرور گذارا۔

کونٹس علیزہ ورونسوطر حدار اور خوبصورت ہی نہ تھی اوڈیسہ کے گورنر کی بیوی بھی تھی۔ اور گورنر کو اس کے معاشقے کا علم ہو گیا تھا۔ تو عتاب کا گولہ برسا۔ اوڈیسہ سے اُس کا اخراج ہوا بہت سارے الزامات کے ساتھ۔ جن میں بدچلنی بھی ایک تھا۔ سرکاری ملازمت ختم۔ زار نے اُسے میخائلوفسکوئے پر نظر بند کر دیا۔

رشتے دار تو پہلے ہی نالاں تھے۔ ماں باپ کے ساتھ تعلقات بھی خوشگوار نہ تھے باپ اس کی باغیانہ سرگرمیوں پر ہمیشہ سے تشویش اور فکر میں مبتلا رہتا تھا۔ بیٹا شاہی اشرافیہ میں اس کے لئے باعث فخر بننے کی بجائے شرمندگی اور ذلالت کا موجب بن رہا تھا۔ زار بھی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے باپ کو تاکید کی گئی تھی کہ بیٹے پر کڑی نظر رکھے اس کی ڈاک

کھولی اور پڑھی جائے اور جہاں روکنے والی ہو۔ روکی جائے۔ ایک بدنام سی کہانی اس پیرائے میں بھی مشہور ہوگئی تھی کہ اُس نے اپنے باپ کو مارنے کی کوشش کی۔

خاندان کا متفقہ فیصلہ تھا کہ اُسے جاگیر پر تنہا چھوڑا جائے۔ شاید خاندان کا یہ بائیکاٹ اور انتہائی قدم اُسے راہ راست پر لے آئے۔ پورا خاندان نومبر کے وسط میں سٹیٹ سے چلا گیا اور پشکن وہاں صرف آیا آرینا کے ساتھ رہ گیا۔

پر وہ بھی شاعر تھا اور شاعر بھی خداداد، حالات کا ہر تازیانہ اس کی شاعری کے لئے مہمیز ثابت ہو رہا تھا۔

سرکاری نگرانی اور بغیر اجازت کے باہر نہ جانے کی سزا نے اُسے ٹک کر بیٹھنے اور نامکمل کاموں کی تکمیل کی مہلت دی۔ ''ایوگے نی انے گن'' (Eugene Onegin) کا پورا خاکہ ترتیب دیا گیا۔ بلکہ تین چار باب مکمل بھی کئے۔

اُس کی خاندانی آیا آرنیا (Arina Rodionovna) کی شفقت اور پیار نے اُس پر عام رُوسیوں کی سادہ دلی، محبت، ہمدردی اور ممتا کے نئے رنگ وا کیے اس پر اس طبقے کی وہ خوبیاں آشکارا ہوئیں جن سے بالائی طبقہ محروم تھا۔

آرینا نے پشکن کو زمانوں پرانی وہ فوک کہانیاں سنائیں جو حکمت و دانائی سے پُر اور زندگی کے تجربے سے گندھی ہوئی تھیں۔ یہ وہی تھی جس نے اس نوع کی زندگی کے احساسات سے اُسے روشناس کیا اور اس کی جھلک اس کی بہت سی نظموں میں ظاہر ہوئی۔

آرنیا پشکن کی کئی حماقتوں اور غلطیوں کو چھپا جاتی۔ ممتا کی چھاؤں میں اس کی پریشانیوں کو سمیٹ لیتی۔

''Winter evening'' میں وہ اُسی سے مخاطب ہے۔

محبت اور عقیدت کی ایک اتھاہ ہے اُس کے لہجے میں جب وہ کہتا ہے۔

''جام کا پیالہ اٹھا اور میرے ساتھ پی کہ تو مجھ جیسی دکھی جوانی کی ساتھی ہے۔ آ کہ ہم

اپنی تلخیاں اس جام میں گھول لیں۔ مجھے ننھی چڑیا کا گیت سنا۔ مجھے اُس لڑکی کا گیت سنا جو بہت سویرے پانی بھرنے جاتی ہے۔''

برسات اور خزاں دونوں موسم اُسے بہت ہانٹ کرتے تھے۔ برسات جب گلیاں اور سڑکیں کیچڑ سے لت پت ہوتی تھیں اور خزاں جب انگور پکتے تھے۔

پھر دوستوں کی کوششوں سے ماسکو واپسی ہوئی۔ یہ چھ سات سال اس کی ادبی زندگی کا عروج تھے جس میں اُس نے رزمیہ شاعری کی ''ایوگے نی انے گن Eugene Onegin'' منظوم ناول میں فکروسوچ اور بیان کی دلکشی و بے ساختگی نے رُوسی شاعری کو مالا مال کر دیا۔ رُوسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ پلتاوا بھی جب منظوم صورت میں منظر عام پر آیا تو قدامت پرست روسی بھی پشکن کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہوا۔

The Bronze Horse man کو بھی تنقید نگاروں نے اُس کا شاہکار کہا ہے۔

ساشا بولے چلی جاتی تھی اور میری نگاہیں جو سکرین پر جمی تھیں دل جمعی سے وہاں اُسے دیکھ نہ پاتی تھیں۔ روس کی ایلیٹ کلاس کے مجمع میں شاعرانہ کلام سناتے ہوئے قدیم کلاسیکل سٹائل کے کپڑوں میں ملبوس یہ تصویر بھی کسی کمرے میں دیکھی تھی۔ ماسکو کا وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوا۔ سکول جہاں اُس نے پڑھا۔ اُس کے ڈھیروں ڈھیر انداز۔

یہاں رُوس میں اُس نے نتالیا کو دیکھا۔

نتالیا گنچا رووا۔ نتالیا گنچا رووا کے نام نے مجھے بھی چونکایا تھا۔ میں ٹی وی چھوڑ کر یکسوئی سے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اسی قدر خوبصورت تھی جتنا ایک شاعر اپنی شاعری میں حُسن کے گڈے باندھ سکتا ہے۔ سولہ سال کی بالی عمر کی چنچل وشوخ وشنگ لڑکی جس کے حُسن اور اداؤں کی رُوس کی ایلیٹ کلاس میں دُھوم مچی ہوئی تھی۔

اب پشکن کی شادی کی تفصیلات ہوں۔ ساشا اُس کی عاشق صادق ہو اور مجھ جیسی سیاح عورت ہو جسے بہر حال ایک بڑے انسان کی زندگی کے اس پہلو سے انتہائی دلچسپی تھی۔ خود ہی

جان جائیے کہ سننے اور سنانے میں شوق و مستی کا کیا عالم ہوگا۔

یہ کس قدر دلچسپ بات ہے کہ اس کی محبت کا آغاز اگر نتالیا کے نام سے ہوا تو اختتام بھی نتالیا کے نام سے ہو رہا تھا۔

''نتالیا میرے دل میں ہی نہیں دماغ میں بھی گھس گئی ہے۔'' اُس نے اپنی ساس کو لکھا تھا۔

سسرال کو شادی کی ذرا جلدی نہیں تھی۔ ان کے مطالبات بھی بے شمار تھے اور تحفظات کی بھی لمبی لسٹ تھی۔ گو باپ نے بولدی نو کی جائیداد اس کے نام کر دی تھی۔ شاہی ملازمت بھی مل گئی تھی کہ شہرت بطور شاعر مسلّمہ ہو چکی تھی۔ کتابوں کی آمدنی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ پر زندگی میں میانہ روی اور اعتدال نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

شاعر کا دل بُری طرح اس پر آ گیا تھا۔ اُس کے لئے وہ کسی دیوی کا روپ دھار گئی تھی۔

''میڈونا'' میں وہ اُسی سے مخاطب ہے۔

''کاش میں نتالیا ہوتی۔ اور پشکن نے وہ نظم میرے لیئے لکھی ہوتی۔'' ساشا ہنستے ہوئے بولی تھی۔

میں بھی ہنس پڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔

''جو تمہیں پیار کرتا ہے اُسے پشکن جیسا ہی سمجھو۔''

''ذرا سنو۔''

اس کی تشنہ سی آرزو سامنے آتی ہے۔ ''کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ میں اپنا گھر بھی بناؤں گا اور پرانے شاہکاروں سے اسے سجاؤں گا۔''

''اونیگن'' میں اُس کی دلی خواہش کھل کر سامنے آتی ہے۔

''اب میرا مطمع نظر گھر والی ہے۔ میری سب سے بڑی تمنا پُرسکون زندگی اور گوبھی کے

سوپ کا پیالہ ہے۔''

ساشا کی آنکھوں میں اُترتی نمی مجھ سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔

''میڈونا'' میں اُس نے نتالیا کے حسن کو حُسن مریم سے تشبیہ دی اور پاکیزگی مسیح ابن مریم جیسی چاہی۔ نظم میں اُس کا یہ اظہار کہ اس کی تخلیق اس خوبصورت رنگ وروپ کے ساتھ خدا نے بنائی ہی اُس کے لئے ہے۔ خوبصورتی اور رعنائی کے اس مجسمے کو وہ اپنے گھر میں دیکھنے کا خواہشمند ہے کہ جس کے ریشے ریشے میں اُس کی مشقت گھلی ہوئی ہے۔

دل کھول کر اُس نے دلہن اور سسرال کی خواہشوں کو پورا کیا۔ شادی 1831ء میں جس شاہانہ انداز اور کرّوفر سے ہوئی اُس نے اُسے ساٹھ ہزار روبل کے قرضے کے نیچے دبا دیا تھا۔

''پر دیکھو''

ساشا رُک گئی تھی۔ میری آنکھیں تجسس کی لَو سے دہکتی اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ چند لمحے ایک پُر اسراری خاموشی میں لپٹے گذر گئے۔

شادی سے قبل وہ مضطرب سا تھا۔ بے چین سا عجیب سے جذبات واحساسات کی یلغار کی زد میں آیا ہوا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''کیا یہ انتہائے مسرت ہے۔'' اُس نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''ہاں نہیں شاید۔''

اُس نے باری باری تینوں جواب خود کو دیئے۔ پر پھر بھی کہیں اضطراب تھا۔

اور شادی سے اڑتالیس گھنٹے قبل وہ تانیہ کے پاس گیا جس کا خانہ بدوشوں سے تعلق تھا۔

''تانیہ کچھ گاؤ۔ کوئی ایسی چیز جو میرے لیئے خوش قسمتی کی تعبیر ہو۔ تم جانتی ہو میں شادی کر رہا ہوں۔''

تانیہ کی خوبصورت غزالی آنکھوں میں گذرے دنوں کے خوبصورت عکس جھلملائے۔ بغیر ایک لفظ بولے وہ اٹھی اُس نے گٹیار اٹھایا۔ قالین پر بیٹھی۔ تاروں سے نکل کر جو گیت فضا

میں بکھرا، اُس میں حُزن و ملال کا وہ رچاؤ تھا جس نے ساری فضا کو پل جھپکتے میں غمناک کر دیا۔ شاعر نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور کسی چھوٹے سے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تانیہ کی آنکھیں بند تھیں۔ لمبی گردن پورے وقار سے کھڑی تھی گیت کا حُزن اور شاعر کی سسکیاں پورے ماحول پر پھیلی ہوئی تھیں۔

''آہ'' بہت دیر بعد اُس نے سر اٹھایا اور کہا۔ اس گیت نے مجھے ختم کر دیا۔ یہ کسی بڑے صدمے کی پیشین گوئی ہے خوشی کی نہیں۔

میں عجیب سے سحر میں گرفتار اُسے سنتی تھی۔

اور جب تقریب عروسی میں ایک دن باقی تھا۔ اُس نے اپنے دوستوں سے کہا۔

''تو آؤ کہ میرے ساتھ مل کر میرے کنوار پنے کی زندگی کو دفن کرو۔''

اور اس کے گھرے درجن بھر دوست اکٹھے ہوئے اور چاہا کہ محفل موج و مستی ہو۔ پر حیرت زدہ ہوئے کہ وہ کیسی اذیت میں ہے۔

اپنی جوانی کو، اپنی آزادی کو، الوداع کہنے کیلئے اُس نے اپنی نظم میں سے چند اشعار پڑھے۔

''میں موت کب چاہتا ہوں مجھے تو زندگی کی آرزو ہے۔ میں غم سے آگاہ ہوں اور فکر و پریشانی سے بھی میرا تعلق ہے۔''

ایسے اشعار جیسے وہ جوانی کو رخصت نہیں کر رہا تھا بلکہ زندگی سے رخصت لے رہا تھا۔ جیسے وہ نئی زندگی کو نہیں بلکہ موت کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ جیسے آج کے بعد اس کی زندگی میں کل نہیں ہوگا۔

اور میز کے گرد بیٹھا اُس کے دوستوں کا ٹولہ دہشت زدہ سا اُسے دیکھتا تھا۔ اور پھر اُس نے روندھے گلے اور بھرائی آواز میں انہیں خدا حافظ کہا اور اپنی منگیتر سے ملنے چلا گیا۔

میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اُس کمرے میں نہیں تھی۔ اور یقیناً ساشا بھی نہیں ہو گی۔ زمان ومکان کے فاصلے سمٹ چکے تھے۔ اور وجود وقت کی اُس ٹنل میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں دو صدی قبل کا دورانیہ متحرک تھا۔

یہ اٹھارہ فروری 1831ء کا سرد برفیلی کٹیلی ہواؤں کے جھکڑوں میں جھولتا جھومتا دن تھا۔ پشکن کی شادی کا دن۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی ماسکو کے چرچ Ascension میں ہو رہی تھی۔ ماسکو کی ایلیٹ کلاس چرچ میں اس اتنی شاندار شادی اور اخراجات کے تخمینوں پر تبصروں اور حاشیہ آرائیوں میں مصروف تھی۔ زرق برق گاؤن پہنے اور منقش ٹوپیاں اوڑھے داڑھیوں والے پادری منتظر تھے۔

دلہن کی آمد، اس کا شاہانہ عروسی لباس، روشنیوں کا سیلاب اور گیتوں کی آوازیں سنہری کارپٹ پر چلتی دلہن کی تمکنت، حسن اور بانکپن اتنا بھرپور تھا کہ وہ مسکرایا۔ اپنی گردن کو اکڑایا سینے کو اوپر اٹھایا اور اپنی قامت کو لمبا کیا کہ دلہن اس سے لمبی تھی۔

سیٹوارڈ نے تقریباتی کراؤن اُن کے سروں پر رکھے اور پادری نے انہیں زندگی اکٹھے گذارنے کے دعائیہ جملے کہے۔

اور جب انگوٹھیاں پہنائی جا رہی تھیں۔ اچانک ایک آرائشی سنگار پٹی فرش پر گری۔ خود کو اس سے بچانے کیلئے وہ جھکا۔ رحل سے ٹکرایا۔ صلیبی مجسمہ اور گوسپل ایک بھدی آواز سے گرے اور پشکن کی کینڈل بجھ گئی تھی۔

شاعر کھڑا ہوا۔ چہرے پر پیلاہٹوں کی زردی کے ساتھ۔ ڈوبتی شکستہ آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

''All the bad omens''

نتالیا سے شادی پر وہ خوش تھا۔ گو شادی مسائل کے انبار لے کر آئی۔ غیر معمولی شخصیت غیر معمولی عزم وحوصلہ والا۔ جی داری سے کھڑا رہا جم کر کام کیا۔

''انچار'' بھی ایک شاہکار نظم ہے۔ سلطنتوں کی ریشہ دوانیاں بے رحمی۔ سرحدوں کی وسعتوں کیلئے انسانوں کا قتل۔

''انچار''، ''پریشانی'' اور ''پشیمانی''، تخلیق ہوئیں۔

اُس نے نثر، ڈرامہ، تنقیدی مضامین اور ادبی اخبار (لترا تورنایا گزیتا جو آج بھی شائع ہو رہا ہے) میں لکھا اور خوب لکھا۔ ''Poet'' جو زمانے کے چلن۔ لوگوں کے اطوار، حسد، جلن، جیسے رویوں پر مشتمل ہے جنہیں وہ بخوبی سمجھتا ہے اور خود سے کہتا ہے کہ تیرا مطمئین اور ثابت قدم ہونا ضروری ہے۔ ہجوم کی فکر نہ کر۔ واہ واہ کے نعروں پر نہ جا۔

اسی دوران اُس نے نکولائی گوگول کی کہانیاں کے مجموعے Evening On A Farm Near Dikanka پر بہت سے تنقیدی مضامین لکھے اور انہیں اپنے رسالے The Contemporary میں شائع کیا۔ مشہور زمانہ ڈرامہ Boris Godunov بہت پہلے کے لکھے ہوئے پر نظر ثانی کی اور چھاپا۔ ''The Stone Guest'' ڈرامہ بھی بہت مقبول ہوا۔

نتالیا کو دراصل یہ احساس ہی نہیں تھا کہ جس نے اُسے پسند کیا، اُسے چاہا اور اپنی شریک زندگی بنایا وہ کیا ہے۔ مہنگے ترین ملبوسات، منفرد جیولری، اپنے گرد عاشقوں کا ہجوم اور عیش و عشرت سے لبریز زندگی اُس کا منتہا تھا۔

1831ء میں شادی ہوئی اور 1835ء تک وہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ماریا الیگزینڈر، گریگوری اور نتالیا۔ آغاز کا کچھ وقت اُس نے پشکن کی جاگیر پر گذارا۔ کیپٹل پیٹرز برگ میں آنے کے بعد اُس نے باقاعدگی سے کورٹ سوسائٹی میں جانا شروع کر دیا۔ مداحوں اور عاشقوں کا ہجوم اس کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا جن میں زار نکولس اول سرفہرست تھا۔ اُسے نفرت تھی زار سے ''Cloud'' میں بادل کے استعارے میں اُس نے زار کو ہی مخاطب کیا تھا۔

یہ شب و روز چکی کے اُن دو پاٹوں کی طرح تھے جن میں وہ پس رہا تھا۔ زار نکولس کی

طرف سے ملنے والا کورٹ ٹائیٹل بہت توہین آمیز تھا جس نے اُسے غضبناک کیا۔ پر نتالیا کا رویہ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز تھا۔

ابھی اس پر ہی اکتفا نہ تھا کہ دارلحکومت کی فضاؤں میں نتالیا کے ایک نئے سکینڈل کی افوائیں اڑیں۔ یہ فرنچ نوجوان جارج ڈی انتھیس (George d' Anthes) حسن وجوانی اور وجاہت کا دلآویز نمونہ جسے ڈچ سفیر ہیکرن نے اپنے بیٹا بنایا ہوا تھا۔

''The Gypsis دی جپسیز'' کے کردار اگر حقیقی تھے تو الیکو کا کردار اُس کا تخلیق کردہ تھا۔ رُوسی شہری مرد۔ خانہ بدوش زیمفیرا کی ماں تاریکی میں جب اُس کے باپ کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی جاتی ہے تو شاعر کہانی کے ہیرو الیکو کی زبان سے زیمفرا کے باپ بوڑھے خانہ بدوش سے کہتا ہے کہ تم نے اُس درندے کا پیچھا کیوں نہ کیا۔ دونوں کو گولی کیوں نہ ماری۔ بوڑھے کا جواب اُس کے من کو نہیں لگا تھا جب اُس نے کہا۔

''محبت پر تو کوئی اختیار نہیں اور جوانی آزاد ہوتی ہے۔''

جب زیمفیرا بھی کسی اور کے ساتھ دل لگاتی ہے اور رات کی تاریکی میں اپنے عاشق سے ملنے جاتی ہے تو الیکو دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ محبت میں کیسی شراکت داری؟

تو وہ بھی الیکو ہی تھا۔ جوش غضب اور رقابت سے بھرا ہوا۔

''تو پھر آؤ۔ ڈوئل لڑتے ہیں۔'' اُس نے للکارا۔

یہ خوفناک اور شدید قسم کی ڈوئل تھی۔ بڑا اعلیٰ نشانہ باز تھا۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی شرطوں کا فیصلہ گولیوں سے کرنے کا عادی تھا اور ہمیشہ جیتا تھا۔

''تو پھر کیا ہوا؟ وہ زندگی سے کیسے ہار گیا؟''

میرا اپنا لہجہ گلوگیر سا تھا۔

''جو دل سے ہار جائیں۔ زندگی بھی انہیں ہرانے پر تل جاتی ہے۔''

اُس کا تو غیض وغضب اُسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ وگرنہ وہ تو ہارا ہوا تھا۔

شدید زخمی تھا۔ لوگ اٹھا کر اسی گھر میں لائے۔ اور پورا پیٹرز برگ اس گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ لوگ مشتعل تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر ماتم کی کیفیت میں تھے۔ غضبناک تھے۔ موت کی خبر کو دو دن تک چھپایا گیا۔ دو دن بعد بھی ہجوم اتنا بپھرا ہوا تھا کہ آدھی رات کو خاموشی سے میت گورسک مناسٹری میخائلوفسکائے کے نزدیک اس کی ماں کے پہلو میں دفن کے لئے لے جائی گئی۔

بہت دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے رہے تھے۔ نتالیا کے بارے میں میرے پوچھنے پر ساشا نے کسی قدر تلخی سے کہا تھا کوئی پانچ چھ سال تو زار نکولس اوّل کی باقاعدہ رکھیل رہی۔ پھر کہیں پیٹرو وچ لینسکوئے سے ملی۔ زار کی مکمل آشیر باد کے ساتھ اُس سے شادی کی۔ دو بیٹیوں کی ماں بنی۔ 1863ء میں فوت ہوئی۔

''ساشا نے وقت دیکھا جن لوگوں کی وہ منتظر تھی وہ آنے والے تھے۔ ہم دونوں اکٹھے کھڑے ہوئے۔ میں نے اُس کے سینے پر بوسہ دیا اور ملال گھلی آواز میں کہا۔ ساشا میرے پاس الفاظ نہیں جو تم جیسی پیاری لڑکی کا شکریہ ادا کریں۔ اگر کبھی کہیں پاکستان کا نام پڑھو تو اپنے آپ سے ضرور کہنا کہ اُس دیس میں تمہیں یاد رکھنے والی ایک عورت رہتی ہے۔ اور ہاں اگر کبھی آؤ تو میرے پاس آنا۔ تمہیں پردیس میں اپنے گھر کا احساس ملے گا۔

پھر میں اُس کمرے میں گئی جہاں اُسے زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ وہ بستر جہاں اُسے لٹایا گیا۔ وہ بندوق جس سے وہ زخمی ہوا۔ میز پر پڑی وہ گھڑی جو اُس کی آخری سانس کے ساتھ ساکت کر دی گئی تھی۔ چھوٹی سوئی دو (2) اور تین (3) کے درمیان اور بڑی نو (9) پر۔

وہ آگاہ تھا اپنے مقام سے۔ ایسے ہی تو اُس نے نہیں لکھا تھا کہ ایک دن رُوس کی سرزمین پر میرا نام ہوگا دنیا کی زبانوں پر میرا کلام ہوگا۔ اور زار شاہی کا منارہ میری عظمت کے سامنے سرنگوں ہوگا۔

باب

33

الوداع پیٹرز برگ • الوداع اے شہرِ بے مثال

میں تم سے وداع ہوتی ہوں ہاڑ کے مہینے میں

Досвидания Петер Бург, Досвидания Город Бесподобно. Прошаю С Вамы В Мецес Сезон Дождей

تو بس اب کوئی دم میں رُخصت ہوا چاہتی ہوں۔ اس شہرِ بے مثال سے کہ جہاں میرے قیام کا ایک ہفتہ یعنی آٹھ دن جو آٹھ لمحوں کی مانند دِکھتے اور محسوس ہوتے ہیں۔ بھاگم دوڑ کے یہ چند دن اُس بگولے کی طرح ہیں جو یکدم چکریاں کاٹتے کاٹتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

میں اُس وقت واستانیئے یا پلوشد (Vosstaniya Ploshehad) (بغاوت کا چوک) ریلوے سٹیشن کی عمارت کی بیرونی سیڑھیوں کے ایک کونے میں بیٹھی اپنے سامنے بکھری رونقوں کو دیکھتے ہوئے خود سے سوال کرتی ہوں۔

میں نے کیا کچھ دیکھا؟

طنزیہ سی ہنسی میرے ہونٹوں پر اُبھری تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو ایک خوبصورت انتہائی شوق و دلچسپی سے پڑھنے والی کتاب کے ورقوں کی پھولا پھرولی ہی کی ہے۔ میں تو اُس

چڑیا کی طرح سے ہوں جو بھرے کھلیان سے اپنی چونچ میں چند دانے ہی بھر سکی ہے۔

کاش میں یہاں اور رہ سکتی۔ کاش کوئی مجھے اپنے گھر کے کسی کونے کھدرے میں صرف شب بسری کی اجازت دے دیتا۔

تب شاید میں دلدلی زمین پر اس جنت جیسے جزیروں اور پلوں والے شہر جسے زاروں کا محبوب بچہ کہتے ہیں اور جو رُوس کے سب شہروں سے مختلف اور جداگانہ رنگ کا حامل ہے اور زیادہ تفصیل سے دیکھ پاتی۔ میں نے جب اُس خوبصورت چیزک پیزک (Chizzik Pizzik) (چھوٹی چڑیا) کے شیلف میں نئے نکور سکّے رکھے اور اُس روایت کے جی جان سے سچ ہونے کی دُعا مانگی جو چیزک پیزک سے منسوب ہے کہ سکّے رکھنے والا پیٹرز برگ دوبارہ ضرور آتا ہے۔

پر جیسے میرا اندر میرے مستقبل کی ایسی ہر خوش قسمتی پر انکاری ہوا۔

کیسا خوبصورت، انوکھا اور تضادات سے پُر شہر ہے۔ تاریخ کے بہت سے ادوار کو اپنے سینے پر اُٹھائے ہوئے۔ اگر مطلق العنانیت کا گڑھ رہا تو وہیں ہر شخصی آزادی کی تحریک نے بھی یہیں جنم لیا۔ ظلم، جبر اور خونی تاریخ لکھی گئی تو فکری، ادبی اور ثقافتی کلچر کی بارآوری بھی اسی سرزمین سے ہوئی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے اگر یہاں فروغ پایا تو سوشلسٹ تحریکوں نے بھی یہیں جنم لیا۔ زاروں، بالشکوں اور منشکوں (رُوسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے دو دھڑے) کی یہ سرزمین کتنے اسرار لئے ہوئے ہے۔

کیسا جیالا دلبر اور سجیلا شہر ہے۔ تاریکی سے بھرا ہوا۔ روشنی سے پھولا ہوا۔ تحیّر اور ڈراموں سے رچا ہوا۔ بیک وقت محبتوں اور نفرتوں میں سمٹا ہوا۔ مختلف النوع قوموں اور تہذیبوں کو اپنے اندر مدغم اور اپنے اور اُن کے رنگ میں رنگا ہوا، مہیب سیلابوں اور جنگوں کا مارا، آگ اور خون کے دریاؤں اور سمندروں میں غوطے مارتا۔ ایک سے نکلتا تو دوسرے میں جا گرتا۔ پر ہر بار نئی شان سے اُٹھتا ہوا۔ یورپ کی وسعتوں میں اپنی کھڑکی سے جھانکتا ہوا۔

صنعتی ترقی کا شہر۔ تہذیبی ورثے سے لدا پھندا شہر۔ کتاب تحقیق اور علم کا شہر۔ عجائب

گھروں اور محلوں کا شہر۔

ایسے ہی تو نہیں کہا گیا۔

Forget Lbiza and Rome , Petersburg beats them all.

میں نے گہما گہمی سے لبالب بھرے ماحول کو گہری نظروں میں تولتے ہوئے سوچا۔

تو جانے سے قبل اُس عظیم بوڑھے موسیقار کے ساتھ چند لمحے نہ گزار لوں جو اِس وقت مجھے بے طرح یاد آیا ہے۔

موسم گرما رُخصت ہو گیا تھا اور خزاں شہر پر بکھری ہوئی تھی جب وہ پھر پیٹروگراڈ میں داخل ہوا۔ (جنگ میں پیٹرز برگ کو پیٹروگراڈ کا نام دیا گیا تھا)۔ شہر جنگ کی تباہ کاریوں سے نڈھال اور انقلاب کی خونخواریوں سے خستہ حال ضرور تھا پر اُس کے چہرے پر بکھری ہوئی استقامت اور شان کا پرتو بھی اپنی جگہ قائم تھا۔

اور قدیم شہر کے گلی کوچوں میں اپنے اُسی چھوٹے اور سادہ سے گھر میں جو تھیٹر کی عمارت کے ساتھ تھا۔ وہ داخل ہوا۔ اپنے سادہ سے کمرے جس میں اُس کا شاندار بڑا سا پیانو، اُس کی کرسی، اُس کی ڈائری، قلم، پنسلیں سب ویسے ہی موجود تھیں جیسی وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔

اُس نے کھڑکی کھولی۔ گھر کے سامنے درختوں کو دیکھا۔ گلی کے لیمپ پوسٹ دیکھے، سڑک اور دوکانوں پر نظریں دوڑائیں اور اُسے محسوس ہوا کہ جیسے فضا میں ایک گونج ہے۔ ایک پکار ہے۔ سوویت کی طرف سے لوگوں کے لئے ایک اعلان ہے۔ دفاع کا۔ حفاظت کا۔ مادر وطن پیٹروگراڈ کا۔

وہ واپس پلٹا۔ کرسی پر بیٹھا۔ اُس کے گہرے دوست ملک کے بہت بڑے شاعر مایاکوفسکی نے وطن کے لئے شعلہ فشاں شاعری کی تھی۔ اُس نے پیانو پر اُنگلیاں رکھیں اور دل کو چیر دینے والی دُھنیں فضا میں بکھیر دیں اور پیٹروگراڈ کی فضاؤں میں اِس حیرت انگیز موسیقی نے گویا ملکی وقار اور شان کو نیا رنگ، نیا مفہوم اور نئی تازگی دی۔

جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ رُوس کا انقلاب کامیابی سے ہم کنار ہو چکا تھا پر اتحادی فوجیں ہر ہر حربے سے اِسے ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔

سفید رُوسی فوجوں کے جرنیل یوڈنیچ کو برطانیہ، استھونیا اور فن لینڈ کی پشت پناہی حاصل تھی اور وہ پیٹروگراڈ کا محاصرہ کر چکا تھا۔

ایسے میں سُرخ فوج کے سپاہیوں نے اُسے کہا۔

''پروفیسر لینن کا حکم ہے کہ آپ کو کسی محفوظ جگہ پر منتقل کر دیا جائے۔ دشمن نے شہر کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

''سنو اگر میں چلا گیا تو شہر کی حفاظتی دیوار گر جائے گی۔''

وہ پیانو کے سامنے بیٹھا اور فضا میں انقلاب اکتوبر کا گیت پوری توانائیوں سے گونجا۔

''دیکھو۔ اُن بھوکے ننگے چیتھڑے لٹکاتے جسموں والے لوگوں کو جن کے پاؤں میں پھٹے ہوئے جوتے ہیں۔ عورتوں کو دیکھو۔ اُن کی آنکھوں میں چمکتی لو ہے۔ اُن کے ہاتھوں میں بیلچے اور کدالیں ہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر ایک آواز ہے۔

ہم پیٹروگراڈ کا دفاع کریں گے اور لیون ٹراٹسکی کی قیادت میں اس کے ایک ایک انچ کی حفاظت کریں گے۔''

اور پیٹروگراڈ کی فضاؤں میں اکتوبر انقلاب کے گیت گونجے اور شہر استقامت سے کھڑا رہا۔ ڈٹا رہا۔

اور پھر بہت سارے سال گزر گئے۔ بہاریں بہت بار آئیں۔ درخت مسکرائے اور پھولوں نے قہقہے لگائے۔ بہت سی خزائیں گذریں۔ دھندوں نے راستے گہنائے اور مکانوں نے سفید کپڑے پہنے۔ اور وہ اپنے اُس چھوٹے سے گھر میں اپنے پیانو سے کھیلتے ہوئے فضاؤں میں خوبصورت دُھنیں بکھیرتا رہا۔

اور وقت گذرتا رہا۔

اور خزاں ایک بار پھر اُس کے سامنے تھی اور یہ سال 1941ء کا تھا۔ اُس وقت جب پہلی بارش کی بوندوں نے ٹپ ٹپ گرتے ہوئے تھیٹر کی چھت کو ڈرم کی گت کی طرح بجایا اور جب پہلی دُھند نے اُس کے گھر کی کھڑکیوں کے چہرے دُھندلائے۔ پیٹروگراڈ جواب لینن گراڈ تھا پر بموں کی بارش ہوئی۔

سرخ سپاہیوں نے اُس کے پاس آ کر کہا۔

''پروفیسر۔ آپ کو ایک محفوظ جگہ پر چلے جانا چاہیے۔ دشمن نے ہمارے شہر کو گھیرے میں لے لیا ہے۔''

اور اُس نے اپنا سفید بالوں والا سر اُٹھایا اور کہا۔

''اگر میں چلا گیا تو شہر کی دیوار گر جائے گی۔''

وہ اپنے پیانو کے سامنے بیٹھا اور فضا میں مادر وطن کے دفاع میں گیت بکھر گئے۔ اور لینن گراڈ ہنسا۔

اور ایک دن جب وہ اپنے کمرے میں تھا۔ اپنے پیانو کے پاس۔ جب اچانک اُس کے ہاتھ پیلی کی بورڈ سے پھسلے۔ ہولناک آوازوں اور دھماکہ خیز مواد نے ہر چیز کو تہہ و بالا کر دیا۔ تھیٹر کی آدھی عمارت زمین بوس ہو گئی تھی۔ اینٹ روڑوں کے ملبے پر خوبصورت فاختائیں پڑی تھیں اور سارے میں گرد و غبار اور ٹوٹ پھوٹ کا طوفان تھا۔

سُرخ سپاہی پھر اُس کے سامنے تھے۔

''تمہیں لینن گراڈ چھوڑنا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔''

اُس کے جواب میں وہی پختگی تھی۔ وہی اصرار تھا۔ اُس نے پھر کہا تھا۔

''میں اگر چلا گیا تو فصیل شہر گر جائے گی۔''

''ہم تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتے ہیں تمہیں کسی دوسرے شہر کسی محفوظ جگہ جانا ہوگا۔ کیا تم

نہیں دیکھتے؟ تمہارے چاروں طرف کتنی تباہی مچی ہے؟''

انہوں نے زبردستی کرتے ہوئے اُس کا پیانو گاڑی میں رکھا۔ اور بوڑھا موسیقار برف پر دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا اپنی بغلوں میں پرانی اور نئی دھنوں کا پلندہ اُٹھائے گاڑی میں بیٹھا۔ دفعتاً اُس کی بوڑھی اُنگلیاں ٹوٹے ہوئے پیانو پر پڑیں اور جیسے طوفان آ گیا۔ فضا میں مادرِ وطن کے گیت تھے۔ انسانیت کی آزادی کی دُھنیں تھیں۔ ایک کے بعد ایک موسیقار کے ہاتھوں سے موسیقی کے شاہکار بن کر فضا میں بکھر رہے تھے۔

میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میری دُھنیں میری فصیلِ شہر کو گرنے نہیں دیں گی۔ لیننِ گراڈ کو سربلند رکھیں گی۔

لیننِ گراڈ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

اور میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''جس شہر کے ایسے جیالے ہوں۔ اُسے نو سو دن کیا نو ہزار دنوں میں بھی کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا۔''

میں تم سے وداع ہوتی ہوں ہاڑ کے مہینے میں۔

باب

34

ماسکو واپسی • ٹکٹ چیکروں کا اوندھا پن • لیزا ویسلے سے ملاقات

Возврашение В Москву
Строгность Приверение Поездной Билетов.
Вистреча С Лизавслои

بخدا یقین جانیئے ۔ اب وہ پانچ چھ رُوسی ٹکٹ چیکر جو ماسکو جانے والی لمبی ٹرین کے مختلف کمپارٹمنٹوں کے سامنے کھڑے مسافروں کو ڈیل کرر ہے تھے نرے گھا مڑ اور احمق تھے تو اس میں نہ میرے تعصب کو دخل ہے اور نہ ہی کسی بغض کو۔ وہ بلاشبہ ایسے ہی تھے اور ایک دو نہیں سب کے سب ۔

ان کی تو جیسے مت ماری ہوئی تھی یا سُوجھ بُوجھ ہی ناقص تھی ۔ یا وہ نئے نئے بھرتی ہوئے تھے ۔ کسی ایسے چُلبلے نٹ کھٹ شیطان بچے کی طرح جس کے ہاتھ میں پہلی بار آ جانے والی گیند جسے وہ فرش پر ٹپا ٹپا کر اُس کی کھلوی اُدھیڑ دینے کے در پے ہوتا ہے ۔ وہ بھی ہمیں شیطان کی آنت کی طرح لمبے پلیٹ فارم پر بھگا بھگا کر مار دینے کے متمنی نظر آتے تھے ۔

ایک ہم جیسی بابڑی (لالچی) عورتیں جاتے جاتے بھی کچھ نہ کچھ سمیٹنے کی گھمن گھیری میں ۔ اُے چلو ذرا فلاں جگہ تو دیکھی نہیں ۔ اُس کا دیدار کر آئیں ۔ مڑ کس نے پھیرا ڈالنا ہے ۔ یا قسمت یا نصیب ۔

صبح سے Vasilevsky آئی لینڈ میں تھیں۔ Kunstkamera انتھیر وپولو جی میوزیم تو گویا ایک طرح دنیا کی قوموں کی ابتداء سے انتہا تک کا کچا چٹھا تھا۔ بچوں کے دلچسپ کھیل کے اسباق تھے۔ میں گھومی ضرور پر بے دلی سے۔ میری جان پیٹرز برگ یونیورسٹی میں پھنسی ہوئی تھی جو ساتھ ہی تھی۔

چار گھنٹے ہم نے یونیورسٹی میں گذارے۔ اُس کے سرسبز لان میں بیٹھ کر نیوا کے ساحلوں پر اس کی عظیم الشان عمارت کو دیکھتے اور اپنے زمانہ طالب علمی کو یاد کرتے۔

''ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا'' گنگناتے۔ اور یہ کام ایسا مست کر دینے والا تھا کہ وقتی طور پر تھوڑا سا واپسی کا بھول بھی گئی تھیں۔ پھر ٹیکسی ہی لی اور میٹرو کا خیال چھوڑا کہ کہیں دیر ہی نہ ہو جائے ہوٹل سے سامان اُٹھایا اور اسٹیشن آئے۔ پانچ سو روبل دیتے ہوئے جی تو دُکھا۔ کہ میٹرو تو اسٹیشن کے عین سامنے دو قدم پر ہے۔

جو کام پچاس ساٹھ روبل میں ہوسکتا تھا اُسے پانچ سو میں کیا۔ اب کھانے کی بھی طلب تھی۔

ریسٹورنٹ بڑا اعلیٰ تھا۔ پر چاول جو سامنے آیا وہ تھا تو سفید پر موٹا تھا۔ چلو سلاد نے ساری کمی پوری کردی۔ بڑا مزے کا تھا۔ ریسٹورنٹ کی چھت بڑی منفرد قسم کی تھی۔ خموں والی۔ پورا سینٹ پیٹرز برگ اس پر پینٹ تھا۔

صدقے جاؤں رُوسی مصوروں کے۔ خزاں کا منظر تھا۔ نیوا کے کنارے پر بلند نگر۔ کناروں کے پتھر درخت. سڑکیں. اُن پر چلتے پھرتے لوگ۔ خزاں کی کیفیات کے سب عکس۔ کیا فنکاری تھی کہ نظر ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔

گاڑی ابھی پلیٹ فارم پر رکی بھی نہ تھی جب ہم اُس کے سر پر جا چڑھیں۔

اور اب چیکروں کے بتھے چڑھ کر فٹ بال کی طرح لڑھکتی پھرتی تھیں۔ چھٹے چکر نے مجھے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق غُل غپاڑہ مچانے پر مجبور کر دیا تھا۔

میری بکواس انہیں قطعی سمجھ نہیں آئی۔ پر شور شرابا کا فائدہ ضرور ہوا کہ وہ سنجیدہ ہوئے اور کمبخت کتنے ظالم نکلے کہ جہاں میں کھڑی شور مچاتی تھی وہی ہمارا ڈبہ تھا۔

سیٹوں پر پہنچ کر پھرتی سے گدّے بچھانے اور تکیوں کے غلاف چڑھانے میں جت گئیں کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ لیٹیں اور سو جائیں۔

اور میں تو لیٹ بھی گئی۔ پر ایک رُوسی دیونی نک چڑھی سی جس کا ایک ایک انداز ''آدم بو آدم بو'' کے غصیلے نعرے لگا تا تھا، وارد ہوئی۔ اُس کی ایک ہی نظر ایسی ظالم نمک بھری تھی کہ جس نے مجھ جیسی برساتی گوڈوے کو پل جھپکتے میں سسری کی نیند سلا دیا۔

جس برتھ پر میں لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کا نمبر 48 تھا۔ اور وہ نمبر خاتون کے پاس تھا۔ مجھ اوندھی کو تو اتنی عقل ہی نہ آئی کہ اپنا نمبر بھی چیک کر لیتی۔

چپ چاپ میں اُٹھی۔ بستر کو اوپر والی برتھ پر پٹخا۔

''اب چڑھوں گی کیسے؟'' اندیشے سرسرائے۔

''ہائے جوانی'' دل نے کہا۔

''بیس سال قبل آتی تو پٹوسی مار کر اوپر چلی جاتی۔

اُس ہتھنی نے سیٹ پر بیٹھ کر کوٹ اُتارا۔ اُسے کھونٹی سے لٹکایا۔ عینک نکالی۔ آنکھوں پر چڑھائی اور تھیلے میں سے اخبار نکال کر مطالعے میں جت گئی۔

اب میں اور مہر النساء اس سوچ میں کہ بالائی منزل پر جانے کا آسان ترین راستہ کون سا ہو کہ گوڈے گٹے اور ہڈی پسلیاں محفوظ رہیں۔

اس کوہ پیمائی کے آسان اور سہل امکانات ابھی زیرِ غور تھے کہ ایک اور حملہ ہوا۔ لمبا چوڑا مردِ عین میرے سامنے کی دوسری برتھ پر اپنا چھوٹا سا بیگ پھینکتا بندر جیسی قلابازیاں مارتا سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

اب کچھ کہنے سننے کی ضرورت تھی۔ میں اور مہر النساء ٹک ٹک کبھی عورت کو دیکھتے جو

بدتمیز ہمسائیوں کے حقوق سے ہی آگاہ نہ تھی اور جس نے اُن پر محبت بھری نگاہ تو چھوڑ یئے نفرت بھری بھی ڈالنی پسند نہ کی تھی۔ کہ چلو بندہ از راہ تفنن ہی دیکھ لیتا کہ جس غریب کی گھر بدری ہوئی ہے ذرا دیکھوں تو سہی بیچاری کن حالوں میں ہے؟

ہم برصغیر کے لوگ تو بڑے اچھے ہیں۔ آنکھیں چار نہیں ہوتیں کہ باتوں کا پٹارہ کھل جاتا ہے اور بس ایک آدھ گھنٹہ میں ہی پوتڑوں تک واقفیت حاصل کر کے ٹیلی فونوں کے نمبر اور آئندہ ملاقاتوں کے راستے ہموار کر لیتے ہیں۔

گاڑی کو چلتے ہوئے جب پون گھنٹہ گذر گیا میں واش روم کے لئے اُٹھی کہ ضروریات سے تو فارغ ہو جاؤں پھر مہم جوئی کا بھی سوچوں گی۔

ٹائلٹ بند تھا۔ ان اوپن کوپوں کے سامنے سنگل سیٹ والی ایک لمبی قطار تھی۔ میں ایک خالی نشست پر بیٹھ گئی۔

اور تبھی میں نے اُسے دیکھا تھا۔

وہ کیسا چہرہ تھا؟ اپنائیت اور نرمی کی پھوار میں بھیگا ہوا۔ رُوسی تو قطعی نہیں لگتا تھا۔ گیہواں رنگ پر قدرے موٹے نقش جو اُس کا تعلق برصغیر سے ظاہر کرتے تھے۔

آنکھیں چار ہوئیں تو جیسے سارا چہرہ مانوسیت کی روشنی سے بھر سا گیا۔ بات کی تو پتہ چلا کہ رُوسی ہے۔ میں نے دل میں کہا۔

''تو یہ بھی اُن چند معدودے دانوں میں سے ایک ہے جو خال خال کہیں نظر آتا ہے۔''

یہ لیزا اویلے تھی۔ اگر چہ رُوسی تھی پر لندن میں پیدا ہوئی۔ وہیں بڑھی پلی۔ وہیں شادی کی۔ نوکری بھی وہیں کرتی ہے۔ پر آباؤ اجداد کے رُوس آنا نہیں بھولتی۔ کوئی دو تین سال بعد چکر لگانا ضروری سمجھتی ہے۔

لیزا محبت میں گندھی کوئی پینتیس کے دائرے میں گھومتی عورت تھی جس نے مجھے اپنی برتھ پر بٹھاتے ہی اپنی ہتھیلی پر ٹافیاں رکھ کر پیش کیں۔ محبت کے اس انداز نے مجھے برسوں پہلے کا

ایک واقعہ یاد دلا دیا تھا۔ یہ میری نئی نئی شادی کے دن تھے۔ میں اپنی ماں کے گھر آئی تھی۔ میرے شوہر مجھے چھوڑ کر جانے لگے تو میں اُنہیں رُخصت کرنے ڈیوڑھی تک آئی۔ جانے سے قبل انہوں نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو تین ٹافیاں ہتھیلی پر سجا کر مجھے پیش کیں۔ اپنے پکّے پیٹھے پن کے باوجود مجھے اُس کا یہ محبت بھرا معصوم سا انداز اچھا لگا۔

اور مجھے لیزا بھی ایسی ہی لگی تھی۔ میں نے ٹافی اُٹھائی۔ اُس کا ریپر اُتارا اور منہ میں ڈال لی۔

میرا تعارف کیا تھا۔ چار لفظوں کا۔ ایک منٹ میں مکمل۔ پر لیزا ویسلے اپنے پُرکھوں کے حوالے سے ایک تاریخی کردار تھی۔

دفعتاً لیزا نے پوچھا تھا کہ میں اولڈر باط گئی ہوں۔

میں نے اُسے بتایا کہ ماسکو میں میرا قیام زیادہ نہیں رہا۔ اب یہاں ٹھہروں گی اور سبھی قابل ذکر جگہیں دیکھوں گی۔

اولڈر باط کی لین نمبرے میں اُس کے پردادا کا بہت خوبصورت محل نما گھر تھا۔ اُس کا پردادا ماسکو کا بڑا جاگیردار تھا تو وہیں زار کی ریاستی ڈوما کا اہم ترین اور وفادار ترین وزیر بھی پر راسپوٹین نے......

راسپوٹین کے نام پر میں چونکی تھی۔ میرے منہ میں گھومتی پھرتی ٹافی میرے کلّے کی دیوار کے ساتھ لگ گئی تھی۔ میری آنکھیں اشتیاق اور تجسّس سے پوری طرح اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

راسپوٹین نے زار نکولس کو بُری طرح بدظن کر رکھا تھا اور زار بھی کیسا کم ظرف اور احمق انسان تھا کہ جسے اپنے خیر خواہوں، ہمدردوں، محبت کرنے والوں، غداروں اور بے وفاؤں میں تمیز ہی نہ تھی۔

پھر یوں ہوا۔ لیزا رُک گئی اور اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کو معلوم ہے کیف کہاں ہے؟

زمانہ قدیم میں رُوس کا اور اب یوکرائن کا کیپٹل سٹی ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں۔''

میں نے لیزا کو دیکھا تھا۔

باوجودیکہ میرا پردادا سٹولی پن بڑا دلیر اور صاحب اختیار آدمی تھا۔ اپنی حفاظت سے کبھی غافل نہیں رہتا تھا۔ کیف میں سٹیج ڈرامہ ہو رہا تھا۔ زار مہمان خصوصی تھا۔ میرے پردادا بھی مدعو تھے۔

عام حالات میں وہ ہمیشہ بُلٹ پروف جیکٹ پہنے رکھتے۔ اُن کے ساتھ محافظوں کا ٹولہ بھی ہوتا۔ جانے کیا ہوا؟ جانے سے قبل انہوں نے بلٹ پروف جیکٹ بھی نہیں پہنی اور محافظوں کو بھی ساتھ نہیں لیا۔ میرے دادا نے اصرار کیا۔ میری دادی اور پردادی دونوں نے کہا۔

پر انہوں نے کسی کی نہیں سنی اور چلے گئے۔

وہ رمسکی کورساکوف کے ڈرامے سے بہت محظوظ ہوئے تھے اور انٹرول میں اپنے ہم مرتبہ لوگوں سے مل کر خوش گپیوں میں مگن تھے۔ زار اُن سے اگلی نشست پر تھا۔

تبھی ایک نوجوان شام کے تقریباتی لباس میں ملبوس ٹہلتا ہوا اُن کے پاس آیا، رُکا اور ایک دم اُس نے دو فائر کئے۔ میرے پردادا فوراً زار کو بچانے کے لئے اُس پر جھک گئے۔ انہوں نے زار کے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اُس کی درازی عمر کی دعا مانگی۔

جب انہیں ماسکو لایا جا رہا تھا انہوں نے کہا تھا۔

''میں بچوں گا نہیں۔ لیکن مجھے اپنے مرنے پر ذرا بھی دُکھ نہیں۔ میرے لئے خوشی کی بات یہی ہے کہ میرا زار زندہ ہے۔''

لیزا بہت خوبصورت انگریزی بولتی تھی۔ دھیرے سے بولی تھی۔

سچ تو یہ تھا کہ میرے پردادا کے خاندان کے ساتھ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم والا معاملہ ہوا تھا۔

زار نے کیا عزت افزائی کرنی تھی۔ خاندان انقلابیوں کی ہٹ لسٹ پر آ گیا تھا۔ تو جب انقلاب آیا۔ میرے دادا لندن آ گئے تھے۔ اور ارباط والا ہمارا وہ خوبصورت گھر جسے میرے پردادا نے بہت شوق سے بنوایا تھا۔ اور جو فنِ تعمیر کے حوالے سے ماسکو کے چند بہترین گھروں میں شمار ہوتا تھا میرے پردادا کی ٹیکسٹائل مل کے مزدوروں کو الاٹ ہو گیا تھا۔

کہیں ستر کی دہائی میں جا کر میرے والد نے مقدمہ لڑا اور واگزار کرایا۔ آج کل وہ ایک کنڈر گاٹن انسٹی ٹیوٹ کو کرایہ پر دیا ہوا ہے۔

لیزا کمال کی عورت تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی اس نشست میں ایک لمحے کے لئے بھی مجھے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اُس نے ماسکو میں اپنا ایڈریس میری کاپی پر لکھا۔ ٹیلی فون نمبر لکھے۔ اور جب میں واش روم جانے کے لئے اُٹھتی تھی۔ میں نے اُس سے درخواست کی تھی کہ وہ اوپر برتھ پر چڑھنے میں میری مدد کرے۔

واش روم سے باہر آ کر تھوڑی دیر کے لئے میں نے بند شیشوں میں سے باہر دیکھا۔ مجھے کچھ یوں لگا۔ جیسے میں گھنے جنگلوں کی کسی نیم روشن غار میں سے گذر رہی ہوں۔ کہیں دُور ان جنگلوں میں کوئی کوئی جگنو ٹمٹماتا ہے۔ کہیں جگنوؤں کے گُچھے سے محسوس ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ گھروں میں جگمگاتی برقی روشنیاں تھیں۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ مجھے لیزا کا خیال تھا۔

مہرالنساء سو چکی تھی۔ ٹیبل پر میرے پاؤں رکھوا کر اُس نے مجھے اوپر دھکیلا اور یوں میں نے آسانی سے اس پُل صراط جیسی منزل کو سر کر لیا۔

میں نہیں جانتی تھی میں کن مرغزاروں میں تھی۔ یا دریاؤں کی کھاڑیوں میں یا محلوں میں یا محلوں کے کمروں میں کسی آوارہ روح کی طرح بھٹکتی تھی۔

کوئی دھیرے دھیرے میرے بازو کو ہلاتا تھا۔ مجھے آواز دیتا تھا۔

میں نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولا تھا۔ میں حیران رہ گئی تھی۔ لیزا کھڑی مجھے

کہتی تھی۔

''واش روم سے ہو آیئے، ماسکو آنے میں صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا ہے۔ پھر یہ بند ہو جائے گا۔''

مجھے لیزا پر کس قدر پیار آیا تھا۔ مجھے اپنی گڑی یاد آئی تھی۔ میری بیٹی جو اپنی ماں کا ایسے ہی خیال رکھتی ہے۔

باب
35

جارجیائی ''زنسکایا'' کوتلاسی ''دوشا'' • یاسنایاپولیانا کی ''ورونیکا''
پُشکن میوزیم • مسٹرومسزونودسہنا

Джорджиой Жена Котласи Душа   Ясна , Поняль
Музеилей Пушкина. Господин И Господа
Винод Сухана.

مہرالنساء چیں بچیں تھی۔

''تو اب جب تم عجائب گھروں کے اُن سلسلوں کو دیکھ آئی ہو جو دُنیا میں نمبر ایک کی صف میں آتے ہیں تو یہاں ماسکو میں اس پُشکن آرٹ میوزیم کو دیکھنے کی ابھی کوئی کسر باقی ہے؟ میں تو حیرت زدہ ہوں۔ تمہارے شوق و اضطراب کا تو کچھ ویسا ہی عالم ہے جیسا کسی گاؤں میں دوسرے پنڈ کی دُلہن کے آنے پر گاؤں کی الہڑ مٹیاروں کا ہوتا ہے کہ جو اُسے دیکھنے کے لئے مری جاتی ہیں۔ بھئی یہ بھی تو اپنے اُن بھائی بہنوں جیسا ہی ہوگا اور کیا ہیرے ٹنگے ہوں گے اُس میں؟''

اب اُس کے اتنے لتاڑ دینے والے لیکچر پر میں نے جوابی حملے تو کیے، پر اُن میں وہ کرارا پن ہرگز نہیں تھا۔

اُس وقت ہم سات منزلہ Voskhod ہوٹل کی عظیم الشان عمارت سے اک ذرا ہٹ کر سڑک کے پار ایک چھوٹی سی خوبصورت مارکیٹ کے ایک خوبصورت ریسٹورنٹ میں ناشتے کے لئے بیٹھی ایک دوسرے سے اُلجھ سی رہی تھیں۔

پینا کولاڈا جیسے مشروب کا ایک گلاس خاتون ویٹرس نے ہمیں کمپلیمنٹری طور پر پیش کیا ہے۔ ریسٹورنٹ میں تین لڑکیاں تھیں۔ ایک کوئی پینتیس (35) چالیس (40) کے دائرے میں ہوگی۔ یہ زنسکایا تھی۔ جتنی خوبصورت تھی اُتنی ہی خوش مزاج بھی۔ ہنستی تو سارا چہرہ روشن ہوتا تھا۔ ہم نے تو سچی بات ہے حد درجہ حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ جارجئین ہے۔

اور اگلے چند دنوں میں مسلسل اس ریسٹورنٹ میں آنے سے یہ بات بھی کھلی کہ وہ بڑے دھڑلے سے اپنا مقابلہ ریسٹورنٹ کی باقی ملازم لڑکیوں سے کرتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر لہجے میں فخر کا امتیاز گھولتے ہوئے کہتی ہے۔

''یہ تو رُوسی ہیں اور میں ہوں جارجئین۔ سٹالن جارجئین تھا۔ وہ اترائی۔''

سچی بات ہے اُس کی یہ اتراہٹ تو بڑی زہر لگی۔

''کمبخت کچھ نیکوں سے تو ناطہ جوڑ۔ گھمنڈی پنے کا مظاہرہ بھی کر رہی ہے تو کس سے؟ ہلاکو خان کا بھی پیو۔ ظلم و جبر کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے ظالم نے۔''

پر کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اور اگر کہا بھی تو بس اتنا ہی۔

''تو یہ من و تو کا فرق ہر جگہ ہی ہے۔ انسانی سرشت جو ہوئی۔''

دوسری داشا (Dasha) تھی۔ خوبصورت اور جوان۔ ان دو بڑی خوبیوں کے ساتھ ساتھ عقل و شعور اور دُنیا کس ڈگر پر جا رہی ہے کی شُد بُد بھی رکھتی تھی۔ تیسری ورونیکا تھی۔ ورونیکا بڑے وحشی حُسن کی مالک تھی۔

اور گھونٹ گھونٹ مشروب پیتے ہوئے جب ہم دن بھر کے پروگرام پر بات کرتے تھے۔

پشکن میوزیم جانے کی میری خواہش پر مہر النساء اور میرے درمیان قدرے کھٹی سی یہ مکالمہ بازی ہوئی تھی۔ اور میں نے ایک بار پھر اپنے بیان میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی وہ تو زاروں نے بنائے تھے اور یہ یونیورسٹی کے اُستاد، طالب علموں، تاجروں اور ماسکو کے لوگوں نے کہ وہ چاہتے تھے کہ یہاں بھی تو نمبر دو جیسی شاندار چیز ہو۔ کوئی اگر پیٹرز برگ نہ جا سکے تو کم از کم اس کا پرتو اُسے یہاں نظر آ جائے۔''

اُس کے چہرے پر بکھری کوفت سی محسوس کرتے ہوئے میں نے صلح جو انداز میں کہا۔

''چلو بتاؤ کہاں چلیں؟''

''بھئی مینز سکوائیر کی انڈر گراؤنڈ مارکیٹ دیکھتے ہیں۔''

اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔

''اس کا شاپنگ کریز کبھی اس کے اندر سے نہیں نکلے گا۔ اور یہ اندر بھی کیسا ڈھیٹ اور منہ پھٹ تھا۔ پل نہیں لگاتا اور سب کچھ بوتھی پر سجا دیتا ہے۔''

چہرہ پڑھنے میں وہ بھی طاق۔ فوراً ہی بول اُٹھی۔

''تو پھر کسی اسٹیمر یا موٹر بوٹ میں دریائے والگا کی سیر کریں۔'' انتونینا نے کیسی منظر کشی کی تھی۔ برجوں کے نیچے سے سٹیمروں اور لانچوں کا گذرنا، کناروں کے درختوں کی ہریالی اور تازگی، پھولوں کی چادروں کا بچھا ہونا، اڑانیں بھرتے سمندری بگلوں، جنگل اور ریسٹ ہاؤسز، بڑے دل موہ لینے والے منظر ملتے ہیں۔''

اب اپنی حماقتوں اور جلد بازیوں کا کیا رنڈی رونا روتی کہ آتے ہی تو پیٹرز برگ کے لئے ٹکٹوں کا کہہ دیا۔ انتونینا کے کہنے پر افسوس ہوا تھا کہ ایک طرف کا سفر کروز سے ہوتا والگا کے مزے لوٹتے۔

''اور ہاں ابھی وہ کریملن بھی تو ہے جسے میں نے ماسکو کے آخری تحفے کے طور پر سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور وہ اِسے قطعی یاد نہیں۔''

زنسکایا نے چوکور پراٹھے ہمارے سامنے رکھے۔ ہم کس قدر ندیدے پن سے اُن کی طرف لپکے تھے۔ مجھے فوراً اپنی اس حرکت پر خفت سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے قصداً اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں کہ مبادا ندیدے پن کے عکس کی کوئی لہر کسی کو نظر نہ آ جائے۔

بھئی ہم بھی کیا کرتے۔ بھوکے ہی اتنے تھے۔ ساڑھے تین بجے کے اُٹھے ہوئے۔ بھوکے پیاسے۔ رات تو مجھ پر یہی بات بے گھوڑے بیچ کر سونے والی کہاوت فٹ بیٹھی تھی۔ دُھت سو رہی تھی۔ جب کسی نے بار بار جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ چندھی آنکھوں سے دیکھا تو حیران رہ گئی تھی۔ یہ لیزا ویلیے تھی۔ جو مجھ سے کہتی تھی۔

''باتھ روم ہو آیئے۔ ماسکو آنے والا ہے۔''

میں نے ٹانگوں سے کمبل پرے پھینکا اور لیزا کا بازو چوما۔ صدقے جاؤں۔ اُس کی آنکھوں میں جو محبت و پیار کا جذبہ رقصاں تھا۔ وہ اُس کا ماتھا چومنے کا متقاضی تھا۔ پر نہیں رات بھر سونے کے بعد منہ کا بدبودار لعاب میں اُس کی چاند جیسی پیشانی پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

سارے کاموں سے فراغت کے بعد میں لیزا کے پاس آ گئی تھی۔ اور ماسکو کا مضافات شروع ہو چکا تھا۔

رُخصت ہونے سے قبل میں نے دو کام کیے۔ لیزا کی پیشانی چومی اور اُس سے وعدہ کیا کہ میں اس سے ملنے ضرور آؤں گی۔

بس تو ماسکو اسٹیشن پر چار گھنٹے دن چڑھنے کے انتظار میں کہ کیا اب ڈسٹرب کریں فاروق کو؟ دن کی چڑھائی تو ہو جائے۔ سوتے رہے یا باتھ روم جاتے رہے۔ چائے پانی بھی اپنے اوپر حرام کر لئے کہ ابھی باتھ روم کی طلب ہر گھنٹے بعد مجبور کرتی تھی۔ کچھ کھا پی لیتے تو کیا بنتا۔ سیب ضرور کھا لیا تھا۔

ہم بھی یہی ازلی احمق تھے۔ باہر نکل کر کوئی ہوٹل تلاش کر لیتے۔ لیزا سے مدد لے لیتے۔ پر اس خیال میں رہے کہ فاروق نے بکنگ کروائی ہوگی۔ اُس بے چارے کا نقصان نہ ہو جائے۔

آٹھ بجے اُسے فون کیا اور اُس سے ہوٹل کا پوچھا۔ جس شریف بندے کا موبائل لے کر اُس سے بات کی تھی اُسی کو کہا کہ ہماری کاپی پر نام پتہ لکھ دے۔ پتہ چلا تھا کہ Voskhod میں 2800 روبل پر کمرے کے لئے بات ہوئی ہے۔ ریزرویشن نہیں کروائی کہ اُس کے فالتو پیسے دینے پڑنے تھے۔

وہاں پھر مت ماری گئی کہ لعنت بھیجتے اور سٹیشن پر ہی ڈھنڈ ڈھنڈائی ہو جاتی۔ ٹیکسی والا ہزار روبل پر بضد تھا۔ بمشکل آٹھ سو کروائے۔

ہوٹل کی عمارت ایسی دیوپیکر ٹائپ کہ بندہ سوچے کہ یار یہ ہوٹل ہے یا رُوس کی خفیہ ایجنسی کا کوئی دفتر کہ پتھریلی دیواروں میں کھڑکیاں سوچ سوچ کر نکالی گئی تھیں۔ ریسیپشن پر بیٹھے لوگ ٹھنڈے ٹھار جیسے کسی برف خانے میں دبے ہوں۔ جب بات کی تو 2800 کا کہا۔ تکرار کی تو 2500 طے ہو گیا۔ پر ادائیگی ایڈوانس اور وہ بھی روبلوں میں۔ اب بہتیری ٹکریں ماریں کہ ڈالر لے لیں۔ پر ڈھیٹ ہڈیاں، مجال تھی جو ٹس سے مس ہو جائیں۔ چاروناچار بینک تلاش ہوا۔ پانچ دن کی پیشگی ادائیگی کی۔ ناشتہ نہیں ملے گا اور لاونڈری بھی نہیں ہوگی۔ رسید ہمیں تھماتے ہوئے گوش گذار ہوا۔

ہم نے ایک دوسرے سے کہا۔

''چلو دفع کرو کونسا نواب ہیں؟ اپنے گھر میں تو ہفتہ بھر ایک ہی چادر پر پڑے رہتے ہیں۔ نہیں چاہیے بھئی تمہاری سروس ہمیں۔''

کمرہ اللہ میاں کے پچھواڑے اور بیڈ بھی عجیب سے۔ مہرالنساء نے نیچے آ کر رولا رپا ڈالا۔ چلیں کمرہ بدلا گیا۔

میں اپنا جوڑا پیٹرز برگ سے دھو کر لائی تھی۔ مہرالنساء کی چھوٹی سی استری سے پریس کیا۔ نہا دھو کر یہ خواتین چلیں۔

مارکیٹ اور ریسٹورنٹ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چلو یہ تو نہیں سوچنا پڑے گا کہ اب کچھ خریدنا

ہے تو جائیں کہاں؟

ہوٹل سے نکلے تو سامنے چھوٹی سی خوبصورت مارکیٹ نظر آئی تھی۔ چھ سات دُکانوں والی۔ صحن کے عین درمیان گول چبوترہ، بڑا آرٹسٹک سا، پھولوں اور پودوں سے سجا ہوا، جس پر لڑکے بالے بیٹھے گپیں لگاتے، گانے سُنتے اور ہاتھوں میں واڈکا کی بوتلیں پکڑے موج مستیاں کرتے نظر آتے تھے۔ عین سامنے گلیارے میں عورتیں پھل، سبزی، کتابیں اور روزمرہ ضروریات کی چھوٹی موٹی چیزیں بیچتی تھیں۔ گلیارے کے اوپر ریلوے لائن تھی۔

مارکیٹ کے عین سامنے وسیع وعریض میدان تھا جہاں بسیں کھڑی تھی۔ کچھ آرہی تھیں کچھ جارہی تھیں۔ بس سٹینڈ تھا۔ نہال ہوگئے۔

''ارے یہ تو موج ہوگئی۔ شام کو بس میں بیٹھ کر شہر کا چکر لگا کریں گے۔''

خود سے کہتے ہوئے اور اس سارے ماحول کو دیکھتے اُس سے آنکھیں لڑاتے ہم کیو (KaOe) ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی تھیں جہاں ہماری ملاقات اُن خوبصورت لڑکیوں اور عورت سے ہوئی تھی جو آنے والے دنوں میں ہماری بہترین دوست بن گئی تھی۔

یہ امر بھی قابلِ اطمینان تھا کہ پراٹھا گرم تھا۔ چائے عمدہ اور بھاپ اُڑاتی تھی۔ ماحول محبت بھرا تھا۔ اور ہم شدید بھوکے تھے۔ تو پھر مرنا کیا تھا؟ ہاتھ رُک رُک کیوں جاتے تھے؟ ایک بُرکی کے بعد دوسری توڑتے ہوئے سوچنا کیوں پڑتا تھا؟

واقعہ یہ تھا کہ پراٹھے کے اندر پنیر کی ایسی موٹی موٹی تہیں تھیں کہ یا تو زنسکا یا نے ہمارے معدے کے راستے دل میں اُتر جانے کا سوچا تھا۔ یا وہ چالاک کاروباری عورت تھی کہ جو ہمیں اپنی اس چاہت میں جکڑ کر مستقل اپنا گاہک بنانا چاہتی تھی۔ پر ہم کیا کرتے؟ ہم نے تو ان دنوں میں چل چل کر اپنے پیٹ شانوں اور کولھوں پر چڑھی چربی کی تہیں پگھلانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور کہیں رتی برابر کامیابی بھی ہوئی تھی۔ اب اس قدر پنیر کھالینا گویا کھوتا کھوہ میں ڈالنے والی بات ہی تو تھی۔ سو بھئی میں نے تھوڑا پنیر کھایا اور جو کھایا بھی وہ بھی کسی مقصد کے تحت

کہ اب جسم کو کیلشیئم کی بھی ضرورت ہے۔ ہاں البتہ مہرالنساء نے صفایا کیا۔ اور کیوں نہ کرتی؟ چور جسم تھا اُس کا۔ سینک سلائی جیسا۔

اور چائے کا دوسرا کپ پیتے ہوئے میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''تو آؤ نا اُس عظیم پروفیسر کو خراجِ تحسین پیش کر آئیں جسے ماسکو کی رُوسی اور مغربی یورپ کے آرٹ اور انٹیک سے دُوری کھلتی تھی اور جو اِس شہر کو دُنیا کے نوادرات سے سجانے کا متمنی تھا۔''

میٹرو کے لئے راستہ شیطان کی آنت کی طرح لمبا تھا۔ جتنا وقت چلیں پرانے ہوٹل کی یاد میں آہیں بھریں کہ میٹرو تو وہاں سے ہاتھ بھر کے فاصلے پر تھا۔ چاہے دس بار آؤ جاؤ۔ یہ تو غلطی ہوگئی۔ میٹرو پر پہنچ کر کسی سے پرانے ہوٹل کا کارڈ دکھا کر پوچھا کہ وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ پتہ چلا کہ اسی ایریا میں ہے۔ میٹرو کا ایک سٹاپ پیچھے۔

مہرالنساء پٹ سے بولی۔

''تو یوں کریں کہ کل ہوٹل بدل لیں اور وہیں چلے جائیں۔''

''جناب من یاد رکھیئے کہ کرایہ ایڈوانس جمع کروایا جا چکا ہے۔''

سارا جوش و جذبہ مُوت کی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ فاصلہ ایک کلومیٹر سے ہرگز کم نہ تھا۔ تو گویا یہ مفت کی مشقت فالتو کھاتے میں پلّے پڑ گئی تھی۔

کروپوٹکنسکایا (Kropotkinskaya) سٹیشن تعمیراتی فنکاری کا شاہکار تھا۔ باہر آئے تو سڑک کو پولیس کے نرغے میں پایا۔

میں اپنے سامنے کرائسٹ دی سویئر (Christ the saviour) کو دیکھ رہی تھی۔ پُروقار سا سنہری گنبدوں والا کیتھڈرل۔ آج اتوار تھا اور لوگ عبادت کے بعد باہر نکل رہے تھے۔

تو چرچ آباد ہوگئے ہیں۔ چلو پولیس کے زیرِ سایہ ہی سہی۔ ارے اِن کی تو پھر موج

ہے۔ رُوسیوں کی اکثریت کہنے کو آرتھوڈوکس عیسائی کہلاتی ہے۔ پر بڑی کھلی ڈلی ہے۔ بڑے شوق اور اہتمام سے موم بتیاں جلانے اور ماڑی موٹی دعائیں مانگنے آ جاتی ہے۔ پر کوئی کہے کہ مذہب کا رتّی برابر حصہ اُن کی زندگیوں میں بھی داخل ہے تو یہ درست نہیں۔ ہاں البتہ بائبل سے کہیں زیادہ وہ زائچوں پر یقین رکھتی ہے اور جہاں کہیں یہ پتہ چل جائے کہ فلاں بندہ ہوروسکوپ (Horoscope) کا ماہر ہے۔ بس تو پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ اُس کی دہلیز سلامت نہیں رہتی۔

ہفتے بھر میں ایک بار کی حاضری کافی ہے۔ بس بڑی جلدی ہوتی ہے۔ کینڈل جلائی۔ دُعا مانگی۔ کہیں کاروبار میں ترقی، کہیں امتحان میں کامیابی، کہیں زندگی کی کسی اور خواہش کی تکمیل کے لئے سر جھکایا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

ستّر سال تو یوں بھی بڑی کڑی پابندیوں میں رہے۔ جو تھوڑی بہت رمق باقی تھی اُس کا بھی دہریت نے ناس مار دیا۔

ہم بیچارے مسلمان دوسری انتہا پر ہیں کہ دن میں پانچ بار حاضری دینی ہے۔ مسجدیں جو کبھی جائے عافیت تھیں اب جائے ہنگام ہیں۔ بم دھماکوں اور خودکش حملوں نے انہیں بھی خوف کی علامت بنا دیا ہے۔ کتنی موتیں اور کتنے خون خرابے تو مسجدوں سے موسوم ہو گئے ہیں۔ دروازوں پر تالے چڑھ گئے ہیں۔ ایک فرقے نے دوسرے کو کافر کہنا اور اُس کا تیہ پانچا کرنا ہے۔ مذہبی رواداری اور برداشت نامی عنصر زندگیوں سے حرفِ غلط کی طرح نکل گئے ہیں۔ بندہ جائے تو جائے کہاں؟ انسان کی بربریت نے جانے ابھی کیا کیا گل کھلانے ہیں؟

سڑک پار میوزیم تھا۔ پر سڑک پار کرنے سے قبل ایک انڈین جوڑے پر نظر پڑی۔ میرے اللہ اُدھیڑ عمر کی چوڑے چہرے والی سانولی سلونی عورت کانجی وارم کی ساڑھی پہنے ہوئی تھی۔ کانجی وارم جو ہمیشہ سے میری کمزوری رہی۔

اشتیاق سے اُن کی طرف بڑھی۔ تعارف کروایا تو پتہ چلا کہ لندن سے کسی سیاحتی وفد کے

ساتھ آئے ہیں۔ مسز شنیلا سہنا اور ونود سہنا۔ ونود سنہا جنرل مشرف پر دل وجان سے فدا تھا۔ مسز سہنا چین کے پھولوں پر عاشق ہوئی پڑی تھیں۔ ایک بار نہیں کوئی دس بار انہوں نے مجھے کہا کہ

''چین ضرور جاؤ۔ اللہ اتنے پھول، جیسے جگہ جگہ چادریں بچھی ہوئی ہوں۔''

ایسی ہی گپ شپ کرتے ہم میوزیم میں داخل ہو گئے۔

میوزیم کے اندر بہار رقصاں تھی۔ گھاس کے قطعے، پھولوں کی شوخیاں، ہواؤں کی اٹکھیلیاں اور عمارت کا یونانی تعمیری حُسن شان وشوکت کا مظہر تھا۔ لمبے لمبے بینچوں پر لوگ بیٹھے باتیں کرتے تھے۔

میوزیم بہت سے حصوں پر مشتمل تھا۔ مرکزی حصّے میں داخلے کے بعد میں نے اُس کا نقشہ اور اس سے متعلقہ بکلیٹ (Booklet) خریدنے کی کوشش کی۔ نیچے بیسمنٹ میں اُتری۔ سی ڈیز کا ڈھیر تھا وہاں۔ کتابیں بھی تھیں۔ پر بڑی موٹی موٹی سی۔ کوشش بسیار کے بعد چند صفحوں کا کتابچہ ساٹھ روبل کا ملا جو خریدا۔

دائیں ہاتھ پہلی بسم اللہ St Eligus کے قد آدم مجسمے سے ہوئی جن کے ہاتھوں میں بائبل تھی۔

اٹالین کورٹ کیا تھا۔ بندے کی سانس رُکتی تھی اور نظریں پتھراتی تھیں۔ محرابی دیواروں پر سجے قد آدم مجسمے، ڈوناٹیلو (Donoatello) کے بنائے ہوئے گھڑسوار، ڈیوڈ کا مجسمہ، اطالوی نشاۃ ثانیہ دور میں مقدس ماں کو یسوع مسیح کی بشارت دیتی خبر کی پلاسٹر کاسٹ میں عکاسی اُس کے دلآویز شاہکار تھے۔ یونانی کلاسیکل دور کا آرٹ پولیکیٹورس (Polykeitors) کے ہاتھوں ڈوریفورس (تیرانداز) اور بے شمار دیگر مجسموں کی صورت میں حیران کرتا تھا۔ میں خوبصورت ہال کے اندر دھرے آرام دہ بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔ جی بھر کر پہلے داہنی سمت دیکھا پھر کھڑے ہوئے بغیر ٹانگوں کو اُٹھا کر دوسری سمت کرتے ہوئے شوق وجستجو سے بائیں سمت کا نظارہ کیا۔

اور جب میں ریمبراں کے شاہکار دیکھ کر دوسرے حصّے میں جانے کے لئے باہر آئی میں نے مسٹر و مسز۔سہنا کو دیکھا جنہوں نے الوداعی ہاتھ مجھے دیکھتے ہوئے لہرایا۔

''واپس جارہے ہیں کیا؟''

میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''ہاں''۔سہنا صاحب بولے تھے۔

''اتنی جلدی۔''میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''لواب کیا رات کرنی ہے یہاں؟''

مزے کی جوڑی تھی۔سنہا صاحب دھپ دھپ پاؤں مارتے چلے جارہے تھے۔

اطالوی اور یونانی کمروں میں مجسمہ سازی پلاسٹر کاسٹ سے یوں کی گئی ہے کہ نقل پر اصل کا گمان گذرے۔کچھ کا قبل مسیح سے تعلق ہے۔قرون وسطیٰ کا یورپین آرٹ بھی اپنی جگہ کمال کا تھا۔

نامعلوم ماسٹر کی سینٹ مارک کی زندگی کے مناظر کی عکاسی مبہوت کرنے والی تھی۔مجھ جیسی مائیکل اینجلو کے فن پر کیا رائے زنی کر سکتی ہے۔پر سچی بات ہے Pieta دل دہلانے والا فن تھا جہاں فنکار نے غم زدہ ماں کے ایک ایک نقش میں اُس کے دُکھ کو سمو دیا ہے کہ جو مردہ بیٹے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔پورا ہال مائیکل اینجلو کے شاہکاروں سے بھرا ہوا ہے۔

یہاں فرینچ آرٹ، فلیمش آرٹ، جرمن آرٹ اور ڈچ آرٹ تھا۔مصری آرٹ تھا جس پر میں نے صرف ایک نظر ڈالی اور واپس آگئی کہ وہ تو اب گھر والی بات ہوگئی تھی کہ جتیرا کام دیکھے بیٹھی تھی۔پر مصری آرٹ کی نمائش اُسی قدر خوبصورت اور دل پذیر انداز میں یہاں تھی جس کا وہ متقضی ہے۔پویلین کی تعمیر کا انداز بھی قدیم مصری تھا۔

یہاں تین چار گھنٹے گزارنے کی کیفیت اُس بھوکے آدمی جیسی تھی جس کی آنکھوں میں ہوس ہو۔ندیدہ پن ہو۔اور جو کچھ کھا کر بھی یہی سمجھے کہ اُس کا تو حلق تالو بھی ابھی گیلا نہیں ہوا۔

یہاں ریمبراں (Rembrandt)، روبنز (Robens)، پوسن (Poussin) اور برونزینو (Bronzino) تھا۔

میں نے سوچا تھا میں مہرالنساء سے کہوں گی کہ ایک بار پھر یہاں آئیں اور اگر وہ نہ مانے تو اکیلی آؤں گی۔

چار صدی قبل مسیح یونانی فنکاروں کے گھروں کے بیرونی حصوں اور پورچوں کی ڈیزائن کاری حیران کرتی تھی۔

پلاسٹر کاسٹ میں کلاسیکل اور ہیلنسٹک (Hellenistic) ادوار کا کام ہے۔ بغیر دھڑ کے ماضی کی شخصیات کے سر۔ سکندرِ اعظم تو فوراً پہچان میں آ گیا تھا۔ چبوتروں پر کھڑے قد آدم مجسموں میں وینس آف ڈی میلو کو میں نے رُک کر بغور دیکھا تھا۔

ملحقہ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں قدیم رُوم کے دربار شاہی میں داخل ہوگئی ہوں جہاں آگسٹس ہاتھ لہراتے ہوئے کوئی تقریر کرتا ہے۔

قیصر شاہانہ انداز میں استراحت فرماتا ہے اور کمرے کے وسط میں کھڑی تھنوں والی سیاہ بھیڑ مادہ مجھے پہلی نظر میں Apis نظر آئی۔ پر جب قریب جا کر بڑھا تو وہ قدیمی رومی اساطیری کردار مادہ بھیڑیا تھی۔

اٹھارویں صدی کے وسط کے فرنچ آرٹ کی ہرکولیس اور اومفیل (Omphale) کمال کی پینٹنگ تھی اسے میں نے ہرمیٹج میں بھی دیکھا تھا۔

جینا بریجڈا کا ایک پورا ہال تھا۔ قدرت نے اُسے کتنی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اگر اداکارہ تھی تو کمال کی اور یہاں اُس کے مجسموں کے شاہکار تھے۔

اور جب میں بینچ پر بیٹھی اپنی ٹانگوں کو ذرا آرام دیتی تھی۔ میں نے خود سے تھا۔ تو پہلا سیلوٹ تو ماسکو کو ایسے نایاب تحفے سے نوازنے والے اُستاد پروفیسر آئی وان ولادی میروچ ساویتائیو (Ivan Valadimirovich Tsvetayev) کو مارنا چاہیے۔ پھر وہ سب طلباء،

معززین شہر، تاجر برادری اور صنعت کار تعریف کے مستحق ہیں جنہوں نے پیسہ اکٹھا کرنے کی ذمہ داری اُٹھائی۔ سٹی ڈوما (کونسل) بھی تالیوں کی مستحق ہے کہ جس نے ماسکو شہر کے دل میں جگہ دی اور اُن تعمیراتی معماروں کا کمال جنہوں نے اُس کی عمارت کو پُروقار اور شاندار بنایا۔

پشکن میوزیم کو صدیوں پرانی تہذیبی ارتقاء سے جدید تک اور ہر ملک کے نامور فنکاروں کے شاہکاروں کے حصول میں اُس کے نمائندوں نے کن کن مصیبتوں کو جھیلا اور کیسے چیزیں حاصل کیں یہ بڑی لمبی داستان ہے۔

باب

36

ژوسی عورت کے شب و روز • گھر سے گھر تک کے منظر

عمراں لنگیاں پباں بھار • تاریخ کسی کے باپ دادا کی جاگیر نہیں

Круглосуточно Русский Женшен

Обше Вид Из Дом До Дома

Трудавой Дизнь

История Не Владение Джагиром Предки

انتونینا کا پورا چہرہ کیا اُس کا تو ہر نقش کھلے گلاب کی طرح ہنس رہا تھا۔ دروازہ اُسی نے کھولا تھا اور ہمارا استقبال اُس پُرخلوص پاکستانی کی طرح سے کیا تھا جو بیرون وطن مقیم اپنے کسی غیر ملکی دوست کو پاکستان آنے اور اس کے کسی اہم شہر اور جگہوں کی سیاحت سے واپسی پر کھلے بازوؤں سے کرتا ہے۔ اشتیاق بھری آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے سوال جواب کے سلسلے میں اس سلوک کی یقیناً متوقع نہیں تھی۔

ہاں تو کیا کیا دیکھا؟

وہ ہمارے جواب تو کم سنتی تھی۔ سوال پہ سوال کیے چلی جاتی تھی۔ ایڈمیر یلٹی کی سیر کی۔ جواب نفی میں تھا۔ بوٹینیکل گارڈن دیکھے۔ اُس کی لائبریری میں گئیں۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی

لائبریری ہے۔

سر کا تو لا پچر نگی میں ہلا۔

''اُف وہاں تو جانا تھا۔''

''انتونینا کہاں کہاں جاتے؟ اتنا کچھ تھا وہاں کہ ہماری تو مت ماری گئی۔''

''اچھا چلو انستاسیا سے ملاقات تو بہت اچھی رہی ہوگی۔ میری بات ہوئی تھی اُس سے۔''

ظاہر ہے ہمارے پاس اُن کے لئے محبت بھرے جذبات تھے۔

چھوٹی کرسی پر بیٹھا میر نوف چھوٹی سی میز پر رنگوں کو بکھیرے ڈرائنگ بورڈ پر پھولوں میں رنگ بھر رہا تھا۔ میں پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۔ انتونینا بولی۔

کیا کروں؟ ایسی فضول ڈرائنگ کرتا ہے۔ اُوپر سے رنگ بھرنے کی بھی تمیز نہیں۔

میں ہنس پڑی تھی۔ پورب ہو یا پچھم اُتر ہو یا دکھن۔ ماؤں کی نفسیات بہت حد تک ایک سی ہوتی ہے۔ پہلے بچے پر تو بس نہیں چلتا کہ کیسے اُسے پی ایچ ڈی کروا دیں۔ مجھے بیٹی اور بہو دونوں یاد آئی تھیں۔ مارہلکان ہو ہو جاتی ہیں۔

انتونینا نے بتایا تھا کہ یکم ستمبر کو سکول کھلتے ہیں۔ بچے اپنی ٹیچر کے لئے پھول لے کر جاتے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ اس بار تم تازہ نہیں خود اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ پھول لے کر جاؤ گے۔ چلو ڈرائنگ اور کلرنگ تو اس بہانے کچھ بہتر ہو جائے گی۔

میں ابھی دلداری کے لفظوں سے اُسے بہلا رہی تھی جب بیل بجی۔ انتونینا کی ماں اور باپ دونوں اندر داخل ہوئے۔ ماں کا چہرہ اس درجہ درہم برہم سا تھا کہ تھوڑا سا خوف محسوس ہوا۔ اُس نے کاغذات کا بڑا سا پلندہ انتونینا کے آگے پھینکا اور کسی بپھری شیرنی کی طرح شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولنا شروع ہوگئی۔ باپ بھی بولنے لگا۔

میرا تو دم ہوا ہو گیا۔ انتونینا نے بھی غصے سے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا تھوڑی دیر تک کمرہ پانی پت کا میدان بنا۔ پھر دونوں بول برار کرتے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

بڑی مخدوش اور نازک سی صورت تھی۔ ہماری تو بھیگی بلی کی طرح پچکنے والی بات تھی۔ پر یہ امر قابل اطمینان تھا کہ انتونینا مزے سے بیٹھی ایکسرے رپورٹیں دیکھتی تھی۔

ساری چیزیں اُس نے بڑے سے لفافے میں ڈال کر سمیٹیں اور ہماری طرف دیکھا جو ذرا پریشانی سے اُس کی طرف ہی دیکھتی تھیں۔

''جگر کا ستیاناس ہوگیا ہے۔ دل کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ الکحل پر ہی بات نہیں۔ ہیر لوشن بھی پی لینا ہے۔ کارمن پرفیوم کے بھی چسکے لینے ہیں۔ اب گلا اور جگر تو کٹنے ہیں نا۔ کام سے بھی بھاگ آنا ہے۔ نوکری بھی نہیں اور شراب کی جان نہیں چھوڑنی۔ پیسہ ٹکا کمانا نہیں۔ صبح آٹھ بجے سے شام چھ بجے تک کام کرنے والی اور گھر کو چلانے والی عورت بولے گی نہیں تو اور کیا کرے گی؟

میں نے آنکھیں اُٹھا کر اپنے سامنے دیکھا۔ سفید دیوار جس پر تھوڑی سی دیر قبل کا دیکھا ہوا سین رقص کرنے لگا تھا۔

یہ رُوس ہے۔ پر منظر تو بڑا اپنا سا ہے۔

چائے کی ٹرے یانینا انتونینا کی چھوٹی بہن نے میز پر رکھی۔ اور بہن سے کچھ کہا۔ بڑی نے قدرے خفگی سے بایاں ہاتھ کانوں کے پاس لے جا کر جھاڑنے والے انداز میں لہرا دیا۔ چائے کا چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے کہا۔

''انتونینا رُوسی عورت میرے مشاہدے کے حسابوں بڑی محنتی ہے۔ کولھو کے بیل کی طرح کام کرتی ہے۔ مرد خاصی موج میں ہیں۔''

سالوں پہلے جب میں پاکستان میں تھی۔ ایک گانا میرے سسر کے گھر میں بہت کثرت سے بجا کرتا تھا۔ میرے سسر کا پسندیدہ۔ پہلے میں نے توجہ نہیں دی۔ جب تسلسل سے بول کانوں میں پڑے۔ تو اپنی نند سے اُس کا مطلب پوچھا۔

عمراں لنگیاں پباں بھار۔

بس تو سمجھ لو کہ عام رُوسی عورت بھی زندگی پہاں پچار ہی گذارتی ہے۔ آٹھ گھنٹے کی روزانہ کام کی ڈیوٹی اور پھر چھ آٹھ گھنٹے گھر کی ذمہ داریاں۔

''اب مجھے دیکھو۔ اماں کی مثال تو بعد میں دوں گی۔ میں جدید رُوسی عورت کی نمائندہ ہوں، مڈل کلاسی، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم وبیش آدھی دُنیا گھومی ہوئی۔ کام پر جانے کے لئے مجھے پبلک ٹرانسپورٹ، کبھی بس، کبھی ٹرام، کبھی ٹرالی بس اور کبھی میٹرو سے سفر کرنا پڑتا ہے۔ وقت کے اعتبار سے ہی فیصلہ کرتی ہوں کہ کونسا موڈ مجھے کام پر جلدی پہنچائے گا۔ میرے اوقات کار رش آور والے نہیں ہیں۔ وگرنہ سویرے سویرے حشر ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ڈربے میں مرغیاں یا کین میں مچھلیاں ٹھنسی ہوئی ہوں۔''

کام پر کام کی دردسری۔ اب ہمارے پاس گاڑی ہے۔ یہ گاڑی تھوڑا عرصے پہلے ہی لی تھی۔ مگر بالعموم یہ منصور کے پاس ہوتی ہے۔ مڈل اور لوئر مڈل کلاسیوں کے پاس گاڑیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ اگر گاڑی ہے تو وہ زیادہ تر شوہر کے پاس ہی ہوگی۔

کام سے واپسی پر مجھے راستے میں پڑنے والی کسی دکان پر رکنا ہے۔ اپنے پرس میں سے تھیلا نکالنا ہے دودھ، ڈبل روٹی، انڈے، پھل اور دیگر روزمرہ ضروریات کی چیزوں سے بھروا کر اسے اُٹھانا بھی ہے۔ پہلے جب اکیلی تھی تو کنڈرگارٹن سے بیٹے کو بھی لیتی تھی۔ چلو اب کوئی نہ کوئی اُسے لے آتا ہے۔

اب دوسرا رُخ دیکھو۔

منصور کے کزن کی بیوی اپر کلاس سے ہے۔ کچھ تو اُس کا بھائی تیز، کچھ بیوی کی پشت پناہی۔ اُس کا کاروبار بہت عروج پر ہے۔ کہیں کام نہیں کرتی۔ دو بچے ہیں۔ ماسکو کے ٹاپ سکول میں پڑھتے ہیں۔ بریک فاسٹ سے لنچ تک سکول میں۔ اب وہ ایلیٹ کلاس کی عورتوں کی طرح گیارہ بارہ بجے تک بیڈ پر اینڈ تی ہے۔ تو بھئی یہ اُس کا مقدر۔ یہ گھرانا کا ہے۔ میرے ابا پکے کمیونسٹ اور سچے انقلابی تھے۔ ٹکے کی ہیرا پھیری کو بھی حرام سمجھتے تھے۔ پھر یار لوگوں کی دیکھا

دیکھی ہاتھ پیر مارے۔ جب سوویت ٹوٹا اور آپو دھاپی پڑی تو اس گھر کو تو انہوں نے بغیر ڈکار مارے ہضم کرلیا۔ اور بھی چکر چلائے۔ یہ دور لوٹ کھسوٹ کا تھا۔ شریف لوگ رگڑے گئے۔ بدمعاشوں اور زبردستوں نے جو جو سمیٹ سکتے تھے سمیٹ لیا۔ نہ کہیں شنوائی اور نہ کہیں دادرسی۔

لیکن ایک فائدہ ضرور ہوا کہ جب غیر ملکی اشیاء خریداری کی دسترس سے بالا ہوگئیں۔ رُوسی صنعتیں میدان میں اُتریں اور انہوں نے مارکیٹ کو قابو کرلیا اور اس چیز نے ملکی معیشت کو بہت سنبھالا دیا۔

یقین کیجئے رُوسی عورت جب گھر آتی ہے تو وہ انگریزی کے لفظ ایگزاسٹڈ (Exhausted) کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔

اور میں خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے خود سے کہتی ہوں۔

اب یہ دونوں عورتیں رُوس میں اگر ہیں تو پاکستان میں بھی ہیں اور دیگر ممالک میں بھی تھوڑے بہت کلچرل فرق کے ساتھ۔

اب رات کے کھانے کی تیاری کا مرحلہ درپیش۔ نیم پختہ چیزوں کی بہت افراط ہے لیکن وہ زیادہ تر درآمد شدہ ہونے کی وجہ سے باوا کے مول ہوتی ہیں۔

شوہر کا کردار دیکھ لیں۔ منصور کے کام کی نوعیت ایسی کہ وہ بالعموم رات کو دس سے پہلے نہیں آسکتا۔ وہ میری مدد کپڑوں کی دھلائی اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہی کرتا ہے۔

یہ تو گھر سے گھر تک کے مناظر ہیں جو میں دیکھ رہی ہوں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

ایک عام رُوسی عورت کی زندگی کام، گھر، کام، گھر، دکان، گھر۔ اب کہا جا سکتا ہے یہی زندگی مغربی عورت کی بھی ہے۔ مگر نہیں۔ فرق ہے سسٹم کا۔ یہ جو مثل مشہور ہے کہ مغربی زندگی کے فلسفے کی بنیاد فرد کی زندگی کو آسان اور پرلطف بنانے پر رکھی گئی ہے جبکہ رُوسی زندگی کی ''خدا مشقت جھیلنے کا حوصلہ اور ہمت دے۔'' پر ہے۔ سو فی صد سچ ہے۔

انتونینا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

ایک واقعہ سنیں۔ میری دوست ایوگینیا کاسمیٹکس کی ایک غیر ملکی فرم میں کام کرتی ہے۔ کمپنی نے اُس کی تنخواہ میں سے وہ دن کاٹ لیا جس دن وہ اپنے نئے باس کے لئے معلومات اکٹھی کرنے کسی حکومتی ادارے میں گئی۔ اب اُس کا یہ اصرار کہ اُسے ڈیوٹی پر سمجھا جائے اور باس کا کہنا کہ ہرگز نہیں۔ یہ معلومات تو تمہیں دفتر بیٹھے ایک فون یا فیکس پر حاصل ہو سکتی تھیں۔ یقیناً تم نے اپنی کسی ذاتی کام کے لئے یہ ہیرا پھیری کی۔

اب وہ بھی جانتی تھی۔ میں بھی اور فرم کا پرانا باس بھی کہ ایک کال پر معلومات کا ملنا یورپ میں تو ممکن ہے رُوس میں ناممکن۔ جب تک دفتر خود نہ جاؤ۔ اور ہر ڈپارٹمنٹ میں بھاگ دوڑ نہ کرو۔ کام نہیں ہو سکتا۔

یقیناً اُس وقت میں نے خود سے کہا تھا تو میں اپنے وطن کو کس نمبر پر کھڑا کروں۔

یہ نمبر تین تھا۔ کام تو چٹکیوں میں ہو جاتا ہے۔ بس لال ہرے نوٹ نیچے سے اُوپر تک اگر گردش کریں یا پھر کوئی تگڑی شفارش پشت پر ہو۔ پر نوٹوں والی بات تو بہت پکی ہے۔

انتونینا نے وقت دیکھا۔ مجھ سے معذرت کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔ مہر النساء صوفے پر بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ میں تیمرنوف سے اونگی بونگی باتیں کرنے لگی۔ بچہ نہ ابھی انگریزی اتنی سمجھتا تھا نہ اُردو۔ پر گھلنے ملنے والا پُراعتماد بچہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد انتونینا کمرے میں آئی۔ ایپرن پہنے سر کو سکارف نما کپڑے سے باندھے۔ مجھے اُٹھا کر کچن میں لے آئی کہ میں کھانا بھی بنالوں اور باتیں بھی کرتے ہیں۔ میز پر سیب اور کیلے دھرے تھے۔ ایک پلیٹ میں کانٹے چمچ کے ساتھ کچھ تھا۔ انتونینا نے کہا۔ اسے کھائیں۔ یہ کھٹی میٹھی چٹنی میں لوبیا ہے۔ بہت مزیدار چیز ہے ہم بہت کھاتے ہیں۔ واقعی جب میں نے چمچ منہ میں ڈالا مزہ آ گیا۔ وہ پیاز کاٹ رہی تھی اور میں چسکے لیتی لوبیا کھا رہی تھی اور اسی سے کہتی تھی۔

''انتونینا رُوسی لڑکیاں بہت اچھی بیویاں ہوتی ہے۔''

یقیناً اس میں کوئی شک نہیں۔ یورپ میں رُوسی بیویاں پسندیدہ ترین شمار ہوتی ہیں۔ سوویت زمانوں میں تو بہت بھولی اور سادہ ہوتی تھیں۔ آسانی سے مردوں کے جال میں پھنستی تھیں۔ پر ذرائع ابلاغ کی آزادیوں نے خاصا ہوشیار کر دیا ہے۔ تاہم پھر بھی گھر بچانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ ایک بات بڑی زبان زدِعام ہے۔

''رُوس میں کیا سب سے اچھا ہے؟''

رُوسی لڑکیاں۔

خوبصورت، مہذب، سادہ اور آسانی سے گرفت میں آنے والیاں۔ رُوسی لڑکیاں جلدی شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ تعلیم کی تو خیر کچھ پروا کر ہی لیتی ہیں پر کیریئر کے لئے بالکل سنجیدہ نہیں ہوتیں۔ زیادہ عمر اگر ہو جائے تو اس کا سیدھے سیدھے مطلب ہے کہ لڑکی کے ساتھ کچھ گڑ بڑ ہے۔ سیکس کا مسئلہ بہت ثانوی ہے۔ ہماری زندگیوں میں اُس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ شراب کی طرح معمول کی بات ہے۔

اب پاکستان میں کیا ہے؟ یہی کام لڑکیاں چوری چھپے کرتی ہیں۔

انتونینا کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ کتنا عرصہ پاکستان میں رہی؟ آٹھ نو ماہ۔ پاکستانی معاشرت کے سارے کچے چٹھوں سے شناسا ہو چکی تھی۔

اور جب میں نے ہنستے ہوئے یہی بات کہی۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔

''لکھنے والے کی ایک آنکھ زیادہ ہوتی ہے۔''

انتونینا یہ سب تو تقریباً گھر سے گھر تک کی باتیں تھیں۔ مجھے کچھ اُس وقت کا حال سننا ہے جب سوویت ٹوٹ رہا تھا۔ اٹھارہ اُنیس سال پہلے کی بات ہے تم تو چھوٹی تھیں۔

''ارے ابا تو موجود ہیں۔ وہ تو ماسکو میں تھے اور خیر سے بڑے سرگرم بھی تھے۔''

انتونینا اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ چند لمحوں بعد مسکراتا ہوا زیوگانوف میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ آنکھیں ہنستی اور محبت سے بھری ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر قبل والی لڑائی جھگڑے یا اپنی

بیماری سے متعلق کسی فکر مندی کا ذرہ سا بھی عکس نہیں تھا وہاں۔

میں نے سوال پوچھا تھا جو بالعموم بہت سننے میں آیا تھا کہ 91،90 میں ریڈ سکوائر میں فوجی جرنیل اپنے تمغوں کے عوض ڈبل روٹی مانگتے پھرتے تھے۔ کتنی سچائی تھی اُس میں؟

انتونینا نے سوال سن کر کہا کہ ''جواب تو میں بھی دے سکتی ہوں لیکن بہتر ہے ابا سے سنیں۔ کیونکہ میرا علم معلوماتی اور کتابی ہے۔''

ابا کا جواب تھا۔

''ارے بھئی ایسا ہی تھا۔ حاضر نوکری والوں کو مہینوں سے تنخواہیں نہیں مل رہی تھیں تو ریٹائرڈ لوگوں کو کس نے پوچھنا تھا؟ بڑا بحران تھا۔ کہیں بالٹک ریاستیں گڈ جوڑ سے آزادی کے لیے تحریکیں چلا رہی تھیں، کہیں کاکیشیا کی ریاستیں، کہیں کان کن بھرے ہوئے ہڑتالیں کرتے اور شور مچاتے تھے کہ ہمیں سہولتیں دو۔ کہیں بیچارے رُوسی عوام جلے دلوں کے پھپھولے پھوڑتے تھے۔''

گفتگو تو ابھی جاری تھی جب انتونینا کے بلند قہقہے نے مجھے چونکا سا کر دیا تھا۔ انتونینا فوراً بول اُٹھی تھی۔

''ارے ابا ملک کے امیر ترین رُوسیوں کو گالیاں نکال رہے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ جب غریبوں کو روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، ملک کا امیر ترین طبقہ لندن میں جائیدادیں خرید رہا تھا۔ بینکوں میں پاؤنڈ اور ڈالر جمع کروا رہا تھا۔''

اب میرے کھلکھلا کر ہنسنے کی باری تھی۔

''انتونینا یہ تو پھر گھر گھر کا منظر ہے۔ ہاں تو سوویت کا جھنڈا اُتار کر رُوس کا جھنڈا لہرانے کو لوگوں نے کیسے دیکھا؟''

''ارے لوگ بیچارے روٹی کے لیے ہپوہان۔ سوویت کا جھنڈا لہرائے یا رُوس کا۔ اُنہیں تو بنیادی سہولتوں کی ضرورت تھی۔ وہ صرف لعنت بھیج رہے تھے سبھوں پر۔ ہاں البتہ فوج

کا ایک عنصر ناراض تھا۔''

سینٹ پیٹرز برگ کی لینن گراڈ، پیٹروگراڈ پھر لینن گراڈ سے پیٹرز برگ واپسی کے ردّعمل والے سوال پر باپ بیٹی ذرا اُلجھ سے گئے تھے۔ باپ کا کہنا تھا وہ بالشویک تحریک کا شہر تھا۔ لینن کا شہر تھا۔ نام تو کسی صورت تبدیل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اور بیٹی نے قدرے غصے سے کہا۔

''لو یہ تو وہی بات ہوئی، جس نے پکایا ریندھا اُس کا نام نہیں۔ پروسنے والے کا نام ہو گیا۔ پیٹروی گریٹ اُس کا خالق تھا۔ اب کوئی تحریک وہاں پھلی پھولی یا کوئی وہاں رہا اور تحریک کی قیادت کی تو اِس کا مطلب ہے اُٹھا کر نام بدل دو اور تاریخ کی صورت بگاڑ دو۔ 1988ء میں گورباچوف کی سنٹرل کمیٹی جن میں ہمارے ابا بھی خیر سے خاصے اہم تھے۔ برژنیف اور چرننکو کے ناموں کی تختیوں اور یادگاروں کو اُکھاڑنے پچھاڑنے میں سب سے پیش پیش تھے۔ جو بیچاروں نے گلی کوچوں اور شاہراہوں پر نصب کروائی تھیں۔ یہ لوگ تو پبلک لائبریریوں سے برژنیف کی کتابوں کو بھی غائب کروا کے ردّی کے بھاؤ بیچ کر دام کھرے کرنا چاہتے تھے۔''

مجھے Friends Not Masters اور In The Line of Fire یاد آئی تھیں۔ پرانی انارکلی کے تھڑے یاد آئے تھے۔

انتونینا بول رہی تھی۔

''تاریخ کوئی آپ کے باپ دادا کی جاگیر نہیں کہ جس کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔''

اور میرے ایک سوال پر انتونینا کے جواب نے خوب ہی ہنسایا۔

''میرا باپ کمیونسٹ، ماں آرتھوڈوکس عیسائی، شوہر مسلمان اور میں خود بیچ میں لٹکتی منکتی۔''

اُس رات واپسی دیر سے ہوئی۔ منصور کا چھوٹا سا خاندان جب ہمیں ہوٹل چھوڑنے آیا ایک بج رہا تھا۔

باب

37

ارباط سٹریٹ • ٹالسٹائی پارک • موزے ٹالسٹائی

Улидца Арбатская. Талстой Парк
Музеле Талстаи

تو اگر کوئی یہ پوچھے کہ زندگی میں کیا کرنا سب سے اچھا لگا؟ جواب ہو گا کتابیں پڑھنا اور پُرانے گلی کوچوں میں گھومنا پھرنا۔ نوعمری سے اُدھیڑ عمری تک لاہور قدیمہ کے تہذیبی گہوارے کی کوئی نہ کوئی نئی گلی، نیا محلّہ ہر بار اپنے کسی نئے رنگ کے ساتھ دریافت ہوتا اور مجھے متاثر کرتا۔

ارے یہ تو میں نے پہلے دیکھا ہی نہ تھا۔ ہمیشہ میرا خود سے سوال ہوتا۔

تکیہ مراثیاں نام نے کتنی دیر ہنسایا تھا۔ کلاسیکل موسیقی کی ایک طرح یہاں پرورش ہوئی۔ بنگلہ دیش کی گلوکارہ فردوسی بیگم کی یہ بات اکثر یاد آتی۔ ایک ملاقات میں اُنہوں نے مجھے کہا تھا۔ یہ ویسٹ پاکستانی تو ہمیں میراثی سمجھتے ہیں۔ واقعی تکیہ مراثیاں اسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

چوک نواب صاحب میں بڑے غلام علی خان رہتے تھے۔ مسجد وزیر خان میں میرا پڑاؤ ہونا ضروری تھا۔ یہیں چوک میں موسیقی کے عاشق حیات محمد خان کا گھر تھا۔ اندرونی بھاٹی گیٹ کے محلّہ چومالہ میں برصغیر کے فنکار محمد رفیع کا گھر ڈھونڈنے اور دیکھنے میں آدھی دیہاڑی گُل کر

دی تھی۔ رنگ محل سے کناری بازار، آگے چھتہ بازار، گمٹی بازار سے نکلتی۔ میرزا ادیب کے گھر کا دیدار کرتی، پکوڑے سموسے کھاتی لوہاری جا نکلتی۔ پیسہ اخبار کی خستہ گلاب جامنیں ہمیشہ اُدھر لے جاتیں۔ کبھی رنگ محل سے پانی والا تالاب۔ نقاب سے منہ ڈھانپے بازارِ حسن کا چکر لگتا۔ چوباروں کو دیکھتی۔ بالکونیوں کو تکتی۔ بہت جی چاہتا سیڑھیاں چڑھ جاؤں اور دیکھوں کہ اُن کے دن کیسے ہیں؟ پر بُزدلی آڑے آجاتی۔

بئی گلی کے عقبی محلوں میں بہت سی ہستیوں کے نقش کندہ ہیں۔ اعظم مارکیٹ کی پیچ در پیچ گلیوں سے کتنے راستے نکلتے۔ چونا منڈی چلے جاؤ۔ شیرانوالہ گیٹ نکل جاؤ۔ منٹو پارک کی سیر کرلو۔

ملک کی نامور شخصیتوں کے قدموں کی چاپ ان گلیوں میں سنائی دیتی ہے۔ علامہ اقبال سے لے کر فیض، ناصر کاظمی کس کس کا نام لکھوں۔ پر کہیں کوئی پلیک کوئی نشان نہیں۔

ڈاکٹر انور سجاد تو ابھی کچھ وقت پہلے تک مسیحائی اُنہی گلیوں میں بانٹتے رہے ہیں۔ پاکستان فضائیہ کا ایئر مارشل مصحف علی میر بھی اِنہی گلی محلوں میں جوان ہوا تھا۔ اِس کی ہر گلی، ہر کوچہ، ہر بازار تاریخی اہمیت کا حامل۔ کاش ہم اِسے تاریخی ورثہ بنا سکتے۔

1969ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی اپنے قیام کے دوران میرے لئے اولڈ ڈھاکہ جانے کا ارمان وانتظار ایسے ہی ہوتا جیسے ہر پندرھواڑے پر فیسٹ کا۔ پیچ در پیچ گلیوں کے سلسلے اُلجھے ہوئے دھاگوں کے گچھوں جیسے لگتے جن میں اکثر وبیشتر میں گُم ہو کر رہ جاتی تھی۔ 22 فروری 1970ء کی وہ لسانی فسادات میں ڈوبی ہوئی سہ پہر خوفناک سی تھی پر میں انسان کی اچھائی کے ازلی گمان کو پلّے میں باندھے نامور مصور زین العابدین کے چھوٹے سے گھر کی بیٹھک میں چٹائی پر بیٹھی اُس سے باتیں کرتی تھی۔

امرتسر کے گلی کوچوں میں بھی میں اپنے گروپ سے الگ ہو کر گھنٹوں اکیلی پھرتی رہی تھی۔ قاہرہ ہو یا استنبول مجھے تو پرانے شہر کا کریز مارے ڈالتا ہے۔

اور اب یہی حال ماسکو میں بھی تھا۔

تو کریملن کا سارا گردونواح صدیوں کی تاریخ کو پور پور میں سمیٹے بیٹھا ہے۔

رُوسیوں نے کسی زندہ قوم کی طرح اپنے ماضی کی نشانیوں کو محفوظ رکھتے ہوئے نئے رُجحانات کو ان میں خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔

اندرونی خدوخال بہتر بنانے کے لئے محنت کی گئی۔ سڑکوں کو چوڑا اور چھوٹے مکانوں کو کشادگی دی گئی ارباط سٹریٹ کا علاقہ خاص سماجی اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں امیروں کے محلے تھے۔ یہاں غریبوں کے محلے تھے۔ یہاں تاجر رہتے تھے۔ یہ شاعروں اور ادیبوں کا مسکن تھی۔ اُس کی فضاؤں میں موسیقی کی تانیں اُڑتی تھیں یہاں مصوری کے رنگ بکھرتے تھے۔

آخر ایسا کیوں نہ ہوتا کہ یہاں لکھنے والے آتے تھے۔ موسیقی سے شغف رکھنے والوں کا یہ رین بسیرا تھا۔ گانے سے عشق کرنے والے بھی یہیں ڈیرہ ڈالے رکھتے تھے۔

ارباط سکایا پلوشد (چوک) سے ہی میرا ہر اُٹھتا قدم مجھے مرعوب کئے جاتا تھا۔

شاہراہ پر رنگ برنگے لوگ اور رونقیں عروج پر تھیں۔ رُوسی دستکاریوں کے سٹال تھے جن پر مہرالنساء کسی بھوکے بچے کی طرح لپکی تھی۔ میں تو اُن نوجوان لڑکوں کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ جو گٹار بجا رہے تھے۔ سامنے بچھے کپڑے پر کوپک اور روبل چمکتے تھے۔ وہ چہلیں کرتے تھے۔ گیت گاتے اور ہنستے تھے۔

تھوڑی دیر بعد میں ذرا ہٹ کر ان کے پاس ہی پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی کہ مسلسل کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ لڑکے خوش شکل تھے، جوان تھے، تو چاہے کوئی یہ کہے۔

''ارے یہ نظر بٹو کہاں کا مال ہے؟''

یونہی پل بھر کے لئے خیال آیا۔ پھر فوراً تردید بھی آ گئی۔

''لو انہوں نے کہنا ہے جو خود کسی قاعدے کلیے میں نہیں۔ میں بھی بس عجیب ہوں۔''

مہرالنساء تھوڑی دیر بعد مایوس چہرے کے ساتھ میرے پاس آ بیٹھی تھی۔ اور تلخی سے

بولی تھی۔

''یہاں تو یہی بات ہے کوئی کام کی چیز ہی نہیں۔ بمشکل اگر کسی طرف ہاتھ بڑھتا ہی ہے۔ تو مُول سن کر چیز ہاتھوں سے چھوٹ جاتی ہے اور روبلوں کو روپوں سے ضرب دے کر تو بندے کی سٹی گم ہوتی ہے۔''

پیٹرز برگ کی طرح یہاں بھی کئی خوبصورت جوڑے زار، زارینہ کا روپ دھارے سیاحوں کو پیسوں کے عوض اپنے ساتھ تصویریں اُتروانے پر مجبور کرتے تھے۔

اور جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے تھے۔ عمارتوں کی قدامت، ان کی خستگی، ان کی تاریخی حیثیت، اُن کا تعمیری رنگ وروپ. ان کی کھڑکیوں دروازوں اور بالکونیوں کی کلاسک ساخت سامنے آتی تھی۔ یہ سب اپنی جگہ۔

یوں یہاں تنوع بھی بہت تھا۔ سہ منزلہ بلڈنگز کے ساتھ کہیں دومنزلہ اور یک منزلہ بھی نظر آتی تھیں۔ کہیں نہم وہم والا معاملہ بھی تھا اور کہیں اُس سے بھی بلند تر جلوے دِکھتے تھے۔ شاہراہ کی کشادگی اور اینٹوں کے فرش کی پختگی ایسی کہ چاہے رُوسی فوج کا بریگیڈ لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ کرتا ہوا روز بھی گذرے تب بھی اس کا بال بیکا نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ بجز دو ٹانگوں کے ہر قسم کی سواری کا یہاں آنا منع ہے۔

بالآخر مہر النساء شاپنگ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ میتھر وشکا (Matryoshka) گڑیا خرید لائی۔ وہ اتنی ہی خوش تھی جیسے اُسے کوئی ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اب وہ مجھے بتاتی اور دکھاتی تھی کہ بظاہر یہ ایک نظر آنے والی ڈول دراصل چھ گڑیوں کا سیٹ ہے اور سب اس کے اندر ہیں۔ یہ مخروطی صورت کی تھی بظاہر بڑی خوبصورت لگتی تھی۔ اور جب وہ ایک کے اندر سے ایک نکالتی تھی۔ یہ کسی مداری کا سین لگتا تھا۔ یہ گڑیاں پینٹ شدہ تھیں۔ اس پینٹ میں مصورانہ ٹچ جھلکتے تھے۔

بعد میں ہینڈی کرافٹ کی ایک دُکان میں ہم نے بے شمار گڑیوں کو دیکھا جو کسی نہ کسی

حوالے سے کچھ نہ کچھ کہانیاں سُناتی تھیں۔ کہیں روایتی ملبوسات میں کسان کی بیٹیوں، کہیں لوک کہانیوں اور کہیں پریوں کے علامتی کرداروں کی مظہر تھیں، بلکہ سوویٹ لیڈروں کی بھی۔

بڑی لمبی سٹریٹ تھی۔ رنگوں اور رنگینیوں سے بھری ہوئی۔ کہیں جانوروں کے مجسمے، کہیں پولارائیڈ کیمرے والے۔

مہرالنساء کو بھی تماشے سُوجھ رہے تھے۔ ایک کارٹونسٹ کے پاس جا کھڑی ہوئی کہ اس کا کارٹون بنا دے۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور میں نے کہا بھی۔

''بس کرو۔ عمر اور وقت نے خاصا کارٹون بنا دیا ہے۔ ابھی بھی کسر باقی ہے۔''

پر نہیں جی اُس نے اپنا کارٹون بنوا کر چھوڑا۔

''ارے بھانجے، بھتیجوں کو دکھاؤں گی۔''

چندھی آنکھوں والے ایک بوڑھے سے آرٹسٹ نے جو ایزل کے سامنے کھڑا کینوس پر بُرش بھی چلاتا تھا اور لوگوں کو بھی دیکھتا تھا۔ میری توجہ اور انہماک دیکھ کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے اپنا پورٹریٹ بنوانے کے لئے کہا تھا۔

''وائے حسرت۔''

میں نے دُکھ اور تاسف سے لبالب بھری ایک آہ اندر سے نکالی۔

''چلو خوبصورت تو کبھی نہ تھے۔ ہاں نمکین سے تو تھے۔ اور اب تو وہ نمکینی بھی کہیں گھل گھلا گئی۔ تصویریں اگر ڈریکولا جیسی نہیں آتی ہیں تو جاذب نظر بھی نہیں۔ تو میرے پیارے بوڑھے میں پورٹریٹ کیسے بنواؤں۔ پیسے بھی خرچوں اور مایوس بھی ہوں۔''

بھوک زوروں پر تھی۔ بس تو ریسٹورنٹ میں گئے جہاں مزے دار شوارما کھایا۔ آئس کریم سے سویٹ ڈش کا کام لیا۔ حساب کتاب پر کھانا کچھ مہنگا بھی نہیں لگا۔

ہم چلتے تھے، رُکتے تھے۔ مرکزی اولڈ ارباط سے مختلف تاریخی گلیوں کو راستے جاتے تھے۔ یہیں کہیں ہی پُشکن کا وہ گھر تھا۔

تو پھر پوچھتے پوچھاتے ہمیں وہ گلی مل گئی جہاں گھر میوزیم بنا ہوا ہے۔

اور میں اب اُس جگہ کھڑی تھی جہاں وہ میرا من پسند شاعر پشکن نتالیا کو بیاہ کر لایا تھا۔ گھر اب میوزیم بنایا دیا گیا ہے۔ بیرونی دروازے کے ماتھے پر ٹالسٹائی گوگول اور پشکن کی تصاویر چند تصوارتی کرداروں کے ساتھ ہیں۔

سیاہ ریلنگ کے پاس چبوترے پر کھڑے جوڑے کو میں بغور دیکھتی تھی۔ اپنے لونگ سکرٹ کے پھیلاؤ کے ساتھ پشکن سے جُڑی نتالیا۔ ارباط مینشن کا یہ گھر جہاں وہ اُسے بیاہ کر لایا تھا اور جہاں اُن کا کچھ وقت گذرا تھا۔

مجھے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ ساشا، پیٹرزبرگ، ساشا کا اُسے ''کمبخت'' کہنا۔

کاش ہاتھوں میں کچھ پھول ہوتے تو اُن کے قدموں میں چڑھاتی۔

جی تو میرا چاہتا تھا کہ میں چھلانگ ماروں اور اندر چلی جاؤں۔ پر مہر النساء نے میرے ارادے بھانپتے ہوئے ڈپٹا۔

''عجیب ہو تم بھی۔ تھوڑی چیزیں ہیں دیکھنے کو۔ اور چھوڑ دو جان اب پشکن کی۔''

مرکزی شاہراہ ارباط سے ملحقہ گلیوں اور کروپوتکن تک کا جداگانہ رنگ ہے۔ رہائشی فلیٹ جو بیسویں صدی کے شروع میں بنے۔ اُن کے درمیان اُنیسویں صدی کی عمارتیں اپنے مخصوص طرز تعمیر کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ کہیں شیروں سے سجاوٹ ہے۔ تو کہیں زیبائشی ہاروں سے اور کہیں خاندانی نشان اور کہیں خاندان کے سربراہ کا مجسمہ۔ ان میں چھوٹے چھوٹے چوبی مکان بھی ہیں۔ پر وہ مکان بھی اپنی صورت سے اپنی نسبت کا تعلق بتاتے ہیں۔

یہاں کنڈرگارٹن سکول تھے۔ پولی انسٹی ٹیوٹ بھی دِکھتے تھے۔ مکمل کمرشل لائیزیشن۔ انقلاب کی بہت سی مہربانیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بالائی طبقہ جو خوف سے ملک چھوڑ گیا اُن کے گھروں پر غریبوں کا قبضہ ہو گیا۔ کچھ لوٹ مار مچی اور شرفاء کے گھروں میں حکومت نے مزدوروں اور کارکنوں کو بسایا۔ یوں سماجی زندگی کی ایک نئی صورت نے جنم لیا۔ ارباط سکایا کے

ایک طرف اگر آرکیٹیکچر ل میوزیم ہے تو دوسری جانب وہ مشہور تھیٹر ہے جسے vanhtangov کے نام پر شہرت ملی ہے۔

یہ بڑی تاریخی گلیاں تھیں۔ ہر گلی کسی نہ کسی شخصیت کے نام کا ٹھپہ لگائے اور اپنے اندر ایک داستان لئے ہوئے۔ انہی گلی محلوں سے اوستروفسکی اپنے ڈراموں کے کردار لیتا تھا۔ چیخوف کے ڈرامے یہیں سٹیج ہوتے تھے۔

یہاں میں نے لیزا و یسلے کے پردادا کا تاریخی گھر بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ پر نمبر نہیں تھا۔ دوسرے یہاں تو ایک سے ایک بڑھ کر نمونے تھے۔

یونہی گلیوں کی خجل خواری میں ٹالسٹائی سکوائر جا نکلے۔ ٹانگوں کا ملیدہ ہو گیا تھا۔ ٹالسٹائی سکوائر کا پارک اونچی اونچی عمارتوں میں گھرا ہوا تھا۔ لمبی لمبی گھاس تھی اور ویرانی بھی اُسی حساب سے تھی۔ سارے میں سنبل برف کے گالوں کی طرح اُڑتی پھر رہی تھی۔

گہری آنکھوں اور لمبی داڑھی والا ٹالسٹائی کسی گہرے استغراق میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ اُس کے قدموں میں بیٹھ کر تصویر بنوائی۔

موزے ٹالسٹائی آگے سٹریٹ میں تھا۔ اور ہماری بدقسمتی کہ وہ بند ہو گیا تھا۔ زردئی رنگت کی بلند چوبی دیوار ڈیزائن دار تھی۔ گیٹ سے اندر تانکا جھانکی کی فضول سی کوشش نے سامنے کے حصوں کے کچھ کمروں کی بیرونی جھلک دکھائی۔ بیرونی دیوار کے لوہے اور شیشوں کے شوکیسوں میں اُس کی زندگی کے مختلف انداز بڑے نمایاں تھے۔ گھوڑا گاڑی میں بیٹھا ہوا، ہاتھ میں کتاب لئے پڑھتا ہوا، بیوی کے ساتھ۔

بس وہیں گھوم پھر کر تصویروں کو دیکھتے ہوئے وار اینڈ پیس کے شہرہ آفاق خالق کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔

اب یہ کیونکر ممکن تھا کہ سوچوں کی لام ڈوریاں میرے خیالوں میں دوڑتی ہوئی نہ آتیں اور یہ سوال بار بار نہ کرتیں۔ درست۔ رُوس اور میرے ملک کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ پر لاہور کے

قدیمی گلی کوچے تو بے شمار تاریخی مشاہیر اور واقعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے گھر یا وہ بیٹھکیں جن میں اُن کا آنا جانا تھا یا وہ جگہیں جہاں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے۔ افسوس صد افسوس ہم نے کسی کو محفوظ نہیں کیا۔ ہمیں کہیں پلیٹ کوئی نشان کوئی یادگاری پلیک (Plaque) نصب کروانے کی توفیق نہ ہوئی۔ اس کی تاریخی عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ چترال میں اپنی سیاحت کے دوران شندھور جھیل سے واپسی پر میں مستوج میں رُکی۔ پتہ چلا تھا۔ پی ٹی ڈی سی یہاں بہت بڑا موٹل بنا رہی ہے۔ اگلی صبح اُسے دیکھنے گئی فی الواقع انتہائی خوبصورت اور شاندار موٹل زیرِ تعمیر تھا۔ ساتھ ہی قلعہ مستوج تھا۔ شکستہ پا قلعے کو دیکھ کر دُکھ اور یاس کی گہری کھائیوں میں گری۔ ٹوٹی پھوٹی بالکونیوں، غلام گردشوں، زنان خانوں، دیوان عام وخاص جیسے طرزِ تعمیر والے شاندار تاریخی ورثے کو لیر لیر ہوتے ہوئے دیکھ کر میں نے ملازموں سے پوچھا۔

اُن کے وارثوں میں سے کسی کو خیال نہیں کہ کل جب سیاح یہاں آئیں گے تو کوئی تاریخی چیز بھی اُن کی تسکین طبع کے لئے چاہیے۔

اور پتہ چلا تھا کہ انہوں نے چترال شہر میں بڑے بڑے ہوٹل بنائے ہیں پر آباؤ اجداد کے اس محل کو محفوظ کرنے پر ٹکا خرچ کرنا پسند نہیں کیا۔ سوائے ہنزہ کے پورے شمالی علاقہ جات میں یہی حال ہے۔

کل کی نسل کے لئے کونسا ثقافتی ورثہ ہمارے پاس رہے گا۔

باب

38

پیٹرزدی گریٹ کی یادگار • تھائی لینڈ کی نیڈ(Nade)

Помятник Вилики Пётера.

شام تو جانے کب ہونی تھی۔ پر پھر بھی سورج کی وہ سوا نیزے والی کیفیت ماند پڑی ہوئی تھی۔ ماسکو چرچوں اور کیتھڈرلوں کے معاملے میں کُفیل ہی نہیں مالا مال ہے۔ استنبول کی طرح کہ جس کے ہر گلی کوچے میں ایک عدد تاریخی مسجد اپنی رنگا رنگی کے ساتھ برآمد ہوتی ہے۔

تو صبح یہاں پولیس کا پہرہ تھا اور اندر عبادت ہوتی ہے۔ اِس وقت یہ بند تھا۔ ہم اُس کی عقبی سمت آئے جہاں یہ ایک خوبصورت پُل کے ساتھ دریائے ماسکو سے ملا ہوا ہے۔ کیمنی موسٹ (Kamenny Most) کی بھی کیا شان تھی۔ آہنی ریلنگ اُس کے محرابی پشتے، اس پر کھڑے سروِ چراغ، چرچ کے سینے میں اُترتی اُس کی سیڑھیاں۔

تھوڑی سی مختصر سی تاریخ اِس کیتھڈرل کی یہی ہے کہ یہ اُس عظیم فتح کی یاد میں بنایا گیا تھا جو 1812ء میں روسی افواج کو نپولین پر حاصل ہوئی تھی۔ اس کا طرزِ تعمیر بھی میخائل کا مرہون ہے کہ جس نے کریملن کا شہرہ آفاق کیتھڈرل ڈورمیشن (Dormition) بنایا تھا۔

ایک اور کہانی بھی سننے کو ملی تھی کہ یہ بیچارہ تو کیمونسٹ دور میں شہید ہو گیا تھا۔ پھر جب مذہب لوگوں کے دلوں میں کہیں اونگھتا سوتا بیدار رہا تو اُس کی تعمیر کا بھی سوچا گیا۔ یہ اور بات ہے

کہ تعمیر میں ہیرا پھیری بھی ہوگئی کہ گنبدوں کو دیکھنے سے اُن کا رنگ سنہری نہیں بلکہ قدرے سرخی مائل نظر آتا ہے۔ یار لوگوں نے خالص سونے میں تولے کے حساب ماشے کی کھوٹ کی بجائے تین چار ماشوں کا اضافہ کر دیا ہوگا۔

شام کی پھبن اپنے عروج پر تھی۔ دریائے ماسکو کے ہلکورے کھاتے پانیوں میں کھڑی وہ پیٹر کی یادگار عین اُس کے سامنے دھرے بینچوں پر ہمارا بیٹھا ہونا اور کافی کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیتے ہوئے اپنے سامنے اور دائیں بائیں عمارتوں کے حُسن کو دیکھنا واللہ کس قدر روح میں اُتر جانے والا تصوراتی پر حقیقی منظر تھا۔

کوئی 200 فٹ اونچی یہ یادگار اپنی صورت میں بڑی منفرد سی ہے۔ زمینی کشتی کی گود میں سے اوپر تلے کی تین کشتیوں پر ٹکی بڑی کشتی میں پیٹر اعظم کسی بحری جہاز کے کپتان کی مانند کھڑا نظر آتا ہے۔ بادبان اور مستول دونوں بناوٹ کے اعتبار سے لاجواب ہیں۔ کشتیوں پر لہراتے جھنڈے جیسے فتح کے پھریرے ہیں۔ پیٹر دی گریٹ نے جہاز سازی کی باقاعدہ تربیت انگلینڈ سے حاصل کی تھی اور وہ بہت عمدہ کشتیاں بناتا تھا۔ یہ یادگار اُس کی اِس خوبی کی عکاس ہے۔

دریائے ماسکو یہاں خم کھاتا کم چوڑے پاٹ کی صورت بہتا ہے۔

ہواؤں میں خنکی تھی۔ عقب میں درختوں کا ذخیرہ تھا۔ یادگار کو دیکھتے باتیں کرتے ہواؤں کو اپنے رخساروں پر لیتے ہوئے ہم نے ایک بار بھی نہیں چاہا کہ ذرا اُٹھیں اور اُس محرابی پل جو دریا کے پانیوں کو تقسیم کرتا یادگار تک جاتا ہے پر چہل قدمی کریں اور کوئی تصویر بھی بنائیں۔ بہت تھکے ہوئے تھے اور میں تو باقاعدہ بینچ پر لم لیٹ بھی ہوگئی تھی۔

مہر النساء بھوک کے ہاتھوں مری جا رہی تھی۔ زبردستی اُٹھا کر قریبی ریسٹورنٹ پر لے گئی۔ سلاد لیا۔ کس قدر ذائقہ دار سلاد تھا، ہمارے ہاں کے رائج رشیئن سلادوں سے بہت مختلف۔ ہمس (Hummus) پاستا لیا اور سوپ۔ پاستا بھی مزے کا تھا۔ پر سُوپ پر تو پیسے روڑ دیئے تھے۔

چلو چنگے مندے سے پاپی پیٹ بھرا۔ کچھ نڈھالی اور تھکن میں کمی آئی پر میں نے مزید چلنے سے

روسی فن کا شاہکار

200 فٹ اونچی یہ کشتی پیٹر دی گریٹ کی تخلیق

◀ لیوٹالسٹائی کا مجسمہ۔ مصنفہ اور مہرالنساء

انکار کردیا اور جا کر اُسی بینچ پر پھر لیٹ گئی۔ مصر میں اگر مسجدوں میں خواتین کے حصوں کو ہم ریٹائرنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے تو یہاں خیر سے اوپن ریٹائرنگ روم کے مزے لوٹتے تھے۔ مجھے تو سچی بات ہے ذرا لم لیٹ ہونے میں جھجھک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دھڑلے سے آرام کرتی تھی۔

کیا کرتے بھئی۔ بڑھاپے کی مجبوری تھی۔

واپسی کے لئے میٹرو سٹیشن۔ ولادی کنوو۔ سہد (Valadykino voshod) تھا۔ کمبخت نام بھی بڑا کنفیوژن پیدا کرتے تھے۔ ہر روز نئے نئے ناموں والی حسیناؤں سے شناسائی کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب دعائیں مانگتے تھے کہ مولا بھولے بھٹکیں نہ۔ ہمت نہیں ہے۔

ہماری اولین کوشش گاڑی میں داخل ہونے کے ساتھ خالی سیٹ حاصل کرنے کے لئے ہوتی تھی۔ پر مصیبت ہمارا جانا آنا بھی رَش کے اوقات میں ہی ہوتا۔

کسی شکاری کی طرح ہماری گرسنہ آنکھیں خالی سیٹ کے لئے اِدھر اُدھر بھاگی پھرتیں۔ ٹرین کسی سٹیشن پر رُکتی۔ بیس گز پرے بھی مجھے کسی سیٹ کے ملنے کا یقین ہوتا تو میں شکرے کی طرح اُس پر لپکتی۔ خدا کا شکر تھا کہ بھولے نہیں۔ صحیح سٹیشن پر اُتر آئے۔ پر اب مزید چلنا بڑا دُشوار تھا۔ ٹیکسی کا پوچھا۔ دو سو روبل کا سن کر کہنا پڑا۔

''کچھ خوف خدا کرو۔''

جواب ملا۔

''پیوٹن کو چٹھی لکھو وہ مہنگائی کم کرے۔''

میں نے طنزیہ انداز میں اُسے گھورا۔

''لواُلٹے بانس بریلی کو۔ سن لو ذرا اُن کی۔ چٹھیاں لکھیں ہم۔ کیوں صدر ہے ناوہ ہمارا۔''

میاں ہم کون؟ تین میں نہ تیرہ میں۔ بہرحال سو روبل پر منایا۔ مہرالنساء بضد تھی کہ پیدل چلو۔ مجھے غصہ آیا۔

اگر چلنے میں ابھی کسر باقی رہ گئی ہے تو تم اپنا شوق پورا کرلو۔ میں نے ٹیکسی میں ہی جانا

ہے۔ پتہ نہیں کیسے بیٹھی؟

بہر حال جونہی مین گیٹ پر اُترے۔ ایک دُبلی پتلی چینی جاپانیوں کے نقش والی لڑکی کو جو اپنے قد سے بڑے اٹیچی کیسوں کو دروازے سے باہر لانے کی کوشش میں غالباً پاؤں رپٹ جانے پر موندھے منہ پڑی تھی کو دیکھا۔ فوراً بھاگے۔ اُسے سیدھا کیا۔ رخسار کی ہڈی پر چوٹ آئی تھی۔ داہنا ہاتھ بھی دباؤ کی وجہ سے سیدھا نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے فوراً بیگ کھولا۔ پولی فیکس نکالی۔ ہاتھ پر لگائی۔ مالش کی۔ رخسار پر پولے پولے ہاتھوں سے مساج کیا۔

یہ تھائی لینڈ کی Nade تھی۔ مُنی سے قامت پر لڑکی سی دِکھتی تھی۔ پر لڑکی نہیں عورت تھی۔ امریکہ کی پیس کور کے تحت مہینہ بھر یہاں قیام کے بعد اب افریقہ جا رہی تھی۔

''یہاں کے لوگ۔''

اُس نے دل پر ہاتھ رکھا۔ اور بولی۔

''اندر سے ٹھنڈے برف ہیں۔ تم لوگ دیکھو کوئی آیا۔ کسی نے پوچھا؟ شیشوں میں سے سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔''

ہم لوگوں نے اُس کا سامان ٹیکسی میں رکھوایا۔ اُس کا ایڈریس لیا۔ اُس نے بتایا کہ ایک پاکستانی میجر علی سے اُس کی چیٹنگ ہوتی رہتی ہے۔ نیڈ کا ای میل ایڈریس بھی لیا۔

اور جب ہم اُسے رُخصت کر کے اندر آئے۔ ریسپشن پر بیٹھی عورتوں نے ہمیں بہت گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

''لعنت ہے تم پر۔ شیشے میں سے تماشا دیکھ رہی تھیں۔ پاؤں کیا ٹوٹ جاتے اور زبان کیا گھس جاتی اگر جا کر اُس کا احوال پوچھ لیتیں؟ گذشتہ ایک ماہ سے وہ بیچاری یہاں رہ رہی تھی۔''

ایک پل کے لئے میرا جی چاہا کہ یہ جو کچھ میرے دل میں ہے اسے جا کر انہیں سنا کر آؤں۔ پھر سوچا۔ دفع کرو۔

باب

39

چھڈو جی...... تاریخ نوں تے پراں کرو

سماں ہے سہانا • دل گائے ہے دوگانا

Апусти, Откладии Историю. Прикрсни Час.
Сердца Исполнят Песния

اب کیسے نہ کہوں کہ ہم تو کہیں اللہ میاں کے پچھواڑے سے بھی پرے کسی آخری جہاں کے کونے کونچے میں پڑے تھے۔ ماسکو نے اپنے دل (کریملن) سے چکروں کا جو سلسلہ شروع کیا۔ تو نہ پاؤں تک تھمنے کا نام، نہ سر تک قرار۔ پھر سوچا چلو اب رُکوں اور سُورج جیسی صورت کا روپ دھاروں۔

آخری گول اور بڑا چکر جو شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب کی گولائی میں کئی ناموں سے مشہور ہے۔ شمال میں اگر سدووایا ہے تو جنوب میں کرمسکائے۔ کرسنا کولمسکائے زوبوسکائے جنوب مغرب میں سمولنسکائے اور مشرق میں زیملایانوئے۔ مرکز سے پھوٹتی اردگرد شاہراؤں کی کرنیں اپنے آخری دائرے کا سینہ چیرتی جھلملاتی دُور تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔

بیچارے سروے کرنے والے بھی کیا کرتے۔ چاروں کھونٹ غل غپاڑہ مچاتی یہ رُکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ کسی طمع خور کی طمع کی طرح پھیلتی ہی چلی جاتی تھیں۔ انہیں بہتیرا قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ پھر شاید تھک ہار کر ہاتھ اُٹھا دیئے کہ دفع کرو گولی مارو انہیں۔ نہیں کسی حد بندی

میں آتی ہیں تو نہ آئیں۔ ارے بھاڑ میں جائیں۔

بس تو کہنے میں کیا شرم اور کیا عار؟ اب چھوٹا نقشہ کھولتی ہوں۔ یہ ہم کہاں ہیں؟ کہیں بھی نہیں۔ بڑا کھولتی ہوں۔ وہاں بھی غائب ہیں۔

یہ بھی مقام شکر تھا کہ میٹرو پر تھے۔ وہاں اگر نہ ہوتے تو پھر سیاپا پڑ جانا تھا۔

اب VDNKH دیکھنے جانا تھا۔ اور ولادی کنو (Vladykino) سے وہ دو انگل سے بھی کم کے متوازی فاصلے پر تھا۔

ایک ہزار روبل۔ ٹیکسی والے نے بے شرمی اور ڈھٹائی سے منہ پھاڑا۔

بحث کس سے کرتے۔ نہ وہ ہمیں سمجھتا تھا اور نہ ہم اُسے۔

''چلو چھوڑو۔ میٹرو پر بیٹھو۔'' میں نے کہا۔

الحمد للہ! ماسکو میٹرو اور شہر کے نقشوں کو سمجھنے میں میری قابلیت عام رُوسیوں سے بڑھ گئی تھی۔ نت نئے طریقے بھی مجھے خوب سوجھتے تھے۔ بڑے سے کاغذ پر اپنی جار جیائی سہیلی یا ہوٹل کی ہماری سائڈ کی نگران جو عام روسیوں کے برعکس بہت میٹھی سی تھی، سے لکھوا کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور ضرورت کے تحت اس کی نمائش کرتے۔

Vdnkh نمائش کمپلیکس ہے جو پہلے Exhibtion of national Ecomonic Achievements تھا۔

سچی بات ہے میں تو یہاں آنے کے لئے کچھ اتنی رضا مند نہ تھی پر مہر النساء بضد تھی۔

صرف 38 روبل میں جب تین گاڑیاں سٹیشن بدل کر مطلوبہ جگہ پہنچے تو مسرت دیدنی تھی۔

برووٹسکایا سے گاڑی بدلی۔ Chistye Prudy پر پھر بدلی اور پھر سیدھی Vdnkh۔ واہ مزہ آ گیا۔

پہلے تو داخلی گذرگاہ ہی بڑی منفرد تھی۔ چوکور ستونوں پر بے در و دیوار ایک انتہائی جاذب نظر راہداری جس کی چھت کے بالائی حصے پر ایک مرد اور عورت گندم کا پولا ہاتھوں میں لہراتے

کسی زمانے کے سوویت کا تصورِ کارکن اور اجتماعی پیداوار کے خیال کی عکاسی کرتے تھے۔

اگلے مناظر بہشت بریں جیسے تھے۔شاید اسی لئے بے اختیاری یہ فقرے ہونٹوں پر آ گئے تھے۔

ربّا انسان کی تخلیق کا یہ عالم ہے تو تیری بہشت کیسی ہوگی؟ یہاں تو میں گھس آئی ہوں۔ وہاں کیا بنے گا۔میرے پلّے تو ٹکا بھی نہیں۔اور تو بھی کیسا حساب دان ہے۔میزان تیار کئے بیٹھا ہے اور بار بار کہتا ہے کہ کبھی کچھ پلڑوں میں ڈلے گا۔آ ؤ تو سہی۔سامنا کرنا پڑے گا۔تو بھئی پھر میں کیا کروں،ڈال دینا اُٹھا کر آگ میں۔

کشادہ راستے،سرسبز لان۔صنوبر کے درخت۔چاندی لٹاتے فوارے۔پہلے پولیین میں پتھروں کی ستون فلاور فاؤنٹین بھی دیکھنے کی چیز تھی۔اتنی رنگا رنگی کہ جسے دیکھ کر آنکھوں اور چہرے پر بچوں جیسی مسرت کا اظہار ہو۔اور آگے جا کر تو گویا فردوس بریں کا نظارہ تھا۔فرینڈ شپ آف پیپل فاؤنٹین پر طلائی پیرہنوں میں حوارن ارضی گرینائٹ کے سٹائلش گول چبوتروں پر کھڑی وجد رقص میں تھیں۔کہیں انگوروں کے گچھے کہیں اُن کی بیلیں دامنوں سے لپٹی ہوئیں۔ ہاتھوں میں خوشے۔کہیں سٹے،کہیں پھل،کہیں سبزیاں۔یہ تو فواروں کا جہاں تھا۔

یہاں سرخ پھول گھرے سبز پتوں میں سے جھانکتے دل رُبائی کی تصویر نظر آتے تھے۔ صنوبر کے درختوں کی اوپر نیچے تہوں کا حُسن اور چاروں طرف اُن کا حصار اور مسکراتے ہنستے چُہلیں کرتے لوگ جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھاتے تھے۔میٹھی میٹھی دھوپ سینکتے تھے۔

اور جب میں تالاب کے نیلے پانیوں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''ارے یہاں مجھے تاریخ کے پٹارے کو ہرگز نہیں کھولنا۔مٹی پاؤ اُس پر۔''

یہاں کاروباری نمائش لگتی تھیں۔لگتی ہوں گی۔ مجھے کیا۔یہ پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے۔ مجھے کوئی غرض نہیں۔بس میری رُوح تک نے یہاں آ کر سرشاری محسوس کی ہے اور میں نے ڈھیر سارا وقت گذارنا ہے ادھر۔

چھڈو جی تاریخ نوں تے پراں کرو

کیسا سماں ہے سہانا

دل گائے ہے دو گانہ

جسم مانگے ہے سُرور

چھڈو جی تاریخ نوں تے پراں کرو

اب یہ $267200m^2$ سکیئر پر پھیلے ہوئے رقبے پر اگر فزکس، کیمیکل انڈسٹری، ٹرانسپورٹ اور ایسے ہی بہتر 72 شعبوں کے پویلین موجود ہیں تو میں کیا کروں؟ مرکزی پویلین کے فواروں اور پھول پتوں سے منہ موڑ کر میں آگے گئی تو مجھے دائیں بائیں عمارتوں کا جہان نظر آیا ہے۔

عمارتوں سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہاں یہ ماسکو کا بہترین پارک زون ہے۔ ہریالیوں اور فواروں سے لدا پھندا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے ان سے لطف اُٹھاتے ہوئے اب کچھ کھانے کی بھی طلب تھی۔

کیفے بڑے خوبصورت تھے۔ شیشوں میں سجی بہت سی چیزیں نظر آئی تھیں۔ ہم نے پائیز Pies لیں۔ ہمارے ہاں کی پیٹز سے ملتی جلتی۔ فش والی بھی اور فروٹ والی بھی۔ چائے کے ساتھ یہ لنچ مزے کا تھا۔

اب سرکلر سینما پینوراما کے بارے میں تو اُس وقت پتہ چلا جب واپس جا رہے تھے۔ اور چند انڈین اپنی فیملیز کے ساتھ ہم سے ٹکرائے تھے۔ اپنے لوگوں سے ملاقات نے شام اور ماحول کی رنگینی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

اس سینما کے متعلق انہوں نے اتنا کچھ بتایا تھا کہ چند لمحوں کے لئے افسوس ہوا کہ کیا تھا۔ دیکھ لیتے۔ پر پتہ نہیں آج میں کس موڈ میں تھی۔

باب
40

کارل مارکس • صاحب سرمایہ ازنسلِ خلیل • بالشوئی تھیٹر
تیرے سمنے بہیناں تے دُکھ تینوں نہیں دسنا
دُنیا کے خوبصورت ترین میٹرو سٹیشن

Карл Маркс Господски от Рода Халила,
Блшой Театр, Пословися Для Сёстре, Что
Я Тебе Страдание Не Раскажу.
Самой Красивой Метро Вокзали В Мире

دنیا کی کوئی میٹرو (زیرزمین ریلوے) اس درجہ پُرشکوہ، خوبصورت اور شاندار نہیں ہو سکتی جتنی رُوس کی ہے۔ ماسکو کے زیرزمین محلات، سچ تو یہ ہے کہ نہ شہر کی سیاحت اُس کے بغیر مکمل اور نہ اُس کے تذکرے کے بغیر شہر کا احوال۔

انتونینا نے میرے میٹرو گائیڈ میپ پر کوئی سات سٹیشنوں پر نشان لگائے۔ مجھ سے پڑھائے اور پھر کہا بھی۔

''ان میں سے کچھ تو تم دیکھ چکی ہو پر میرا کہنا ہے کہ سبھوں کو دوبارہ دیکھو۔ کوئی بھی آدھا پون دن اس کے لئے مخصوص کرلو۔

انتونینا کے پاس تقابلی جائزہ تھا۔ وہ سارا مغربی یورپ کئی بار گھوم پھر چکی تھی۔ میرے ہاں ایسا نہیں تھا پر وہ جو کہتے ہیں کہ کھوڑی چڑھے نیں تے چڑھدے وی نہیں ویکھے (یعنی اگر گھوڑی چڑھے نہیں تو چڑھتے بھی نہیں دیکھے) میں گئی نہیں پر پڑھا تو ہے اور اس میں رتی برابر مبالغہ نہیں تھا۔

ہم تو بچوں جیسے کھیل تماشے کرتی تھیں۔ چوٹوں (ہچکولوں) کے چسکے لیتی تھیں۔ صبح تو اکثر یوں ہوتا تین چار سٹاپ آگے نکل جاتیں۔ پھر دوسری لائن پر جا کھڑی ہوتیں۔ اور جب مطلوبہ جگہ اُترتیں تو کھلکھلا کر ہنستیں۔

میں نے اپنی بچگانہ حرکتوں سے انتونینا کو بتایا تو وہ بھی ہنسی۔

''بندہ جب سیر سپاٹے کے لئے نکلتا ہے تو ایسا ہی کرتا ہے اور ایسے ہی کرنا چاہیے۔''

تو پھر یہ طے تھا کہ کل میٹرو سے قدرے تفصیلی متعارف ہونا ہے۔

اور جب ہم اپنے اُس اکلوتے چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں اپنی پسندیدہ جارجیائی زنسکایا کے ہاتھوں بنا ہوا ناشتہ کرنے کے بعد مارکیٹ کے گول چکر پر آ کر بیٹھے۔ فضاء میں مدھم سی دھوپ کے ساتھ کسی پُرسوز آواز کا رچاؤ تھا۔ کونسی زبان تھی، اللہ جانے پر آواز میں جو اُداسی تھی وہ زبان سے لاعلمی کے باوجود محسوس ہوتی تھی۔

دفعتاً مہر النساء نے کہا۔

''ہمیں سب سے پہلے کہاں جانا ہے؟ یہ ہماری مشاوراتی جگہ تھی۔ یہاں ہم دھوپ سینکتے، کاہلی سے اپنے اردگرد آتے جاتے چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھتے اور فیصلہ کرتے۔

میں نے بیگ سے نقشہ نکالا۔ نشان زدہ ناموں کو گنا اور بتایا کہ آٹھ جگہیں ہیں۔ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔

''تو چلو قرعہ سے فیصلہ ہوتا ہے۔''

بڑا دلچسپ مشغلہ ہاتھ لگا تھا۔ کاپی سے ورق پھاڑ کر پرچیاں بنائیں۔ نام لکھے اور انہیں

ہوا میں اُچھال کر اپنے سامنے ڈھیر کر لیا۔

''اُٹھاؤ۔''میں نے مہرالنساء سے کہا۔

اُس نے کھولی اور پڑھا۔

Ploshchad Revolyutsii

وہ ہنستے ہوئے اپنے بچپن کو یاد کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ آٹھوں بار یہ عمل دہرایا جائے۔ پرنقش اُس کے سامنے رکھتے ہوئے میں ہنسی۔

''لو تیرے نمبر 2 نے اگر اگلی جگہ پچھم میں نکال دی اور تیسری دکن میں۔ دن تو ایسے ہی گل ہو گیا نا۔

چل اُٹھ۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔ دیہاڑی پر نکلیں۔''

کمال تھا۔ یہ میٹرو سٹیشن تھا یا کسی عظیم میوزیم کا آرٹ پویلین۔ پوری دیوار دو طرفہ محرابی دروازوں کے کونوں میں بیٹھے، کھڑے بندوقیں ہاتھوں میں تھامے انقلابی مردوں، عورتوں، مفکروں، شاعروں سے بجی تھیں۔ کمال کی فنکاری تھی۔ شینڈ لیرز بھی انوکھی وضع کے تھے۔ اور طویل کشادہ برآمدہ نیچے اُترنے والے راستوں کے ساتھ اس قدر خوبصورت اور روشن تھا کہ زیر زمین کے گمان کا اندازہ محال تھا۔

باہر نکلے اور انقلابی چوک کے متھے لگے۔

انیسویں صدی میں ماسکو صنعتی شہر بن چکا تھا۔ ٹیکسٹائل اور دوسری صنعتوں کی بھاری انڈسٹری تھی یہاں۔ مزدوروں کی حق تلفی بھی اُسی حساب سے تھی۔

تو یہی وہ چوک ہے جہاں 1905ء کے پہلے روسی انقلاب کا آغاز ہوا۔ مزدوروں نے سڑکوں پر مورچے کھڑے کئے اور زبردست لڑائی لڑی۔

اور جب گھومتے پھرتے تھے تو کارل مارکس کا قد آدم مجسمہ نظر آیا۔ کس مہارت کس نفاست سے اسے تراشا گیا تھا۔ مجھے اپنا بچپن یاد آیا تھا۔ گرمیوں کی شامیں یاد آئی تھیں۔ وہ

چھت یادداشتوں میں اُبھری تھی جس پر قطار در قطار چارپائیوں پر بیٹھی میری چھوٹی خالہ کی کلاس فیلوز ہمارے عالم فاضل خالو سے ''داس کیپٹل'' میں سے نکلتے نقطوں کا اسلام کے ساتھ موازنہ سن رہی ہوتیں۔

اور پھولوں میں گھرا، فرغل نما کوٹ میں لپٹا، دنیا کو ایک فکر اور تحریک دینے والا۔ اقبال جیسا مردِ مومن کس انداز میں کتاب اور صاحبِ کتاب کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔

صاحبِ ''سرمایہ'' از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

''داس کیپٹل'' یعنی ''سرمایہ'' جیسی کتاب لکھنے والا ابراہیم خلیل اللہ کی نسل سے تھا مراد بنی اسرائیل سے تھا۔ وہ ایک ایسا پیغمبر تھا جس پر جبرائیل نہیں نازل ہوا تھا۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

اں کلیم بے تجلی، آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

وہ موسیٰ کلیم اللہ تھا مگر تجلّیات سے محروم۔ وہ عیسیٰ تھا مگر مصلوب نہیں ہوا۔ وہ پیغمبر نہیں تھا مگر اُس کی بغل میں کتاب تھی۔

کہا جاتا ہے کہ مارکس کا یہ مجسمہ گرینائیٹ کے ایک بہت بڑے ٹکڑے کو تراش کر بنایا گیا ہے۔

اب سوچتے تھے کہ پھر میٹرو میں گھسیں اور دوسرے نمبر کا حُسن دیکھیں۔ پر اب تو باہر آ گئے تھے اور باہر کیا کم حُسن تھا۔

شاہراؤں کی سیاہی، صفائی ستھرائی، چوڑائی اور لمبائی آنکھوں کو بھلی لگتی تھی۔ رنگا رنگ پھولوں کی کیاریوں، کھٹے اور سیب کے درختوں سُرخ پتھر کے فوارے سے نکلتی پانی کی دھاروں

اور جا بجا سنگی بینچوں پر بیٹھے لوگوں نے چوک کے حُسن کو دو بالا کر رکھا تھا۔

یہاں لینن میوزیم کی شاندار عمارت تھی۔

یہاں ذرا بھاری بھرکم قسم کا اختلاف رائے ہو گیا۔ میں میوزیم کے اندر جا کر اور مہر النساء اُسے باہر ہی سے سلام کر کے آگے بڑھنے کی خواہشمند تھی۔

طے ہوا کہ میں اندر جاؤں گی اور ڈیڑھ گھنٹہ بعد نکل آؤں گی اور وہ چاہے ونڈو شاپنگ کرے اور چاہے خریداری۔ ملاقات یہیں ہو گی۔

اور اندر جاتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔

''صرف ڈیڑھ گھنٹہ میرا تو حلق تالو بھی گیلا نہیں ہو گا۔''

پھر سوچا چلو جو مل رہا ہے اُسے تو غنیمت سمجھو۔

تو اِن تیس ہالوں میں اُس کی زندگی کا ہر باب رقم تھا۔ جو کچھ تھا وہ اُس سچے نظریاتی لیڈر کی زندگی کا عکاس تھا۔ اُس کی کتابیں، مسودے، مضامین، تصانیف، اُس کی بچپن کی چیزیں، کتابیں، کاپیاں، کپڑے، برتن بھانڈے وہ کرسی جس پر وہ اپنی بیماری کے آخری دنوں میں بیٹھتا تھا۔ وہ کوٹ بھی جس پر گولیوں کے نشان تھے اور جسے کروپسکایا نے اپنے ہاتھوں سے رفو کیا تھا۔

اور اُس وقت میں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی کہ ہم پاکستانی بھی کس قدر جذباتی اور بے عمل قوم ہیں۔ میں ہزار بار چاہنے کے بھی میوروڈ کے اُس میوزیم میں نہیں گئی جو علامہ محمد اقبال شاعر مشرق کا گھر تھا۔ جہاں وہ رہے اور جہاں فوت ہوئے۔ کراچی گئی تو قائداعظم سے متعلق کوئی میوزیم ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی، جہاں میرے اُس لیڈر کے بارے میں سب کچھ محفوظ ہوتا۔ میں کراچی کے لائٹ ہاؤس ایریا میں ضرور جا گھسی تھی اور پورا دن وہاں گال آئی تھی اور اپنے ساتھ میموں کی اُترن کی پنڈ بھی اُٹھا لائی تھی۔

میں ابھی باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ پر کیا کرتی۔ میرا خیال نہیں یقین تھا کہ دو ڈھائی گھنٹے تو

ضرور ہوگئے ہوں گے۔

خدا کا شکر تھا وہ فوراً میری بصارت میں آ گئی۔ اُس کے پاس رشین سلاد تھا۔ سیب تھے۔ وہ وہیں کہیں بیٹھ کر کھانے پر مُصر تھی کہ فضول کا پٹارہ اُٹھا کر کیوں گھومیں۔ میں نقشے کو دیکھتے ہوئے کہتی تھی۔

''تھوڑا سا ذرا آگے تھیٹر سکوائیر ہے۔ اس کی سیدھ میں ہی بالشوئی تھیٹر بھی ہے۔ اُدھر کا رنگ ڈھنگ بھی دیکھیں گے اور منہ بھی چلائیں گے، مزہ آئے گا۔

سارا راستہ مجھے اپنی نظر بازی کے ہاتھوں ڈر ہی لگا رہا کہ کہیں میں مونڈھے منہ نہ گر پڑوں۔

رُوسیوں کی سرد مہری کے ہم بھی اب عادی ہو رہے تھے۔ پوچھنے پر اگر کوئی مہربانی نہ کرتا تو اسے معمول کا حصہ ہی سمجھتے ایسے ہی ملُول اور دُکھی ہونا چھوڑ دیا تھا۔

میٹرو پول ہوٹل کی بھی کوئی شان تھی۔ کشادہ سڑک کو پار کیا اور تھیٹر سکوائیر میں عین فواروں کے سامنے جھاڑیوں کے پاس نشستیں سنبھال کر پٹارے کھول لئے۔

چمچ منہ میں گیا اور شریر سُرور میں بہہ گیا اور میں نے صرف اور صرف لمحہ موجود میں جھانکا جہاں دھوپ ٹھنڈی ہواؤں کے سنگ سنگ چمکتی تھی اور جہاں ہیرا منڈی بازار کی ہر ہر بالکونی میں کھڑی طوائف اپنے منہ متھے پر آرٹ کی فنکاریوں کا میک اپ کئے لُبھاتی اور پرچاتی تھیں۔

بنفشہ کی جھاڑیوں سے پھول گرتے تھے اور فواروں کے منہ موتی اُگلتے تھے اور خوبصورت لوگ اپنی اپنی دنیا میں مست تھے۔

''ساری عمر بتا دوں۔''

پتہ نہیں کہاں سے گیت ہونٹوں پر آ گیا تھا۔

ماحول کی مستی نے جیسے مجھے ٹوٹے پھوٹے مصرعے گھڑنے پر مائل کر لیا تھا کہ خوبصورت شاعری کرنا تو مجھے نصیب نہ ہوا تھا۔

فنکاروں کا دیکھو کمال یہاں

حسیناؤں کا ہے راج یہاں

یہ دنیا مست البیلوں کی

من موجی رنگین ٹولوں کی

یہاں ساری عمر بتا دوں

مہرالنساء ہنستے ہوئے بولی تھی۔

''بڑا شوق ہے تمہیں یہاں زندگی بتانے کا۔شہر میں تو اس خواہش کی تکمیل ناممکن۔ ہاں البتہ ماسکو کے بندی خانے (جیل) تمہارا شوق حُسن وخوبصورتی سے پورا کر سکتے ہیں۔''

''کمبخت تیرے بن کیسے؟''

جب ہم بالشوئی تھیٹر کے عین سامنے پھولوں کی کیاریوں سے ملحقہ وسط میں سے خم کھاتی سنگی سلیب پر بیٹھے تو میرے ہونٹوں پر اس گیت کا یہ ٹکڑا رقص کرنے لگا تھا۔

''تیرے سمنے بہنیاں تے دُکھ تینوں نئی دسنا''

(تیرے سامنے بیٹھنا بھی ہے اور دُکھ بھی تجھے نہیں بتانا)

ماحول نے طبیعت میں چونچالی اور شوخ رنگی پیدا کر دی تھی۔ بات بات پر شعر یاد آنے لگے تھے۔

اس اتنے گلے شکوے سے لبالب بھرے مصرعے کے یاد آنے کی کیا تک تھی۔

اب میں ایسی بھی بھولی معصوم چوچی بنو نہیں تھی کہ اس ایکا ایکی نزول کا مقصد نہ جان پاتی۔

بالشوئی تھیٹر کے دروازے مجھ پر بند تھے۔ یہ میرے جیسے سبھوں ماٹھے اور مٹ پونجیوں پر

بند تھے۔ اگر کھلتے تھے تو بڑوں پر۔

پر بات تو ظرف اور حوصلے کی تھی کہ چلو لاکھ تہی دامن تھے۔ پر آرٹ اور فن کے قدر دان تو تھے۔ یہاں دکھائے جانے والے کمپنی کے بہترین اوپیرا The fountain of Bakchisarai پر اپنے سارے ڈالر لٹا سکتی تھی۔

تا تاریوں کے عروج وزوال، شہزادی ماریا، زریمہ اور حرم کی زندگی کے اصل رنگوں کو دیکھنے کے لئے تو کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔

بالشوئی تھیٹر کی صورت بھی کیا تھی۔ مبالغے اور چیزوں کو بڑھا چڑھا کر لکھنے والی تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ رُوسی طرز تعمیر اپنی بہترین صورت کے ساتھ یہاں نظر آ رہا تھا۔ کلاسیکی طرز کے سفید ستونوں کے سروں پر مثلث نما روکار پر دھری گاڑی میں اپالو کے گھوڑے جُتے ہوئے ہیں۔

اس کا اندر کا حُسن میں نے انتونینا کے گھر میں دیکھا تھا۔ سجاوٹ اور فنکاری کا وہ عالم تھا کہ تصویریں گنگ کئے دیتی تھیں۔ خدا گواہ ہے اگر میں اندر چلی جاتی تو غلغا سُنگھانے کی نوبت آ جاتی تھی۔ تصویروں میں وہ جمال اور سُرخ رنگ کا وہ جلال تھا کہ میں سوچتی چلی جاتی تھی کہ واللہ جب اس کی ہوشربا سٹیج پر اپنے اپنے وقتوں کے حقیقی یا تخیلی شہرہ آفاق کردار جو کسی نہ کسی حوالے سے ادبی یا ثقافتی تاریخ میں محفوظ ہیں اور جنہیں تہذیب وثقافت کا پیرہن پہنا کر زندہ کیا جاتا ہے، ناظرین کے قلب ونظر پر کس کس انداز میں بجلیاں گراتے ہوں گے؟

اگر مجھ جیسی ٹٹ پونجی تا تاریوں کی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں دیکھنے کے لئے مری جاتی ہے تو پھر رومیو اینڈ جیولٹ، اوتھیلو، وار اینڈ پیس، دی سلیپنگ بیوٹی (The Sleeping Beauty) کو بھی دیکھنے والے جنونیوں کی کیا کمی ہے۔

اب ملک کے نامور گائیک، نامور ڈانسرز، نامور ایکٹرز، یہاں بالشوئی میں کام نہیں کریں گے تو کہاں کریں گے۔ دونوں ایک دوسرے کو نام دینے، بڑھاوا دینے اور ممتاز کرنے میں لازم وملزوم ہیں۔

rapid transit system of Moscow

زیرِ زمین میٹرو کا نقشہ
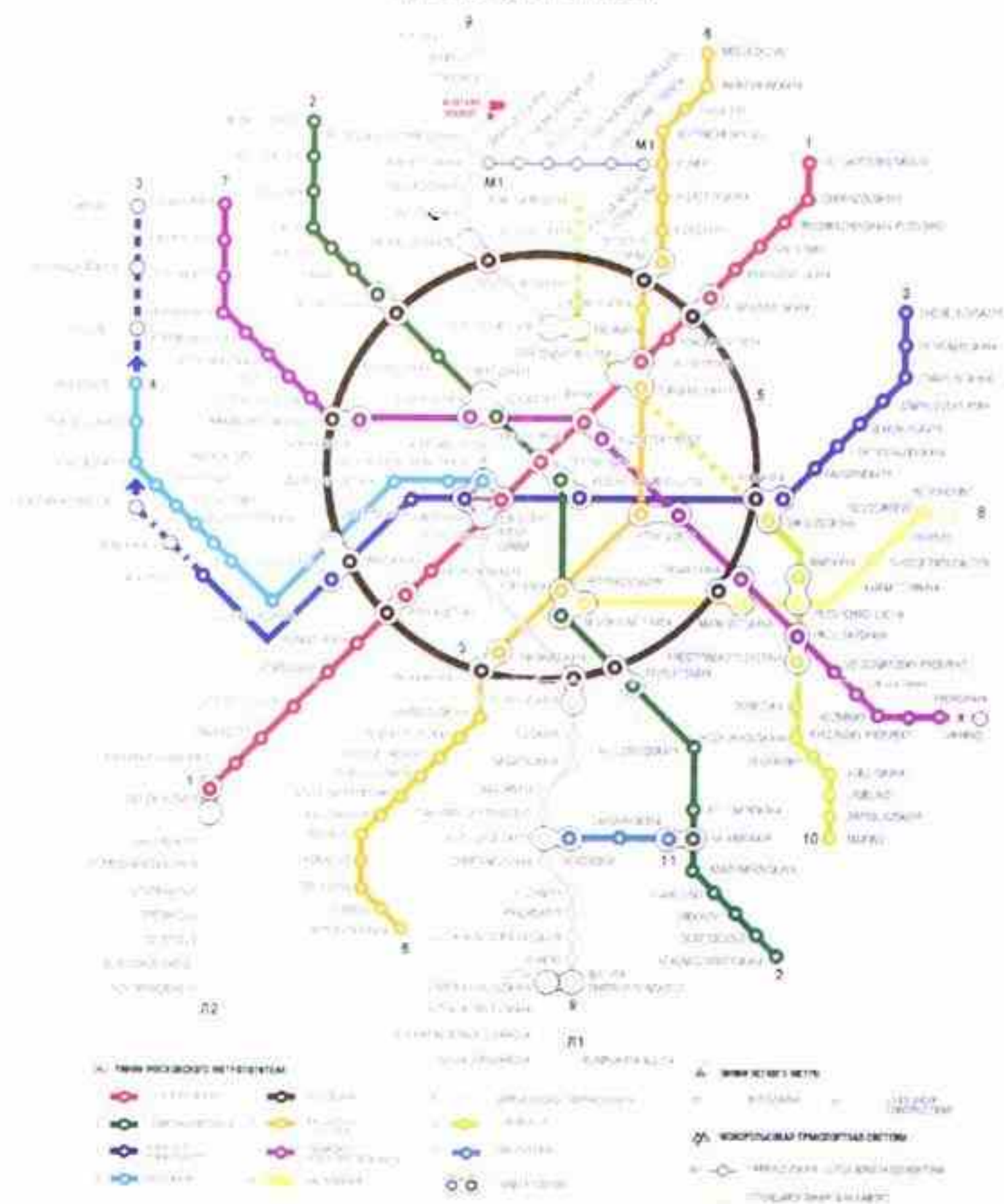
روس کی ایک جھلک

ماسکو ریلوے اسٹیشن

دنیا کے خوبصورت میٹرو اسٹیشن

اور اب اس کا کیا کرتے کہ وہاں تو سارا دن بھی بیٹھے رہتے تب بھی من سیری بہت مشکل تھی۔ تو کاروبار حیات کے لئے اُٹھنا ضروری ٹھہرا۔

اور جب ہم میٹرو سٹیشن کی کھوج میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔ ہمیں کرسی میں دھنسا بیٹھا ایک بوڑھا چہرے پر غایت درجے کا سکون اور طمانیت لئے کانسی کے مجسّمے میں ڈھلا نظر آیا تھا۔ یہ کون تھا؟ معلوم ہوا یہ رُوسی ڈرامہ نویس اوسترووسکی ہے۔ کتنی دیر میں اُس کے سامنے کھڑی اُسے دیکھتی رہی، سوچتی رہی اور ملال میں ڈوبی رہی۔ ہمارے اتنے بڑے بڑے لکھنے والے، کہیں بھی کسی کی یاد محفوظ نہیں۔ لکشمی مینشن میں سعادت حسن منٹو کا وہ گھر پتہ نہیں کن حالوں میں ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا گھر اُن کے بیٹے کی ملکیت میں ہے۔ فیض صاحب کا گھر۔ میرے اللہ کوئی سڑک کسی چوک کو بھی ان کا نام نہیں دیا گیا۔

یہیں پاس ہی مالی تھیٹر بھی تھا۔ بچوں کا تھیٹر۔

میٹرو کا نقشہ نکالا۔ جائزہ لیا معلوم ہوا ہم اُس وقت ٹیٹلر ینی (Teatralnaya) پروسپکٹ پر تھے ہمیں ہر صورت اپنے کسی بھی من پسند سٹیشن پر جانے کے لئے دو دفعہ اُترنا چڑھنا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اب ہرگز باہر نہیں آنا۔ بس میٹرو کی گھمن گھیریوں میں رہنا ہے۔ اُسی کے جلوؤں سے خود کو شاد کرنا ہے۔

ارباط سکایا کا بھی جواب نہیں تھا۔ اُس کی محرابیں اُس کے شینڈ لیرز بیل بوٹے ان کی رنگ آمیزی سبھی لاجواب تھیں۔

کیوسکایا صرف ارباط سے اگلا سٹیشن تھا۔ اور سچی بات ہے مبہوت کرنے والا تھا۔ اس کے محرابی دروازوں کی منقش کندہ کاری اور اُن میں سجی منبت کاری دونوں کا جواب نہیں تھا۔ رُوسی معاشرے کی مختلف تصویریں، چمکتے دمکتے برآمدے اور بیٹھنے کے بینچ۔

اُن کی تعمیر میں یورال، آلتائی وسط ایشیاء کاکیشیاء اور یوکرائن کے پہاڑوں کی بیس اقسام کا ماربل اور اتنی ہی اقسام کے خوبصورت رنگدار پتھر استعمال ہوئے۔ اُس کے عظیم الشان

ہال اُس کی راہداریاں اُس کے برآمدے نامور فنکاروں نے مجسّموں پینٹنگ گلاس پینٹنگ اور دیواری نقاشی سے سجا رکھے ہیں۔

میں بُت بنی کھڑی اب اِسے نمبر وَن کہتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ارباط سکا یا میرے حسابوں ٹاپ لسٹ پر تھا۔

ماسکو کی میٹرو کا ڈیزائن اور تعمیر رُوس کے بہترین ماہر تعمیرات نے کی۔ اُن کے پیش نظر اُس کا استعمال لوگوں کو آرام دینے کی سہولت کے لئے ہی نہ تھا، بلکہ ہر سٹیشن کو ایک منفرد انداز دے کر اسے دنیا بھر کی میٹرو میں ممتاز بنانا بھی تھا۔

اور مایا کووسکایا سٹیشن (Mayakovskaya) دنیا کا خوبصورت ترین سٹیشن ہے۔ اِس کا داخلی راستہ اور گزرگاہیں دھاتی کالموں پر اٹھائی گئی ہیں۔ سٹین لیس سٹیل اور بہترین گرینائٹ پر مشتمل ہیں۔ 1837ء میں اِس سٹیشن نے پیرس کی بین الاقوامی نمائش میں پہلا انعام حاصل کیا۔

اب میں کیسے نمبر وَن کہوں۔ یہاں تو سبھی ایک دوسری کو مات دیتی ہیں۔ ہمارا اخراج تحسین تو لفظ ہیں ہم تو اسی کا سہارا لیتے ہیں اور کہتے ہیں ماسکو زندہ باد۔ ماسکو میٹرو زندہ باد۔ اور ساتھ ہی یہ بھی دُعا کرتے ہیں کہ کبھی میرے وطن میں بھی ایسی میٹرو بنے۔ بے شک ہم نہ دیکھیں پر ہمارے بچوں کے بچے تو دیکھیں۔

کتنے ڈھیر سارے آنسو آنکھوں سے بہہ گئے۔ آخر آنسو کیوں نہ بہیں کہ وطن کے اتنے احسان ہیں کہ شاعر کے الفاظ میں گنواؤں تو گنوا نہ سکوں۔

باب

41

تریتایا کوف، سٹیٹ تریتا کوف گیلری • ماسکو یونیورسٹی کو اک ذرا چھونا

Третяков, Гаеударс Твини

Рас По Трогать Масковски Университета

سٹیٹ تریتا یا کوف گیلری (Tretyakov) اُس کے بانی پاؤل تریتا یا کوف کی بطور آرٹ لورکی عکاس ہی نہیں بلکہ یہ بتاتی ہے کہ کسی فن سے عشق اور اس کے لئے زندگی وقف کر دینے کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

رُوسی کلچر کی ارتقاء پذیری کے عمل کو اُس کی ملینیم سے زیادہ پینٹنگز بہت خوبصورتی سے نمایاں کرتی ہیں۔ پاؤل نے ہر اُس فن پارے کو براہِ راست، مصّور سے، یا نمائش سے اپنی ذاتی گرہ اور کاوش سے خریدا جسے اُس نے موزوں سمجھا۔

گیلری کا فرنٹ اِس قدر خوبصورت رنگین اور رُوسی تعمیراتی سٹائل سے قدرے ہٹ کر ہے کہ مجھے تو اُس کی صورت پر چینی رنگ کا پرتو محسوس ہوا تھا۔ تھوڑا تھوڑا پگوڈا سٹائل۔

مرکز میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پاؤل کا قدر آور مجسمہ ایستادہ ہے۔ متانت اور سنجیدگی کے بھرپور تاثر کے ساتھ۔

سُرخ سرمئی اور آف وائٹ رنگوں کی آمیزش کا یہ پیرہن پہنانے والا مشہور رُوسی

آرٹسٹ دی وسنٹسو (Vasnctsov) ہے۔ جس نے پاؤل کی موت کے بعد حکومتی سرپرستی میں اُس کے تمام حصوں کو ایک دوسرے سے ملاتے ہوئے اِس نئے رنگ کو نیشنل آرٹ کا نام دیا۔

یہاں ایک خزانہ تھا۔ آرٹ کا ایک جہاں آباد تھا۔ وقت تہذیب و تمدن اور معاشرہ یہاں زندہ تھا۔

کیا میرے اندر اتنی ہمت اور طاقت تھی کہ اس آرٹ کے ایک لاکھ سے زیادہ شاہکاروں کو جو بارھویں سے اُنیسویں صدی تک پھیلے ہوئے تھے دیکھ سکتی تھی۔ کیا میں اور کیا میری اوقات۔ گرافک اور سنگ تراشی میں اٹھارویں سے بیسویں صدی کے شاہکار تھے۔

اُنیسویں صدی کے اختتام تک رُوسی فنکاروں کا کام اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ یہ زندگی کی حقیقتوں سے قریب ترین تھا۔ یہ حسنِ فطرت سے قریب تھا۔ یہ انسانی روّیوں کا بھرپور عکاس تھا۔

میں ریپن (Repin) کو دیکھتی تھی۔ آئیوان ششکن (Ivan Shishkin) کو دیکھتی تھی۔ ایک جہان حیرت و مسرت کا میرے اندر سے کسی فوارے کی طرح پھوٹ کر باہر آ رہا تھا۔ ویسیلے کی فنکاری گنگ کیے جاتی تھی۔ ویلنٹن (Valentin) کے سامنے سے میرا ہٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

ویسیلے پیرو (Vasily Perov) کا Hunters Resting کیا چیز تھی۔ شکاری، شکار شدہ جانور، لباس، اُن کے چہروں کے تاثرات، آرام کرنے کا سٹائل، رنگ آمیزی اور چھوٹی چھوٹی تفصیل مصور کے نوکِ برش سے سچائی کے ساتھ پھوٹتی تھیں اور حیران کرتی تھیں۔

آئی وان کی شاہ بلوط کے جنگل میں ایک صبح کا منظر بھی متاثر کن تھا۔

ریپن کا شاہکار۔ ایوان ٹریبل (Ivan Terrible) کے ہاتھوں اپنے بیٹے کا قتل۔ میں دیکھ کر آگے بڑھتی تھی پھر لوٹتی تھی۔ پھر دیکھتی تھی۔ کینوس پر باریک سے باریک تفصیل بکھری ہوئی پوری کہانی سُناتی تھی۔ آئیوان خوفناک نے مُردہ بیٹے کو کمر اور سر سے تھام کر سینے سے لگایا ہوا

ہے۔ تاریخ رُوس کا ظالم ترین زار، ذرا سی بات پر قتل کروانا اُس کے لئے ایک مذاق۔ کسی بات پر بیٹے سے ناراض ہوا۔ ایسی ضرب لگائی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ فیدور کے جسم سے بہتا خون اور باپ کا احساس زیاں۔ مصوری نہیں فوٹو گرافی لگتی تھی۔

بڑے کمرے میں میری ساری توجہ والنٹن نے کھینچ لی تھی۔

والنٹن (Valentin) نے کمال کر دیا تھا۔

پینٹنگ میں درجنوں چہرے تھے۔ چھوٹے چھوٹے۔ آرٹسٹ کا کمال فن دیکھئے کہ ہر چہرہ اپنے تاثر کے اعتبار سے منفرد تھا۔ نمایاں تھا۔ کچھ کہتا، کچھ بولتا تھا۔

عورتوں کے سروں کو ڈھانپے رنگین کشیدہ کاریوں سے مزین سکارف، سروں پر اوڑھی اونچی ٹوپیاں، فرغل نما بروکیڈ کے فراک۔ برف پر چلتی سلیج، منحنی سی قامت والے مرد کے بھاگنے کا سٹائل، سب لاجواب تھے۔

کوشش کے باوجود مجھے اس پینٹنگ کا پس منظر معلوم نہ ہو سکا۔

اُنیسویں صدی کے جنگجوؤں (Warriors) کی پینٹنگ بھی کیا شے تھی۔ وکٹر (Victor Vasnetsov) خچروں سے لے کر ان کے سواروں کے پہناووں اور ان کی اداؤں اور ان کے تاثرات سے کیا کیا نہیں بتاتا ہے۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں؟

یہاں گھنٹے کیا، دن کیا، ہفتے کیا، مہینوں کی ضرورت تھی۔ اور زندگی کے بوجھ سے لدے پھندے انسانوں کے پاس مہینے کہاں تھے۔ ہفتے بھی نہیں تھے۔ دن بھی نہیں۔ فقط دن کے چند گھنٹے۔ سوال تو خود بخود جیسے اندر سے اُٹھ کر لبوں پر آیا تھا۔ کیا میں چند گھنٹے اور اس عظیم انسان کو خراج پیش کرنے کے لئے نہیں نکال سکتی ہوں۔ وائے مجبوری۔

میں نہیں نکال سکتی ہوں۔ مجھے ابھی یونیورسٹی جانا ہے۔ مجھے ڈاکٹر لُدمیلا سے ملنا ہے۔ اپنی تمام تر خواہش کے باوجود ابھی تک اُس کا دیدار نہیں ہوا۔ نقشے کو کھولتی ہوں۔ اُف اللہ کتنے لمبے چکر

ہیں۔ جہاں اُس وقت کھڑی ہے وہ شمال کا سرا ہے اور یونیورسٹی جنوب مغربی کونا۔ وقت بھی تھوڑا۔ ٹیکسی پکڑتے ہیں۔ تین ہزار روبل کا سُن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ دوسرے سے تیسرے سے۔ معلوم ہوتا تھا ایکا کیا ہوا ہے۔

چلو پہلے Ploshchad Revolutsu تک تو چلیں۔ پھر دیکھتے ہیں۔ اس مرحلے کو طے کیا تو سمولنسکایا کا پوچھا۔ وہاں سے باہر آئے۔ اب ٹیکسی کے لئے بھاگے۔ ایک ہزار روبل۔ سوچا۔ بہتیری بچت کر لی ہے۔ بحث وتکرار کے بعد سات سو پر بات فائنل ہوئی۔

ماسکو یونیورسٹی کو دیکھنا بھی ایک سرور آگیں اور ساتھ ہی ایک تلخ تجربہ بھی تھا۔ یہ اُن سات فلک بوس عمارتوں میں سے ایک ہے جن کے لئے ماسکو خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ 32 منزلہ عمارت اپنی بنیاد سے ایک چوتھائی کلومیٹر کی بلندی تک خوبصورت ڈیزائنوں کے ساتھ بڑھتی چلی گئی ہے۔ یونیورسٹی کیا یہ ایک پورا شہر ہے۔ ٹیکسی کشادہ سڑکوں پر چکر کاٹ رہی تھی۔ میں نے زنسکایا سے بڑے سے کاغذ پر اورینٹل اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ لکھوایا ہوا تھا اور وہی ٹیکسی ڈرائیور کو دے رکھا ہے۔

نوجوان خوبصورت طلبہ کو گھومتے پھرتے دیکھ کر بے اختیار اپنا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے یہاں سینکڑوں سائنسی تجربہ گاہیں، میوزیم، ڈھیروں ڈھیر لکچر رُومز، ہزاروں کمرے، لائبریریاں، کلب، سپورٹس ہال اور فلکیاتی رصدگاہیں، ہوسٹلز اور نا معلوم کیا کیا ہیں۔

کس قدر سرسبز اور خوبصورت علاقہ ہے۔ بلند وبالا عمارتوں کے درمیان ہرے بھرے میدان اور سکوائیر ہیں۔

سچی بات ہے وہاں تو ویسے ہی سٹی گم ہوئی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے ان سب کو دیکھنے کے لئے 150 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا ہے اور میں دو تین کلومیٹر سے زیادہ چلنے کے لئے تیار نہیں تھی تو پھر وہی بات سچی ہے نا کہ ہاتھ لگا کر مڑ آنے والی بات ہے۔ چلو یہی کہہ تو سکیں کہ یونیورسٹی دیکھی ہے۔

شام ہورہی ہے اب مجھے یہ بھی ڈر ہے کہ ڈپارٹمنٹ بند نہ ہوگیا ہو۔ کوئی پانچ چھ جگہ رُک رُک کر ڈرائیور نے پوچھا۔

پھر اُس نے ایک جگہ رُک کر ہم سے انتہائی بدتمیزی سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا کہ وہ ہرگز ہماری مطلوبہ جگہ نہیں ڈھونڈ ے گا اور نہ ایک قدم آگے جائے گا۔ سات سو روبل میں سارا شہر گھومنا چاہتی ہیں۔ پتہ نہیں یہ جگہ کہاں ہے؟ اللہ جانے یہ اُس کی عیاری تھی یا اناڑی پن تھا۔

اب حیران پریشان اندر بیٹھے ہیں۔ وہ اُتار کر سڑک پر کھڑا کرنا چاہتا ہے۔

''تین ہزار لوں گا۔''

''واپسی بھی شامل ہوگی۔'' میں نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔ اتنا ہی واپسی کا وصول کروں گا۔''

بیچ منجدھار کے مارنے والی بات تھی۔ اب کیا چکر تھا اللہ جانے۔ سوچا مزید ذلیل نہ ہوں۔ منصور سے بات کریں گے۔ کوئی نہ کوئی راستہ شاید نکل آئے۔ واپسی کے لئے کہا۔ سات سو روبل دے کر سموزنکا یا آ گئے۔ گویا جتھے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی والی بات تھی۔ پندرہ سو اکارت۔ اور وہی بات کہ ہاتھ لگا کر مڑ آئے تھے۔

باب

42

کریملن ...... رُوسی عظمت کا سمبل

کریملن فن تعمیر اور ثقافتی یادگاروں کا لینڈ مارک • کریملن ماسکو کا دل

Кримлен, Агромный Симбол Русскйх.

Кримлен, Ландмарк, Произведение Помятников

Кримлен, Сердце Москви

کریملن (Kremlin) میرے لئے کسی امیر ترین بوڑھی عورت کے اثاثوں کی بندر بانٹ کے بعد باقی رہ جانے والا وہ انتہائی قیمتی زیور کا نادر آیٹم تھا۔ جسے وہ مرتے وقت اپنی کسی دُلاری بیٹی یا کسی محبوب ہستی کو دینا چاہتی ہو۔ میں نے بھی کریملن کو سینت سینت کر رکھا ہوا تھا۔ تقریباً روز ہی اُس کے قرب وجوار سے گزرنا پڑتا تھا۔ میں بس ایک محبوبانہ نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھ جاتی تھی کہ

تھوڑا سا انتظار اور میری جان کہ ابھی دن باقی ہیں۔

وجہ تو میں اچھی طرح جانتی تھی رُوسی ریاستی عظمت کا سمبل، اس کی شان وشوکت اور دُنیا بھر میں اس کے فنِ تعمیر اور ثقافتی یادگاروں کا لینڈ مارک یہ کریملن جس کی قرونِ وسطیٰ کے زمانے کی سُرخ فصیلوں کے اندر صدیوں کی خوشبو تھی۔ متضاد تہذیبوں کے رُخ تھے یہاں۔

اور میں اِسے آخری گیت کے طور پر گنگنانا چاہتی تھی۔ آخری سوغات اور الوداعی تحفے کے طور پر اپنے ساتھ لے جانے کی خواہشمند تھی۔

اور وہ وقت آ گیا تھا۔ کل شام ہم رُخصت ہو رہے تھے۔

رات بہت دیر تک میں لٹریچر پڑھتی رہی۔ صبح اپنے ہوٹل کی پانچویں منزل (جس پر ہمارا کمرہ تھا) کی نگران اگیفیا جو بالعموم ہمارے ساتھ محبت سے پیش آتی تھی اور جس کے کمرے سے میں یا مہر النساء گرم پانی لایا کرتے تھے سے کچھ جاننے کے لئے اُن کے پاس گئی۔ اُسے الف ب کا نہیں پتہ تھا۔ یہی حال ہماری جارجیائی سہیلی زنسکایا کا تھا۔ تو بات یہ تھی کہ وہ والی کہاوت کہ مکّے منڈ بدّ وو سدے (مکے کے پاس بدّو رہتے ہیں) بڑی صحیح تھی۔

کیا وہ صبح معمول سے زیادہ روشن اور نکھری ہوئی نہ تھی۔ یا میرے جذبات اُسے کچھ خاص بنا رہے تھے۔

میں منیز سکوائیر کے ٹروئسکایا ٹاور (Troitskaya Tower) سے پہلے کوتافیہ میں چیکنگ کے مراحل سے گذر کر اس میں داخل ہوتی ہوں۔ کریملن جانے کا یہ آسان ترین راستہ ہے۔ جو 1945ء میں تعمیر ہوا تھا۔ سیاحوں کا ایک غول ہے جو آگے پیچھے پُل کی چڑھائی چڑھتے ہوئے چلا آ رہا ہے۔ حسبِ معمول میں نے مہر النساء سے پوچھا تھا۔

''تمہارا موڈ کیسا ہے؟ اکٹھے چلنا ہے یا اکیلے اکیلے؟''

''ارے نہیں اپنا اپنا راستہ لو۔''

''تو بس پھر کوتافیہ سے ملحق ٹکٹ گھر کی عمارت کے سامنے ملنا ہے۔''

ٹرنٹی ٹاور کی محرابی گذرگاہ سے اندر ٹرنٹی سکوائیر میں آ کر میں نے اِک ذرا رُک کر اپنی دھڑکنوں پر قابو پایا۔ دائیں بائیں پُرشکوہ عمارات کا سلسلہ دیکھا۔ صلیبوں سے سجے گرجاؤں کے سنہری گنبدوں کے لشکاروں سے سحر زدہ ہوئی۔ جذباتی انداز میں آسمان پر نظر ڈالی اور دھیرے سے اپنے پیارے دوست کو کہا۔

''کریملن دیکھنا زندگی کی بڑی خواہشوں میں سے ایک تھا۔ اے پیارے تیرا شکریہ۔''

منظروں سے تھوڑی سی نظر بازی ہوئی اور پھر خود سے سوال ہوا۔

''تو مجھے اب جانا کدھر ہے؟ اور کسے پہلے دیکھنا ہے؟ زاروں کو یا انقلابیوں کو۔''

اور گھمسن گھیریوں میں ڈولتے دل نے زاروں کی طرف جانے کے لئے حامی بھری تھی کہ حق اُن کا مقدم تھا۔ پر جانے ہوا کیا کہ میرے قدم جیسے میکانکی انداز میں اپنے سامنے کانگریس محل کی طرف اُٹھ گئے تھے۔ سچی بات ہے اس میں کچھ اُن کے ساتھ خصوصی محبت کا عمل دخل نہ تھا۔ ذرا سُستی کہہ لیجئے کہ عمارت میرے سامنے تھی اور گریٹ کریملن تو کہیں پیچھے تھا۔

یہ انقلابی بھی بڑے کائیاں تھے۔ یقیناً سوچا ہوگا کہ ماضی کی سطوت وعظمت کی گھمبیرتا سے پُر اس ماحول میں انہیں بھی اپنے عہد کی کوئی یادگار، کوئی نشانی چھوڑنی ہے۔ اور سارا کریملن زاروں کے پیٹے میں ہی نہیں ڈالنا۔ تو جہاں نوکروں کے رہائشی گھر تھے انہیں گرا کر جس عمارت کو بنایا گیا اُس کی تعمیر اس کی زیبائش قصداً جدید رنگ میں ہوئی۔ 1961ء میں تکمیل پانے والا یہ کانگریس محل سفید سنگ مرمر کے عمودی ستونوں کے ساتھ کھڑا کریملن کو قدیم اور جدید تہذیبوں کا دلکش نمائندہ بناتا ہے۔

کوئی چھوٹا موٹا محل تھا۔ بندے کی سٹی گم ہوتی تھی۔ بیسمنٹ (Basement) کی منزلوں کا کوئی انت نہ تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ ایسکلیٹر زتھیں وگرنہ تو حشر ہو جانا تھا۔

اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ یہ سُرخے کچھ زیادہ منفرد بننے کے چکر میں نہیں پڑے۔

پانچ منزلوں کو نیچے لے گئے اور کریملن کی عمارتوں کی چھتوں کا تناسب برقرار رہا۔

اس کا بڑا ہال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کانفرنس ہال جس کی کرسیاں سُرخ غلافوں سے یوں بجی سنوری تھیں کہ اُن پر جیسے قطار در قطار بیٹھی اجتماعی شادی والی دلہنوں کا گمان گذرتا تھا۔ لکھنے کے لئے ساتھ میں تختی تھی۔ جو اندر باہر ہو سکتی ہے۔ سماعتی آلے بھی منسلک تھے۔ کرسی کیا تھی پورا اسٹڈی رُوم تھا۔ یہاں تقریباً چھ ہزار لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ کیا شان تھی۔

اُس کے عقبی حصے سے گریٹ کریملن پیلس کو راستہ جاتا ہے پر تریم (Terem) اور Faceted پیلس پہلے آتے تھے۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے ملحق گریٹ کریملن کا حصہ تھے۔

تریم پیلس کی تو عمارت ہی گنگ کرتی تھی۔ خصوصی طور پر اُوپر کا بالائی حصہ کہ للی وائٹ اور سُرخ رنگوں کے امتزاج کے ساتھ اِن حصوں پر گتھی ہوئی ڈیزائن کاری اُس کی کھڑکیوں پر پھیلی اس قدر دلکش نظر آئی تھی کہ بے اختیار پاڑ پر چڑھے بیزم (Bazhem) تریفل (Trefil) اور لاریون (Larion) یاد آ گئے تھے۔ فن سے بھرے اپنے کلیجے نکال کر انہیں سجا گئے تھے یہاں۔ اپنی فنکار اُنگلیوں کو یقیناً فگار کر بیٹھے ہوں گے۔

اور ان سب کے بعد پتہ نہیں کس کی آنکھیں پھوٹی ہوں گی اور کس کے ہاتھ کٹے ہوں گے۔

گولڈن پورچ میں میں ہکّی بکّی کھڑی تھی۔ انرنس ہال نے مجھے حیرت زدہ کیا تھا۔ یہاں ایک نیا رنگ تھا۔ رنگین پھول بیلوں سے سجی دیواریں کہیں ہم رنگ پھولوں کے سلسلے کھڑکیوں کے رنگین شیشے۔

''یہ کونسی دنیا میرے سامنے ہے۔'' میں خود سے پوچھتی تھی۔ یہ تو مسلمانوں کا تعمیری انداز ہے۔ استنبول کے محلوں جیسے آتش دان حیران کرتے تھے۔

تریم محل کی تعمیر اور فنکاری رُوسی ماہرین کے ہاتھوں کی ہے۔ قدیم چوبی عمارتوں کا سٹائل نیچی محراب دار چھتیں کھڑکیاں چھوٹی چھوٹی ہیں جن سے مدھم مدھم روشنی اندر آتی ہے۔ خوابناک سا ماحول دِکھتا ہے۔ یہاں پیٹر دی گریٹ کے والد الیکسی میخائلووچ رہتے تھے۔

بس مجھے خاص الخاص چیزیں دیکھنی تھیں اور آگے بڑھ جانا تھا۔ اس لئے میں نے کمروں میں بیٹھی نگران خواتین سے تخت والے ہال کا پوچھا تھا اور وہیں پہنچی تھی۔ اس تاریخی ہال کی دیواروں پر آبی رنگی دلآویز تصویروں کو دیکھتے ہوئے اُس کی خوبصورت آرائش وزیبائش کو

سراہتے ہوئے مجھے وہ واقعات یاد آئے جو اس کے دامن میں سمٹے ہوئے ہیں کہ اسی ہال میں آئیوان ٹیریبل نے اُس فتح کا جشن منایا تھا جو اُسے کازان کے تاتاریوں پر حاصل ہوئی تھی۔ یہ سال 1552ء تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ اُسے ایک تاتاری شہزادی بے حد پسند آئی تھی۔ اُس نے باقاعدہ اسلامی طریقے سے اُس سے شادی کی اور اُسے ماسکو لایا۔ یہیں پیٹر دی گریٹ نے گرینڈ دعوت دی تھی جب اُس نے پولتاوا میں سویڈن کو شکست دی۔ اس کی محرابوں میں اُن اہم فیصلوں، شازشوں کی آوازیں بھی کہیں شاید محفوظ ہوں جو زار وقتاً فوقتاً کرتے تھے۔

بہت اُوپر شہزادوں کے کمرے تھے اور اُن میں اُس پیٹر اعظم کا کمرہ بھی تھا جو میرا محبوب زار بن چکا تھا اور جس کے کمرے کو میں دیکھنا بھی چاہتی تھی۔ پر نہیں۔ میں رُک گئی میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

اتنی جذباتیت کی کوئی ضرورت نہیں مجھے ادھ موئی نہیں ہونا تھا۔

لاکھ میں نقشوں سے راہنمائی لیتی تھی۔ میرے پاس ایک چھوڑ تین تین نقشے تھے۔ میں رات دو بجے تک پڑھتی رہی تھی۔ لاکھ میں نے انتونینا سے معلومات لی تھیں۔ پر یہاں جو تاریخ اور تعمیر کا پھیلاؤ تھا وہ اَن گنت تھا اور پاگل کئے دیتا تھا۔ اور ابھی میں نے آدھی پونی بھی نہیں کتی تھی۔ (یعنی میں نے تو ابھی کچھ خاص دیکھا ہی نہیں تھا)

اور گریٹ کریملن جانا تھا۔ پس جو حربے استعمال کر سکتی تھی وہ شروع کئے۔

جب پوچھ گچھ میں بے باکی بے شرمی اور ڈھٹائی کا عنصر گھلا ہوا ہو، اور یہ طے ہو کہ کسی کو اس راستے سے خالی نہیں جانے دینا اور اس سے گریٹ کریملن کا پوچھنا ہے اور پوچھتے ہی چلے جانا ہے۔ اُس فقیر کی طرح جو ہر گاڑی اور موٹر سائیکل سوار سے مانگنا ضروری سمجھتا ہے۔ تب کبھی نہ کبھی تو دال گل ہی جاتی ہے۔

ایک بڑا پیارا سا جوڑا مل گیا تھا۔ جوان، ہنس مکھ اور جوشیلا سا۔ گلاسگو سے تھا۔ جنہوں نے ہنستے ہوئے مجھے بھی ساتھ گھسیٹ لیا۔

ایک چھوٹے عقبی زینے سے ہم کریملن میں اُتر گئے تھے۔

میں نے سوچا، مجھے اس جوڑے سے اب رُخصت لینی چاہیے کہ اُن کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا میرے لئے ممکن نہ تھا اور ابھی میں شکریہ ادا کرنے کے لئے زبان کھول ہی رہی تھی کہ کسی ڈرامے کی طرح ایک ہنگامی سا منظر نمودار ہوگیا۔ میری عمر کی لگ بھگ ایک خاتون نے ہمارے قریب آ کر اُس جوڑے سے شناسائی اور محبت کا وہ پُر جوش مظاہرہ کیا کہ گذرنے والے سبھی لوگوں نے رُک رُک کر لمبی لمبی گردنیں گھما کر دیکھا۔ معلوم ہوا تھا کہ وہ لڑکے کے والدین کی دوست تھی۔ گلاسگو میں اُن کی ہمسائی تھی۔ خاتون کا بیٹا اور یہ لڑکا گہرے یار بھی تھے۔

یہ لاریسا تھی۔ رُوسی تھی۔ انگلینڈ میں جا بسی تھی۔ اکثر آتی جاتی رہتی تھی۔ لاریسا جتنی موٹی اُتنی ہی ہنس مکھ۔ رُوسی مزاج کے بالکل اُلٹ۔ اُس کی خوش مزاجی نے مجھے یوں اُس کے ساتھ لپیٹ دیا جیسے کُرسی پر پڑے لمبے دھاگے کسی کے اُٹھنے پر اُس کے کپڑوں سے چپک جائیں اور وہ اُنہیں اُتار پھینکنے کی بجائے اپنے ساتھ ہی لگائے رکھے۔ لاریسا نے مجھے اپنے ساتھ ایسے ہی نتھی کر لیا تھا۔

لاریسا ماشاء اللہ سے معلومات عامہ میں زیرو پر باتوں کی ہیرو تھی۔ اُس سے تو کہیں زیادہ مجھے پتہ تھا۔

کریملن کا یہ حصہ بوروٹسکایا پہاڑی پر تھوڑا سا ڈھلانی ہے۔ اِس شاندار عمارت پر ایک قوسی گُنبد ہے اُس کے اوپر 12 میٹر اونچا پیتل کا نوکیلا مینار ہے۔ جس پر تہواروں کے دنوں میں قومی جھنڈا لہراتا ہے۔

صدیوں کی گرم سرد چشیدہ یہ عمارتیں اندر سے کتنی نئی نکور تھیں اُس دُلہن کی طرح جو ابھی ابھی ڈولے سے نکلی ہو۔ بیرونی حصّے ضرور اُس اُدھیڑ عمر کی عورت جیسے لگے تھے جسے فیشل اور میک اپ کی ضرورت ہو۔

پر اُس کے باوجود قرونِ وسطیٰ کا تعمیری رنگ اِسے کس قدر خوبصورت اور اہم کرتا ہے۔ اس کے بڑے بڑے ہال محرابی کھڑکیاں اُن میں سے اندر آتی دھوپ کی روشنی میں چمکتے چوبی فرش۔

گراؤنڈ فلور پر شاہی خاندان کے ذاتی کمرے تھے۔ اب بھلا انہیں کیا دیکھنا تھا بہتیرے تو دیکھے بیٹھی تھی۔ نتھا سنگھ اینڈ پریم سنگھ ون اینڈ دی سیم تھنگ والا معاملہ تھا۔

لیکن سیکنڈ فلور والے ہال دیکھنے والے تھے۔ سینٹ جارج ہال سینٹ ولادی میر اور سینٹ کیتھرائن۔ سینٹ جارج ہال خوبصورت تھا، بہت بڑا تھا اور پرانے رُوسی آرڈر ''سینٹ جارج'' کے نام سے منسوب ہے جو بہادری کا ایک اعزاز ہے۔ سفید سنگ مرمر کی تختیوں پر طلائی حروف سے اعزاز پانے والوں اور اُن کی رجمنٹوں کے نام درج ہیں۔ یہاں حکومتی سطح پر کانفرنسیں ہوتی ہیں۔ سرکاری مہمانوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

اب میں باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ گرجاؤں والے سکوائیر میں، وہاں کسی بینچ پر تھوڑی دیر دُھوپ میں لیٹنے کی متمنی تھی۔

اور لاریسا سے بھی جان چھڑانی تھی۔ معاملہ اُلٹ ہو گیا تھا۔ دھاگے زمین پر گرنا چاہتے تھے۔ کپڑے اور بدن انہیں چمٹائے رکھنے کا متمنی تھا۔ بہر حال یہ مشکل مرحلہ بھی طے ہوا۔

گریٹ کریملن کا کچھ حصہ سوویت دور میں دوبارہ تعمیر ہوا تھا۔ میٹنگ ہال کس قدر منفرد سا تھا۔ دیواروں میں نیم دائرے کی صورت نشستیں۔ ہموار جگہ پر کُرسیاں جو بتدریج اوپر اُٹھتی چلی گئی تھیں۔ لکڑی کے پلیٹ فارم پر لنین کا قد آدم مجسمہ تھا۔ میں کچھ دیر کھڑی اُسے دیکھتی رہی تھی۔ ہال کی آرائش میں بڑی انفرادیت تھی۔ اُس وقت مجھے پیر اُٹھانے دوبھر ہو رہے تھے اور یہاں بڑی بھول بھلیاں تھیں۔

اللہ رُوس کی وزارت سیاحت کا بھلا کرے۔ جگہ جگہ دھرے آرام دہ بینچوں پر اک ذرا ستانے سے بندے کی ہونکتی سانسیں تو ہموار ہو جاتی ہیں۔ اب جب چلتے چلتے میری خستگی اور

بیچارگی اپنے عروج پر تھی۔ میرا جی کچھ منہ ماری کو بھی چاہ رہا تھا اور اُس پٹارے کو بھی ٹھکانے لگانا تھا جو میرے کندھے توڑ رہا تھا۔

آرام دہ نشست نے تھکن پر ٹکور جیسا کام کیا۔ کیلے، سیب اور باداموں نے توانائی بحال کی۔

پر میں خود سے کہے چلی جا رہی تھی۔

"مجھے زیادہ دیر یہاں نہیں بیٹھنا۔ باہر جانا ہے۔ دھوپ اور آرام دونوں کو انجوائے کرنا ہے۔"

اور ہوا یہ کہ پتہ بھی نہ چلا کب میرا سر چوبی پشت سے جا ٹکا؟ کب میری آنکھیں بند ہو گئیں؟ اور میں کتنی دیر اسی حالت میں رہی؟

باب
43

کیتھڈرل سکوائیر کریملن کا دل
''ورجن میری'' میلی (میری) بھی تو ہے

Церков В Площаде , Сердц , Кремлья
" Верджн-Мери" так же Мая.

اور کوئی بول رہا تھا، اُونچے اُونچے، آنکھیں کھلیں تو ایک ڈراؤنا سا منظر نیم سوئی سوئی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ ذہن تو جانے کہاں تھا؟ بیگ قدموں میں پڑا تھا۔ کاپی جس پر نوٹس لیتی تھی وہ بھی گود سے سرک کر دہنی ٹانگ کے ساتھ جڑی فرش پر کھڑی تھی۔ خود میں ساری کی ساری بکھری ہوئی تھی اور میرے سامنے کھڑی رُوسی بابشکا (بوڑھی) نگران میرے لئے لیتی تھی۔

آنکھوں میں خونخواری ہی خونخواری تھی۔

مجھے بھی دو ہفتوں نے خاصا غصہ پرُوف کر دیا تھا۔ آنکھیں مسلتی خود کو سنبھالتی میں سکون سے اُٹھی اور ویسی ہی خونخواری اپنی آنکھوں میں بھرتے اور اُس پر پھینکتے ہوئے بغیر کسی سمت تعین کے چلنے لگی۔

اسے اپنی خوش قسمتی کے کھاتے میں ڈالوں یا اپنی ذہانت کی پیٹھ تھپکوں کہ میں کریملن کے اُس بڑے دروازے سے کیتھڈرل آف دی اینسیئیشن (Annunciation) کے سامنے آ گئی تھی۔

اُس وقت میں کیتھڈرل آف دی اَنّنسیئیشن (Annunciation) کی عقبی سیڑھیوں کے سامنے بنی چھوٹی سی سنگی دیوار پر بیٹھی اس پر لیٹنے کے امکانات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ سامنے فسیٹڈ پیلس (The Faceted Palace) کی عظیم الشان بلڈنگ تھی۔ اوپر شفاف نیلا آسمان۔ ذرا پرے چوبی میدان میں چلتے پھرتے سیاحوں کے پُرے جن کا چرچ اور پیلس کے اندر جانے اور باہر آنے کا بھی سلسلہ جاری تھا۔

میں نے جرسی اُتاری۔ اُسے رول کیا۔ سرہانے رکھی اور اُس چوڑی سنگی سلیب پر یوں سیدھی لیٹی جیسے مردہ قبر میں لیٹا ہو۔ اور بیگ کو پہلو میں گھسیڑتے ہوئے خود سے بولی۔

"گنواروں کی طرح مجھے یوں لیٹے دیکھ کر یہاں گھومتے پھرتے سیاح یہی کہیں گے نا بڑی جاہل عورت ہے تو ہزار بار کہیں۔ لاکھ بار کہیں۔ میری جوتی کی نوک پر۔ تم چٹی چمڑی والے جو چاہے مرضی کرتے پھرو۔ تمہیں کسی کی پرواہ نہیں۔ تو مجھ کالی کو کاہے کی چنتا؟ بھاڑ میں جاؤ۔ مجھے تو اپنا سکھ دیکھنا ہے۔

میں تھکن اور نڈھالی کے ہاتھوں چُور چُور ہوں۔ اُس کمبخت نے مجھے باہر نکال دیا ہے۔ اب کوئی مجھے یہاں سے اُٹھائے تو میں دیکھوں۔

دھوپ کس قدر نرم گرم تھی۔ گو اطراف میں گرنے اور چوٹ لگنے کا خدشہ بھی تھا۔ پر مقدس خداوند خدا بھی تو ہمسائے میں بیٹھا تھا۔ اور ہمسائے کے کتنے حقوق ہیں؟ بھلا مجھے اُسے بتانے کی ضرورت ہے۔ کوئی انجان ہے وہ۔ تو بس مزے ٹُڑے سے پپوٹے آنکھوں پر گرے اور پھر پتہ نہیں میں کہاں تھی؟ پیٹر دی گریٹ کے کمروں میں۔ ٹریم پیلس میں یا ریڈ سکوائیر میں۔ جب جاگی تو ویسے ہی سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ میں کتنا سوئی؟ مجھے نہیں پتہ کہ سورج تو وہیں تھا جہاں اُسے چھوڑ کر گئی تھی۔

ہاتھ پاؤں کو ہلایا جلایا۔ اُٹھ کر بیٹھی۔ پاؤں کی ایکسر سائز کی۔ کیلا کھایا۔ پانی پیا۔ اور بالوں کو سنوارا۔ جوتے پہنے اور چرچوں کو سر کرنے چلی۔

کریملن تو گرجاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ محل تھے یا گرجے۔ عبادت گاہوں نے بھی سونے

کے پیرہن پہن لئے ہیں۔

یہ Annunciation تو گویا گھر کا گرجا تھا۔زاروں،زارریناؤں اور اُن کی آل اولادوں کا کہ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی تصویر یار کے مصداق خُداوند خدا مقدس باپ،ماں اور بیٹے کو گھر میں ہی قید کر لیا تھا۔

صلیبیں لشکارے مارتے طلائی گنبدوں پر کسی طمطراق سے کھڑی تھیں۔میں اندر نہیں گئی۔اندورنی آرائش وزیبائش اپنی انتہاء پر تھی اور آئی کونسٹ تصویر کشی بھی کمال کی تھی۔زاروں کا ذاتی گرجا اور کمال نہ ہو۔کیسی بات تھی۔

کیتھڈرل آف Dormition چرچ آف Deposition of our lady's robe کیتھڈرل آف Assumption،میں نے کتابچے کو دیکھا اور خود سے کہا۔

مجھے صرف ایک گرجا دیکھنا ہے اور وہ کونسا ہوگا؟

ذہن میں ایک شاعرانہ سا خیال آیا۔سب کے نام پڑھو جس میں غنائیت زیادہ محسوس ہو۔نام کے ساتھ کوئی نیا پن نظر آئے۔وہاں گھس جاؤ۔

بس تو ووٹ پڑا۔ The church of the Deposition of our Lady Robe دیکھو نا۔کچھ تو شاعرانہ بات بنی۔

یہ"Our Lady" تو بھئی ہماری بھی تو گہری رشتہ داری ہے اُس سے۔اب کوئی نہ مانے تو دوسری بات،اور اب میں توتلی سی آواز میں کہتی ہوں سویٹ"ورجن میری" میلی (میری) بھی تو ہے۔

بڑی رنگینی تھی یہاں۔یہ سب سے خوبصورت چرچ تھا۔اس کی صلیبوں اور سنہرے گنبدوں کے نچلے سٹینڈوں کی ڈیزائن داری بڑی کمال کی تھی۔کچھ زیادہ محبوبیت یوں بھی محسوس ہو رہی تھی کہ صلیبی طلائی راڈوں کے نچلے حصّوں میں ہلالی نشان بنے ہوئے تھے۔یہ ڈیزائن کاری اینیمیشن چرچ میں بھی نظر آئی تھی۔

کوئی اٹھارہ بیس سیڑھیوں کی چڑھائی کے بعد میں مرکزی عمارت میں داخل ہوئی 1486ء میں تعمیر ہونے والا یہ چرچ چیف اور گرجاؤں کے سربراہ کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔

کمرے چھوٹے ضرور تھے پر اندرونی سجاوٹ کمال کی تھی۔ دیواری نقاشی اور آئی کونسٹ تصویرکشی انتہائی خوبصورت تھی۔ آئی کون پینٹر ناظری استومی (Nazary Istomi) کی فنکاری کا بھی کوئی جواب نہیں تھا کہ باپ بیٹا اور ماں کو بڑے اچھوتے انداز میں پینٹ کیا گیا۔ پر ان کمروں میں دیر تک کھڑے رہنا بہت مشکل تھا۔ ایک مخصوص باس کی حامل فضاء نے ماحول کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

چرچ گیلری پندرھویں سے لے کر اُنیسویں صدی کے چوبی مجسموں سے بجی ہوئی ہے۔ آرٹ کے نقطۂ نظر سے یہ بہت قیمتی اور مذہبی تاریخ کے حوالے سے بہت دلچسپ تھیں۔

خصوصی طور پر سینٹ جارج کا مجسمہ بہت پُرانا شمار ہوتا ہے۔ گرجے کے نام نامی کے بارے میں روایت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ حضرت مریم کا گاؤن پانچویں صدی میں فلسطین سے قسطنطنیہ لایا گیا۔ پھر کسی زمانے میں رُوس آیا۔ وہ 25 مارچ کا دن تھا۔ یوں یہ رُوس کی مذہبی تاریخ میں مقدس دن کے طور پر منایا گیا۔ ہمیشہ یہ سمجھا گیا کہ یہ ماسکو کو دُشمنوں سے محفوظ رکھے گا اور اس نے رکھا بھی۔

قومیں چاہے کتنے بھی عروج پر کیوں نہ پہنچ جائیں۔ آسمان سے تارے توڑ کر لے آئیں۔ چاند کو جا کر چھولیں۔ پر انسانی سرشت میں سے تو ہم کو نہیں نکال سکتیں۔ کریملن اگر رُوس کا دل ہے تو کیتھڈرل سکوائیر کریملن کا مرکز ہے۔ اُس کا دل ہے۔

اُس کی سربلند صلیبیں اپنے وقار و عظمت کے احیاء پر مسرور و مغرور ہیں۔ گرجے اب میوزیم بن گئے ہیں۔ اُن کے اندر صدیاں دفن ہیں۔ اُن کی پرانی مذہبی شکلوں کو ازسرنو آراستہ کیا گیا ہے۔ موم بتیوں کا صدیوں پرانا کاجل ہٹ جانے سے اُن کے رنگوں کی شوخی اور تازگی دوبارہ نظر آتی ہے۔ ہر گرجا اپنے اندر کوئی نہ کوئی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ Assumption میں

قدیم رُوس کے زاروں کی تاجپوشی کی شاندار تقریبات ہوتی تھیں تو Archangel زاروں کا مدفن بنا ہوا ہے۔

سکوائیر کے وسیع و عریض چوبی فرش پر اِدھر اُدھر بکھری ان کی پُرشکوہ عمارتیں سفید موتیوں کی طرح دمکتی ہیں۔

ذرا رُخ بدل کر عقبی سمت دیکھتی ہوں تو بہار جیسے کھلکھلا کر ہنستی ہوئی نظر آتی ہے۔ صنوبر کے درختوں کی قطاریں، گھاس کے قطعے، مسکراتے پھول، دریائے ماسکو کے پانیوں پر سے تیر کر آتی ہواؤں کی خنکی اور تازگی نیلے شفاف آسمان پر سے آتی سنہری چمکیلی دُھوپ سب کتنا خوبصورت لگتا ہے؟

تو یہاں مشہور زمانہ زار کینن Cannon ہے اور عین اُس کے عقب میں Patriarch Palace کا چرچ Twelve Apostles ہے۔

آہنی زنجیروں کے حلقے میں مقید یہ توپ بیل بوٹوں سے سجی اور اپنے دہانے کے نیچے دھاڑتے انسان نما شیر اور اپنے سامنے دھرے گولوں کے توپ خانے کی تاریخ کی کہانی سُناتی ہے کہ یہ شاہکار کارنامے مشہور اسلحہ ساز اینڈریو چوخوف کے ہیں۔ چالیس ٹن وزنی اور ایسے ہی بھاری گولے۔ ازل سے ابد تک انسان اسی مار دھاڑ کے چکروں میں اُلجھا ہوا اپنی ذہانت اور فطانت کو منفی طرز پر آزماتا کبھی دنیا کو تباہ کرتا اور کبھی خود تباہ ہوتا چلا آیا ہے۔

تو پھر میں تین منزلہ بیل ٹاور کے سامنے جا کھڑی ہوتی ہوں محرابی کھڑکیوں سے گھنٹیاں لٹکتی نظر آتی ہیں۔ اس کے مینارے سارے سکوائیر کے گرجاؤں سے بلند ترین ہیں۔ اطالوی فنکار کا کمال نظر آتا ہے۔

سامنے وسیع و عریض میدان میں سیاحوں کے گروپ اپنے اپنے گائیڈوں کے ساتھ جتھے بنائے کھڑے انہیں سنتے تھے۔ کچھ شوق اور دلچسپی سے اور کچھ یونہی اِدھر اُدھر نگاہیں بھٹکاتے۔

گائیڈوں کے گلے جوشِ خطابت میں پھولے جاتے تھے۔ اجنبی زبانیں میدان میں

بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے ہر گروپ کو قریب جا کر سونگھا۔ ٹوہ لی۔ کہاں کے ہیں؟ خاک پلّے نہیں پڑا۔ بس تو جو انگریزی بولتے تھے اک ذرا اُن کے پاس رُکی۔ وہاں بیان جاری تھا۔

تو یہ موجودہ اکیاسی (81) میٹر اونچا گریٹ بیل ٹاور اپنے اندر لٹکنے والی چوبیس (24) گھنٹیوں کے ساتھ بہت ساری تبدیلیوں کے بعد یہاں تک پہنچا ہے۔ پہلے تو اطالوی فنکار پیٹروچ مالے نے گرجا بنایا تھا۔ پاس ہی بیل ٹاور تھا۔ دونوں میں تھوڑی سی دُوری تھی۔ یہ تو ایک دوسرے کو دُکھ دینے والی بات تھی۔ پس فیصلہ ہوا کہ دونوں کو ملا دیا جائے۔

گائیڈ نے جب بیل فرائے بیل فرائے کی تکرار کی۔ مجھے اپنا گھنٹہ گھر یاد آیا تھا۔ فیصل آباد کا گھنٹہ گھر۔ چلو چرچ کا نہ سہی۔ بازاروں کا سہی۔ کچھ تو ہے ہمارے پاس بھی۔ ہنسی بھی آئی تھی۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔

یوں یہ خوش قسمت بھی تھا کہ نپولین کے ہاتھوں بچ گیا۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی بات ہوگئی تھی۔ وہ اور اُس کی فوج ماسکو کے کریملن اور ریڈ سکوائیر میں لُڈیاں ڈالنے کے لئے مری جاتی تھی۔ سن 65 کی لڑائی کی طرح کہ جب بھارتی سینا لاہور کے جم خانے میں جام پینے کی ہڑک میں بھاگتی آئی تھی اور منہ کی کھا کر پلٹی تھی۔ یہاں بھی پڑ گئے تھے لینے کے دینے، جو ہاتھ آیا اُسے رگڑ ڈالا۔ سارے بیل ٹاور تباہ ہوگئے بس یہ خوش نصیب بچ گیا۔

اب بچنے والے کو تو پھندے تاروں سے سجانا تھا۔

تو یہ ہے آئیوان دی گریٹ بیل ٹاور۔

اس کی گوانڈ میں بسنے والی بیچاری اپنے جسامت اور حجم کے اعتبار سے دُنیا بھر میں منفرد پر بڑی شکستہ پاسی۔ ''دی زار بیل'' بیٹھی ہے۔ زار کا حکم تھا۔ تو ماسکو کے چوٹی کے دستکار آئیوان موٹورن (Ivan Motorin) کو کیا بھڑنے کا ٹا تھا کہ وہ لوہے کا صرفہ کرتا۔ اُس نے موقع غنیمت سمجھا۔ اپنے بیٹے میخائل سے کہا۔

''بادشاہوں زاروں کی اُلٹی کھوپڑیاں ہوتی ہیں۔ انہیں منفرد بننے کا بڑا چاؤ ہوتا ہے

میرے ساتھ کام کرو۔ زار کے ساتھ ساتھ تم اور میں بھی تاریخ میں درج ہو جائیں گے۔''

اور بیٹے نے جواباً تنگ کر کہا۔ اور اگر اس تاریخ میں درج ہونے کے شوق نے لنگڑے، لولے، اندھے، کانے، بنوا کر جیتے جی مروا دیا، تو پھر؟

اور باپ نے اطمینان سے کہا۔

''چلو اگر ایسا بھی ہوا تب بھی تمہاری اولاد تو ماسکو میں شاہانہ زندگی ہی گذارے گی نا۔''

پھر باپ بیٹا دونوں جتے اور دُنیا کی یہ نادر گھنٹی وجود میں آئی۔

1735ء میں اُس کا وزن 200 ٹن تھا۔ یقیناً ابھی بھی اُتنا ہی ہوگا۔ ہاں ایک ٹریجیڈی ضرور ہوئی کہ 1737ء کی آتش زدگی میں 5-11 ٹن کا ٹوٹا الگ ہو گیا۔

وہ ٹوٹا بھی بیچاری کے ساتھ جڑا کھڑا ہے۔ اب داغ تو لگ گیا نا۔ پر بجی سنوری ہے۔ چوٹی پر طلائی صلیب چمکتی ہے۔ گردن پر زاروں کی تصویریں بجی ہیں اور دھڑ پر بیل جلوے دکھاتی ہے۔

''بس بھئی بس بہت ہو گیا۔''

اور جہاں آئیوان ٹرنٹی اور سینٹ سکوائیر کا سنگم تھا۔ وہیں اُس بے حد حسین گوشے میں آ گئی جہاں ٹیولپ کے پھولوں کے ساتھ ساتھ خوش و خرم لوگوں کے جمگھٹے پھولوں کی مانند ہنستے اور مسکراتے تھے۔ اور وہاں وہ میری یار غار مہر النساء بیٹھی اونگھتی تھی اور اُس سارے ماحول میں اپنے لباس سے بڑی نرالی شے نظر آتی تھی۔

میں ذرا فاصلے پر خالی جگہ پر ٹک گئی۔ اور جب میں آنکھیں بند کیے ہواؤں کی خنکی کو اپنے اندر اُتارتی تھی۔ مجھے خیال آیا تھا۔ اطالوی ماہرین اور فنکاروں کا جن کا کریملن کو بنانے اور سنوارنے میں بڑا کردار ہے۔

پندرھویں صدی میں ماسکو ایک مضبوط اور طاقتور ریاست کے طور پر اُبھرا۔ خزانوں میں پیسے کی اُگل اُچھل (کثرت) تھی۔ ہمسائے مطیع و فرماں بردار بن گئے تھے پھر جو نچلے تو سوجھتے ہیں نا۔ حُسن و خوبصورتی اور فن سے پرانے شہروں کو آراستہ کرنے اور نئے بنانے پر توجہ ہوئی۔

کیتھرائن دی گریٹ

مصنفہ آرمری میوزیم میں

کریملین آرمری میوزیم: زاروں کے تاج، ہار، لباس اور اس پر کڑھا اسٹیٹ ایگل روس کا امتیازی نشان

باہر سے چوٹی کے فنکار آئے، معمار آئے، سنگ تراش آئے۔ جوہر قابل آیا جس نے رُوسی مزاج کو سمجھا رُوسی فن اور آرٹ کو پڑھا اور اُسے اپنا کر ساتھ اپنے رنگوں کا تڑکا لگایا کہ وہ حال ہوا کہ جب شرابوں میں ملیں شرابیں تو نشہ ہوا دو آتشہ۔

بس تو ماسکو بولتا ہے۔ پر بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں مجھے دُھا کہ کلب کی وہ شام بھی یاد ہے کہ چوٹی کا بنگالی تاجر اطالویوں کو چور اُچکے کہتا ہے۔

نوّے کی دہائی میں میں نے اسی سے ملتے جلتے خطاب لاہور کے ایک بزنس مین سے سُنے تھے۔ اور عام محفلوں میں بھی قوموں کی خصوصیات میں اطالویوں کا نمبر کہیں بہت نیچے جاتا ہے۔ تو کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ اپنے عروج سے قومیں جب زوال پر آتی ہیں تو کردار بھی پست ہو جاتے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ زوال آتا ہی اسی لئے ہے۔ جیسے مسلمان کبھی صاحب علم تھا، صاحب کردار تھا، صاحب فن و فنکار تھا۔

اور آج کیا ہے؟ رسوائے دُنیا و دین۔

مہرالنساء اپنی اونگھ سے واپس آئی۔ مجھے بیٹھے دیکھا تو بولی۔

تو ہوگئی تمہاری کریملن کی سیر اور پڑ گئی تمہیں ٹھنڈ۔

میں ہنس پڑی تھی۔ کہاں مہرو۔ آندھی کی طرح جانے اور بگولے کی طرح نکل آنے کو کیا کہتے ہیں۔ بس تو وہی میں نے کہا۔

آئس کریم کھائی ہے۔ اُس نے پوچھا۔ میں نے کھائی ہے بہت مزے کی ہے۔ مجھے تو ہرگز نہیں کھانی۔ تمہارا کیا ہے، تم تو دیگ بھی ہڑپ کر جاؤ اور تمہیں بوٹی نہ چڑھے اور ہم تو میٹھا ایک لقمہ کھالیں تو جسم خمیرے آٹے کی طرح پھول جائے۔ اتنی محنت سے ذرا سا جو گھٹتا محسوس ہوا ہے اُس خوشی کو تو اب قائم رکھنا ہے۔

تو بھاڑ کو ہوا۔ میں تو چلی برگر کھانے۔

اور میں نے بھی اُس کے پیچھے چھلانگ لگا دی تھی۔

باب

44

آرمری میوزیم

Музей Армия

اب بات تو اتنی سی ہے کہ جس عورت کے پاس رتی برابر سونا نہ ہو۔ کپڑوں کا ذخیرہ نہ ہو۔ گذر گزارے کی مختصر چیزیں ہوں اور درویشانہ سا زندگی کا سٹائل ہو۔ اس کے لئے آرمری میوزیم میں کتنی دلچسپی ہو سکتی ہے؟ یوں بھی میں سونے اور ہیروں کے ذخائر دیکھ دیکھ کر ویسے ہی رجی پُجی بیٹھی تھی۔

پر یہ بھی تو مرنا تھا کہ اب بھی بٹہ تو نہیں لگوانا تھا اور نہ ہی یہ سننا تھا کہ لو جی جو دیکھنے کی چیز تھی اور قدیم ترین تھی اُسے تو چھوڑ ہی آئی۔ مہر النساء نے ہی طعنوں سے حشر کر دینا تھا۔

توبوروٹسکایا ٹاور کے جہازی گیٹ سے داخلہ ہوا۔ ساتھ ہی آرمری میوزیم ہے۔ اس کی ارغوانی عمارت کے ساتھ کبھی کا میری پیلس آج کا ایڈمنسٹریٹو بلاک ہے۔ وسیع و عریض میدان کے پار گرینڈ کریملن پیلس تھا۔

سچی بات ہے خزانوں والا ماحول تھا یہاں۔ پُراسراریت پھیلی ہوئی تھی۔ زرد روشنیوں کے خوابناک سے ماحول میں کمرے ایک کے اندر ایک گھستے چلے جاتے تھے۔

تاریخ تو صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے پر بات اتنی سی ہے کہ یہ صرف خزانہ گھر ہی نہیں تھا بلکہ

ورکشاپ بھی تھی۔ جہاں شاہانہ جیولری بنتی۔ دھاتی، ہاتھی دانت اور استخوانی کندہ کاری ہوتی۔ طلا کاری اور ملمع کاری کے ساتھ ساتھ یہاں جنگی ساز و سامان بھی بنتا۔

تو آئیوان ٹیریبل کا ہاتھی دانت کا تخت جنگی مناظر سے سجا کیا چیز تھی؟ زاروں کے تاجوں کی ورائٹی اور اُن میں جڑے ہیرے موتی۔ اُن کی ساخت میں گندھی نفاست اور باریکی۔ آنکھیں تو مارے حیرت کے کھلتی نہ تھیں۔ یوں مجھے مینا کاری سے پور پور لتھڑے ہوئے ذرا یہ تاج ڈل ڈل سے لگے تھے۔ اب مجبوری تو سمجھ جائیے نا۔ بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔

ایک تاج تو عین درمیان میں سے دو ٹوٹے ہوا اندر سے سُرخ لشکارے مارتا تھا۔ اور پھر وہاں وہ شہرہ آفاق مونو ماخ کیپ (Monoumachus Cap) تھی جس کے بارے میں روایت تھی کہ 1547ء میں بازنطینی شہنشاہ مونو ماخ (Monomachusk) نے اپنے نواسے ولادی میر ڈیوک کو بھیجی اور جسے روسی زاروں کے لئے پہننا خیر و برکت کا باعث ٹھہرا۔

ایسٹر کا انڈہ تو ایک نادر سی شے تھی جس کے چپّے چپّے پر زاروں کا شاہی نشان ''سٹیٹ ایگل'' ناچتا پھرتا تھا۔ نیچے سے لے کر چوٹی تک رومانوف خاندان کے اہم زار اور زارینائیں سجے سنورے بیٹھے تھے۔ شاہی خاندان کا شجرہ بھی یہاں کندہ تھا۔ پھر ہیروں اور صلیب سے سجی اطالوی ٹوپی تھی نیلے نارنجی زہر مہرہ پھول پتیوں سے سجے بروچ اور پنیں دیکھ کر سچی بات ہے ہڑک سی اُٹھی تھی۔

''ہائے کتنے خوبصورت ہیں۔''

رُوسی تاریخ کی کیتھرائن دی گریٹ کا ہیروں بھرا ہار اُس کی شادی کا گاؤن جا بجا ہیروں سے سجا، مرصّع تلواریں، کھونٹیاں، کرسیاں، قیمتی بلور میں سے پھوٹتا گل لالہ کا پودا۔

سچ تو یہ ہے کہ میں تو گنگ اور پاگل سی گھومتی پھرتی تھی۔ جبکہ لوگ تو مجھے بڑے نارمل سے لگتے تھے۔ چیزوں کو یوں سرسری انداز میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے جیسے جدی پشتی رئیس زادے ہوں اور ایسی نادر چیزوں سے اُن کے سیف بھرے پڑے ہوں۔

ایک بڑی سی چادر کے بارے میں روایت تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے۔
گلابی دھاگوں سے اس پر مصلوب ہونے کی ساری داستان کشیدہ تھی۔
کل نو ہال تھے۔ کسی میں رتھوں اور گھوڑا گاڑیوں کی بے شمار اقسام تھیں۔ کسی میں سائبیرین ٹرین کا ماڈل سونے اور پلاٹینم سے بنا ہوا تھا۔ یہ گھوڑا گاڑیاں بھی سونے سے مڑھی ہوئیں۔ گھوڑوں کے چارہ کھانے، پانی پینے والی بالٹیاں بھی سونے کی۔ واہ میرے مولا صدقے جاواں تیرے۔ چھپٹر پھاڑ کر تو نے سونے کی بارش ہی برسائی زاروں پر۔

''نکھتے جانے۔ پنجابی میں اس لعن طعن سے دل کا بوجھ ہلکا کرنا مقصود تھا۔ کتنا ظلم ہے یہ بھی۔ گردن تک ہاروں اور کنٹھوں سے لدے پھندے جب یہ گھوڑے سونے کے برتنوں میں کھانا کھائیں گے تو شاہی لوگوں کا کیا پوچھو؟ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ پادریوں کے پہناووں کی شان وشوکت کا کوئی مول نہ تھا۔ سونے چاندی اور بروکیڈوں میں لدے پھندے۔

ہائے غریب کے لئے تو سارے راستے بند تھے۔ اتنا ظلم۔ پارچات کا بھی یہی حال تھا۔
میخائل فیدوروچ کا کریملن کی ورکشاپ میں تیار ہونے والا ہلمٹ اس کا عصائے شاہی اور گرزہ سبھی قیمتی پتھروں، ہیروں سے سجے، اپنی کمال کی بناوٹ سے متاثر کرتے تھے۔ بنانے والوں کی تو آنکھوں کے ڈھیلے اتنی باریک میناکاری سے پانی بن گئے ہوں گے۔

اب لاکھ میں اپنی درویشی کا ڈھنڈورا پیٹوں۔ لاکھ میں اپنی بے نیازیاں ظاہر کروں، پر جب تھک تھکا کر اُس خوابناک سے ماحول میں بیٹھی چپ چاپ ان خزانوں کو دیکھتی اور اُن کے بارے میں سوچتی تھی۔ مجھے وہ چور کیوں یاد آیا تھا اور میں نے اُس کی جگہ خود کے ہونے کا کیوں سوچا تھا؟ اب اگر یہ کہوں کہ ایسی سوچ کا درآنا دل پشوری اور ذرا لطف اندوزی کے لئے ہی ہوتا ہے۔ تو شاید یہ بھی غلط نہ ہو۔ پر میرے ساتھ مسئلہ ہے غالباً۔ ہمیشہ سے اُلٹی پلٹی تھرڈ کلاس سی سوچیں ساتھ رہی ہیں۔ اور مجھے اس کا اعتراف ہے۔ اپنی نوخیز جوانی کے دنوں

میں جب بھی میں نے محلے کی کسی لڑکی کے گھر سے بھاگ جانے کی خبر سنی یا کسی اخبار میں ایسا کچھ پڑھا۔ لمحہ بھر کے لئے میں نے یہ ضرور سوچا کہ بھلا اگر میں اُس لڑکی کی جگہ ہوتی تو۔ یہ سوچ آج بھی اس ''تو'' جیسے سوال کے ساتھ میرے سامنے تھی۔

تو اگر مجھے یہاں نقب لگانے کا موقع ملے۔ تو میرا ردِ عمل کیا ہوگا؟ کیا اُس چور کی طرح لعل و گوہر و یاقوت، سونے و کندن کے چکا چوند ڈھیروں سے مٹھیاں بھر بھر کر پاگلوں کی طرح بھاگتی پھروں گی اور جھولا بھرتی بھرتی صبح کر لوں گی۔ صبح جو ایسے چوروں کے لئے موت کا سندیسہ ہوتی ہے۔

اور غیر جانبدارانہ تجزیاتی رپورٹ نے مجھ پر یہ واضح کر دیا تھا کہ میری اور اُس چور کی کیفیات میں سرِ مو فرق نہیں ہے۔ میں زار کے تخت میں سجے بیش بہا ہیرے ہی نہیں نکالوں گی، سمور کی خوبصورت ٹوپیوں کے لئے بھی بھاگوں گی کہ وہ بہت نایاب ہیں اور اُس گھڑیال کو بھی بغل میں دباؤں گی جو ہیروں اور لعلوں سے پورم پور بھرا ہوا ہے۔

بہتیری لوٹ مار کر لی تھی عزت و آبرو سے باہر نکلنے کی ضرورت تھی سو نکل آئی۔

باب

45

لیزاویسلے سے ملنا۔ اوبمت (Obmyt) • پاک رشیا فرینڈ شپ ٹوسٹ

میرا پراسپیکٹ میں مسجد

Вестреча Василеом И Отметка
Тос За Пак – Русс – Друбы.
Мечсть На Проспет Мира.

لوحِ زندگی پر رقم ڈھیروں ڈھیر واقعات کے ملبے میں سے بروقت اپنے صحیح اور دانشمندانہ فیصلوں کو تجزیاتی جائزوں کی کسوٹی پر پرکھوں تو چند ایک کے سوا باقی تو حماقتوں کے ملبے ہی نظر آئیں گے اور اُن چند میں سے ایک رُوس کی تیاری کرتے ہوئے اپنے تین چار بہترین جوڑوں میں سے دو کا اپنے اٹیچی میں رکھنا تھا۔

نِگل وے جیاتے وڑھ وے جیا (تذبذب کی کیفیت کے عکاس احساسات) کے مصداق دونوں جوڑے کوئی سات بار نکالے اور رکھے گئے ہوں گے۔ کوئی دس بار اپنے آپ سے سوال جواب بھی ہوئے تھے۔

ایسے ہی فضول بوجھ۔ بھلا اُن کی کہاں ضرورت پڑے گی؟ پر جانے کیوں رکھ لئے؟

اور اب بریزے کے اس خوبصورت نیٹ کے جوڑے کو پریس کرتے ہوئے میں نے

کتنی خوشی اور سرشاری محسوس کی تھی۔

''ہائے کتنا اچھا کیا؟ لیزا تو امیر عورت لگتی ہے۔ فضول سے چنگڑوں جیسے حُلیے میں اُٹھ کر اُس کے گھر پارٹی پر جانا کتنی سبکی کی بات ہوتی؟''

لیزا سے ملنے کی مجھے بہت تڑپ تھی۔ جیسے جیسے میری واپسی کے دن قریب آ رہے تھے اور یہ بھی دیکھ لو اور وہ بھی دیکھنا ضروری ہے جیسی خواہشات کا پھیلاؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس اژدہام میں مَیں اُس سے ملنے سے نہ رہ جاؤں۔

اُسے فون کیا۔ اُس کی آواز میں گرمجوشی بھی تھی اور محبت بھی۔ شام کو آؤ۔ میری کزن کے گھر اوبمت کے سلسلے میں گیٹ ٹوگیدر ہے۔ اُس نے اپنا ایڈریس لکھوایا۔

''پراسپکٹ میرا۔'' 9. shchcpkina

چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔ رُوسی کلچر کی کوئی نئی چیز دیکھنے کو ملے گی۔ یہ اوبمت (obmyt) جانے کیا بلا ہے؟ اپنا ملک ہوتا تو شاید کہتی کہ کزن کے گھر بلا رہی ہو، کیا مناسب ہوگا؟ اب سوچا۔ وہ کہیں بھی بلائے۔ مجھے تو آم کھانے سے غرض ہے۔ پیڑ گننے سے تھوڑی۔

جب تک سک سے تیار ہوکر نیچے آئیں اور چابی ریسپشن کاؤنٹر پر رکھی تو اُن تینوں تک چڑھی عورتوں نے بغور دیکھا۔ قمیص اور دوپٹہ اتنے خوبصورت تھے کہ یقیناً انہوں نے اس ایویں جیسی عورت کو سجا دیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بغیر کسی دقت کے مطلوبہ جگہ پہنچا دیا۔ وقت سے ذرا پہلے تھے۔ اُس نے کاپی پر لکھے موبائل سے رابطہ کیا۔ اور ہمیں اُتار کر ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہدایت نامہ بھی جاری کر دیا۔ بلڈنگ میں داخلے سے قبل میں نے اردگرد کو دیکھا تھا۔ ایسا خوبصورت ماحول تھا۔ کئی منزلہ عمارات کی بالکونیوں میں مسکراتے پھول۔ سڑکوں کی کشادگی۔ عمارات کا نیاپن۔ یہ ماسکو کا نیا علاقہ لگتا تھا۔

اور سب سے زیادہ پرمُسرت جو چیز مشاہدے میں آئی تھی وہ پچھلی سڑک پر مسجد کا نظر

آنا تھا۔

تو اب یہاں سجدہ کرنا ہے۔ چلو عشاء کی ادائیگی ہوگی۔ لیزا جیسی عورتیں کم ہی ہوں گی۔ ہمیں لینے کے لئے وہ خود نیچے آ گئی تھی۔ اور اب سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ ایسے ہی ملی تھی جیسے کوئی بہت اپنا عزیز ملتا ہے۔

لیزا کا گھر ویسا نہیں تھا جیسا میں گمان کئے بیٹھی تھی۔ ضروری سامان سے آراستہ ضرور تھا پر کروفر ٹائپ نہیں تھا۔ ساتھ ہی اُس کی کزن کا گھر تھا جہاں ہمیں جانا تھا۔ اُس کے سادہ سے لاؤنج میں بیٹھے تو میں نے پوچھا؟

''لیزا یہ اوبمت کیا ہے؟''

تم اتنا تو جان چکی ہوں گی کہ رُوسی روایات کی ایک اہم بنیادی روایت شراب نوشی ہے۔ اہتمام اور اکٹھے ہو کر پینا بہت پسندیدہ ہے۔ رُوسی بہانے ڈھونڈتے ہیں اکٹھے ہونے اور پینے کے۔ کسی نے کوئی نئی چیز خریدی۔ چلو جی اوبمت (obmyt) ہو۔ خوبصورت زبان میں اِسے چیز کو دھونا کہا جا سکتا ہے۔ اس کی پارٹی کہی جا سکتی ہے۔ میری کزن ایلونورہ نے بی ایم ڈبلیو خریدی ہے۔ بس اُس کی خوشی میں یہ اہتمام ہے۔

ایسا تمہارے ہاں بھی تو ہوتا ہوگا لیزا نے پوچھا۔

''بالکل ہوتا ہے۔''

''لیزا ایک بات ہے۔ جب وہ کوئی سوفٹ ڈرنک لے کر آئی اور اُس نے گلاس ہمارے ہاتھوں میں تھمائے۔ ہم لوگوں نے تو کبھی ڈرنک نہیں کی۔ تمہاری اِس محفل میں ہمارا کیا بنے گا؟ ہماری وجہ سے تمہیں کوئی کوفت اور پریشانی نہ ہو۔''

''ارے میں جانتی ہوں۔ میری بہت اچھی دوست اور ہمسائی مسلمان ہے اور بڑی کٹر قسم کی مسلمان ہے۔ تم لوگ فکر مت کرو۔ وہاں جوس اور دوسرے ڈرنک بھی ہوں گے۔ میں خود تمہارے گلاس بھروں گی۔''

لیزا کی کزن کا گھر آرائش و زیبائش کے اعتبار سے یقیناً بہت شاندار ہوگا۔ اُس کی راہداری اور ڈرائنگ روم ہی سامنے آیا تھا۔ وہ اپنی سجاوٹ، فرنیچر کی سلیکشن اور سجاوٹی اشیاء کے اعتبار سے خوبصورت ترین تھا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگوں نے ہمارے داخل ہونے اور لیزا کے بولنے پر جو چُپ سادھی اور ان کی نگاہوں نے جیسے ہمارا جائزہ لیا وہ خاصا خوشگوار تھا۔ اس خوشگواری نے خدا کا شکر ہے ہماری دھڑکنوں کو ترتیب دے دی وگرنہ تو اُن کی اتھل پتھل ہمیں بوکھلائے دے رہی تھی۔

کمرے میں کوئی بارہ گیارہ لوگ ہوں گے۔ ایک جوڑا ہمارے بعد آیا تھا۔ اکثریت لیزا کی عمروں کی تھی۔ عورتیں خوبصورتی کے اعتبار سے ملی جلی تھیں۔ ہاں البتہ میک اپ اور لباس کی شوخی نے عمروں پر اگر تھوڑا سا پردہ ڈال دیا ہوتو ہم قصوروار نہیں۔ نک سک سے آراستہ پر چار پانچ سال کی ڈنڈی تو ماری جاسکتی ہے۔

یقیناً اُن میں سے کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ یا اگر کسی کو آتی ہوگی تو اس نے بات کرنے کے لئے ہمیں توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھا۔

باتوں اور قہقہوں کا شور تھا۔ سگریٹ کے مرغولوں کا زور تھا۔ پس منظر میں مدھم سی موسیقی کی دل نواز تانیں تھیں۔ ڈرائنگ روم کے آخری کونے میں میز گلاسوں اور مختلف بوتلوں سے سجی ہوئی تھی۔ دوسری میز پر کھانے چنے ہوئے تھے۔ قہقہوں کے انبار میں لیزا سے کچھ کہا گیا۔ اُٹھتے اُٹھتے اُس نے ہمیں بتا دیا تھا کہ میں ''ٹوسٹ (Toast)'' پروپوز کرنے جارہی ہوں۔

میزبان کو مبارکبادیں پیش ہوئیں۔ چھوٹے سائز کے گلاس بھرے گئے۔ انہیں ایک دوسرے سے ٹکرایا گیا۔ ''Zaudahu'' کی آوازیں بلند ہوئیں۔

بونگوں کی طرح ہم نے گلاس تھامے۔ شکر ہے لیزا کو احساس تھا اُس نے فوراً اُن میں جوس انڈیلا۔ اور ساتھ ہی ہمیں بتایا کہ یہ ٹوسٹ گڈ لک (For Good Luck) کے لئے تجویز ہوا تھا۔

وہاں تو اب ٹوسٹوں کا طوفان آ گیا۔ کبھی کوئی ٹوسٹ تجویز کرتا۔ کبھی کوئی۔

پھر لیزا نے میری طرف دیکھا اور مجھ سے کہا۔

میری توسٹی گم ہوگئی۔ سب میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ بہر حال اپنے اعتماد کو بحال کرنا ضروری تھا۔ وہ کیا۔ چہرے کی طرف دوڑتے بھاگتے خون کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے روکا۔ ''پاکستان رشیا فرینڈ شپ کا ٹوسٹ'' پروپوز کیا۔ جوس والے گلاس کو اُن کے گلاسوں سے ٹکرایا۔ اس وقت مانو جیسے سُولی پر ٹنگی تھی۔ ''پروردگارا تنا نازک سا گلاس کہیں زور سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ جوس سارے میں بہہ گیا تو کیسی سبکی کی بات ہوگی۔ ملک کی بدنامی۔ پاکستان کی عورتیں ایسی جاہل اور اِل مینرڈ ہیں۔ عزت تیرے ہاتھ میں میرے مولا۔

اُن چند لمحوں میں جیسے اُلٹے پلٹے خیالات کی ایک لام ڈور تھی جو بھاگی چلی آ رہی تھی۔ جونہی ٹکرانے کی جھنکاریں بجیں، اپنے طور پر میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ میرا گلاس خفیف سا ٹکرائے۔

یوں یہ مُسرت کی بات تھی کہ بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ ہوا۔ ہر چہرہ ہنس رہا تھا۔

پر سچ تو یہ تھا کہ ہم مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ کتنا جوس پیتے؟ ہر بار گلاس کو کیسے بھرتے۔

بڑا سا دل گردہ کرکے لیزا کا ہاتھ تھاما۔ اُس سے اجازت کے طلبگار ہوئے۔

''کھانا'' وہ بولی۔ ''نہیں لیزا۔ پلیز اجازت دو۔''

ہوسکتا ہے یہ ایٹی کیٹس کے خلاف ہو۔ میں نے سوچا۔ پھر خود سے کہا۔ پڑا ہو۔ رُوسی محسوس نہ کریں۔ پڑا کریں۔ وہاں اب رُکنا محال تھا۔ محفل عروج پر پہنچ گئی تھی۔ تالیوں کا شور اور قہقہے تھے۔ اُس ماحول میں ہم خود کو مس فٹ محسوس کر رہے تھے۔

بس کھسکنے میں عافیت جانی۔

گراؤنڈ فلور پر آئے۔ خنک ہواؤں میں کھل کر سانس لئے۔ مسجد کا پوچھا۔ قریب ہی

عقبی گلی میں تھی۔ عشاء کی نماز کا اہتمام ہو رہا تھا۔ وضو کیا۔ قضاء مغرب کے سجدے کئے۔ عشاء کی آذان ہوئی۔ نمازی تو کوئی پینتیس (35)، چالیس (40) ہوں گے۔ پر پاکستانی ایک بھی نہیں تھا۔ ایک تاجک کو ایڈریس دکھایا اور مدد چاہی۔ اُس نے کھلے دل سے مدد کی اور ہوٹل ڈراپ کر گیا۔

باب

46

الوداع ماسکو

ДОСВИДАНИЯ МОСКВА.

اور جب سُنبل کے بلند و بالا درختوں سے روئی کے گالے فضاء میں اُڑتے اور بکھرتے تھے۔ جب میں سونے رنگی دھوپ کو وسیع و عریض میدان میں بکھرے اور ہواؤں کی میٹھی سی خنکی میں خود کو نہال ہوتے، گلیارے کے اُوپر ریل کی پٹڑی پر مال گاڑی کو گزرتے اور لڑکوں لڑکیوں کی ٹولیوں کو مارکیٹ کے کونے والی دوکان پر بجتی موسیقی کی تال پر جھومتے واڈکا پیتے دیکھتے تھی۔ میں نے داشا(Dasha) کو سنا تھا جو مجھ سے کہتی تھی۔

''کل آپ کا آخری دن ہے یہاں۔ کیسا محسوس ہوتا ہے؟''

میں چند لمحے داشا کو دیکھتی رہی۔ پھر عجیب سی یاس گھلی آواز میں بولی۔

''کل پندرھواں دن ہے۔ میرے ویزے کا آخری دن۔ پر جانتی ہو میرا جی کیا چاہتا ہے؟ میں تمہارا ہاتھ پکڑوں، اُس گاڑی میں بیٹھ جاؤں جو تمہارے شہر جاتی ہے۔ دریائے دوینا (Dvina) کے ساحلی کناروں پر بستے تمہارے شہر کوتلاس Kotlas کے اُس گاؤں جہاں پہنچنے کے لئے تمہیں گھنے جنگلوں میں بہتے آبی راستوں پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ ان راستوں پر جاتے ہوئے میں سُندربن کے جنگلوں کو یاد کروں گی۔ اُن جنگلوں میں بہتے ندی نالوں پر اپنے اُس سفر کو یاد

کروں گی جب میں وہاں گئی تھی اور جب بنگلہ دیش میرا پُور بو پاکستان تھا۔

تمہارے گاؤں کے بڑے بڑے چوبی لٹھوں پر بنے مکانوں کو دیکھوں گی جو زمانے اور آگ کے ہاتھوں سیاہ ہو گئے ہیں۔ میرے چترال کے گھروں کی اکثریت بھی ایسے ہی لٹھوں پر بنے مکانوں کی ہے جو اتنے سیاہ ہو گئے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسی ابھی اُن پر پینٹ کیا گیا ہو۔ یہ گھر بالکل تمہارے گھروں جیسے ہی ہیں۔ کہیں دو منزلہ۔ کہیں یک منزلہ۔ اگلے حصے گرمیوں، پچھلے حصے سردیوں کے لئے۔

''چوبی ڈیزائن کاری کیسی ہوتی ہے؟ اُس کا تو اندازہ ہی نہیں ہے آپ کو۔''

داشا نے جب یہ کہا تو میں فوراً بول اُٹھی۔

''یہ کیا بات کی ہے داشا تم نے؟ میرے ملک کے شمالی حصوں خاص طور پر بلتستان کی خانقاہوں، امام باڑوں، مسجدوں اور راجے مہاراجوں کے گھروں کی چوبی کندہ کاری اگر تم دیکھو تو حیرت سے آنکھیں پھٹ جائیں گی تمہاری۔''

داشا نے بات وہیں ختم کردی کہ۔

''وہ کل چوبی گھروں اور گرجاؤں کی تصاویر لاکر ہمیں دکھائے گی اور پھر فیصلہ ہوگا۔''

داشا تمہارے لہجے میں چھلکتا فخر اور غرور مجھے اچھا لگا تھا جب تم بیلنا کے بارے میں بات کرتی تھیں۔ ایسے کردار ہمارے دیہاتوں میں بھی ہوتے ہیں۔ قصہ گو، مجاہدوں کے کارناموں اور لوک داستانوں کو سنانے والے۔

ایلیا موروميٹش کے بارے میں بتاتے ہوئے تم کتنی پُر جوش تھیں۔ اپنے بچپن کے اُن دنوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے تمہاری آنکھیں چمکتی تھیں۔ تو یہ ایلیا ویسا ہی ایک کردار ہے۔ ہمارے ہاں کے جگّے اور سُلطانہ ڈاکو جیسا۔ جو امیروں کو لوٹتے اور غریبوں کو نوازتے تھے۔

کاش میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر دریائے دوینا پر سفر کرتے ہوئے قدیم رُوس کی اُس تہذیب

کو دیکھ پاتی جسے شہروں میں دیکھنا ممکن نہیں۔

میں یاسنایاپولیانا جانے کی بڑی خواہش مند تھی۔ ٹالسٹائی کا وہ گھر دیکھنے جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جہاں اُس نے اپنے ادبی شاہکاروں کی تخلیق کی تھی۔ پر جیسے وہاں حاضری دینی میری قسمت میں نہ تھی۔ اُس دن KAOE میں ناشتہ کرتے ہوئے میں ورونیکا سے کہہ بیٹھی۔

"تمہارا تو گھر ہے وہاں۔ جس دن تمہاری چھٹی ہو ہمیں لے چلو نا اپنے ساتھ۔"

اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

آپ کو معلوم نہیں ہے۔ وہاں کوئی بھی چیز اصلی نہیں ہے۔ نہ وہ درخت، جنہیں ٹالسٹائی نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا نہ وہ فرنیچر، نہ وہ کمروں کا سامان، نہ وہ تصویریں۔

دوسری جنگِ عظیم میں نازی فوجوں نے ماسکو پر حملے کے دوران یاسنایاپولیانا پر قبضہ کرلیا تھا۔ ایسے ننگ انسانیت لوگ تھے کہ درختوں کو کاٹ ڈالا۔ فرنیچر جلا دیا۔ یادگار تصویروں کو آگ لگا دی۔ اُس گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں رہنے دی جس کے لئے کہا جاتا کہ وہ اصلی ہے حتیٰ کہ قبر کی بے حرمتی کرنے سے بھی باز نہ آئے۔

اور ایسا ہی سلوک انہوں نے اُس ہستی کے ساتھ کیا۔ جو دنیا کی محبوب ترین شخصیت ہے چائکوفسکی۔ ماسکو کے شمال میں واقع کلین میں اُس کا گھر جہاں اُسے نے شہرہ آفاق چھٹی سمفنی لکھی تھی۔

اُس تاریخی گھر کو اُن اندھے کانوں نے موٹر سائیکلوں کا گیراج بنا ڈالا تھا۔ اُن موسیقی کے نوٹوں کو جو ایک بیش قیمت اثاثہ تھا ضائع کر دیا۔ مجسمے توڑ دیئے۔ آرائشی چیزیں چُرا لیں۔ تصویریں پھاڑ دیں۔ چائکوفسکی کی تصویر کو پیروں سے روندا۔ حتیٰ کہ بیتھوون کی تصویروں کو بھی جو یہاں عقیدت ومحبت کے جذبات سے سجی تھیں وہ بھی پھاڑ گئے۔

یہی سلوک اُنہیں نے چیخوف، ریمسکی اور ترگینیف کے گھروں کے ساتھ کیا۔ اُجڈ، جاہل اور گنوار لوگ تھے۔

داشا چلی گئی تھی۔ میں ابھی تک وہیں بیٹھی ہوں۔ مہرالنساء کمرے میں ہے۔گلیارے کے اوپر سے پسنجر ٹرین گذر رہی ہے، ساری ٹرین میری نظروں سے گذر کر دور بہت دور چلی گئی ہے۔ اُس کی کھڑکیوں سے نظر آنے والے چہرے جو جانے کہاں کہاں سے آئے تھے اور جانے کن کن منزلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ یہ چہرے جنہیں میں نے پل بھر کے لئے دیکھا ہے اور جنہیں دوبارہ کبھی نہیں دیکھوں گی۔

گلیارے میں بیٹھی عورتیں اپنی اپنی دُکانداری میں مصروف ہیں۔ ہم نے اپنے قیام کے دوران پھل صرف ان سے ہی خریدا ہے۔ ان میں سے دو چار جیالے ہیں۔ سبزی بیچنے والی ماسکو سے ہے چھوٹی موٹی کتابیں، رسالے، اخبار، جرابیں، کنگھے اور منیاری کی دوسری چیزوں کو فروخت کرنے والی اولیا نوفسک کے شہر سے ماسکو آئی ہوئی ہے۔ پہلے دن اُن کا رویہ رُوکھا پھیکا تھا۔ دوسرے دن قدرے بہتر ہوا۔ تیسرے دن سے اب تک اچھی خاصی دوستی ہوگئی ہے۔ زبان کا مسئلہ آڑے آتا ہے پر مسکراہٹوں اور جسچر کافی حد تک مدد کرتا ہے۔

میری نظروں کا رُخ بے اختیار سامنے کی طرف اُٹھ گیا ہے۔ وسیع وعریض میدان کی طرف جو سونے جیسی دھوپ میں نہا رہا ہے۔ جس کے کناروں پر سُنبل کے درخت ہیں۔ جن درختوں سے روئی اُڑ اُڑ کر راستوں پر بکھرتی ہے کہ میں سوچتی ہوں اگر اسے اکٹھا کرلوں تو میرا تکیہ بن سکتا ہے۔ ماسکو سے ہمیں سوونیرز نہیں ملے۔ چلو یہی نشانی سہی۔ میدان میں آگے پیچھے کھڑی 340، 787، 999، 209، 203، 904، 345 نمبروں کی بسیں جنہوں نے پورا ماسکو اس قدر سہولت اور آرام سے یوں مجھے متعارف کروایا کہ میرے پاس شکریے کے چند الفاظ ہی ہیں۔

ماسکو کی بلند قامت عمارات سے میرا تعارف ایک بار تھوڑی کئی بار ہوا۔ اس کی کشادہ ترین شاندار سڑکوں کو میں نے ان بسوں سے دیکھا۔ اور بار بار دیکھا۔ ان کھڑکیوں سے جھانکتی میں نے سمولینسکایا (Smolenskaya) سکوائر میں وزارتِ خارجہ کی بے حد شاندار اور جاہ وجلال

والی عمارت کو دیکھا اور حیرت زدہ ہوئی۔ رُوس کی خارجہ پالیسی کی نمائندہ عکاس ہے یہ عمارت۔ انہی سڑکوں پر چکر کاٹتے گھومتے پھرتے میں لیونیسکا یا گورے کی خوبصورتی سے آشنا ہوئی۔ یہ ماسکو کا جنوب مغربی حصّہ ہے۔ دریائے ماسکو کے کنارے واقع اِس پہاڑی جگہ سے پورا شہر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک طرف شہر ہے۔ دوسری طرف ماسکو یونیورسٹی کا شہر۔

1930 سے 1950 تک ماسکو کو نیو کلاسیکل سٹائل کے رنگوں سے سجایا گیا۔ Vosovy Gory کی پہاڑی سے بھی منظروں کا نظارہ کیا اور میں نے یونیورسٹی کو بھی چھوا۔

میدان میں کھڑی اور چلتی بسوں کے ڈرائیور بھی جان گئے تھے۔ ہر روز ساڑھے تین چار بجے واپس آتے۔ تھوڑا سا آرام کرتے، پھر کیفے میں آجاتے۔ مزیدار چائے پیتے کبھی اندر کبھی باہر گول چبوترے پر بیٹھ کر۔ تینوں میں سے جو جو حاضر ہوتی۔ اُس سے گپ شپ کرتے۔ اور پھر بس میں بیٹھ کر نئے محاذ پر نکل پڑتے۔ نو دس بجے تک ہم اِن بسوں میں گھومتے۔ کبھی ایک بس سے اُتر کر دوسری میں بیٹھ جاتے۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ ایک چکر کے بعد بیٹھے رہتے۔ 209 کا ڈرائیور بڑا ببیا سا تھا۔ نیوار باط اور Vorobyovy Hills کے نظارے ہم نے اِن ہی بسوں سے لُوٹے۔ خوبصورت پُلوں سے گزرے۔ وائٹ ہاؤس دیکھا۔ یہ نئے ماسکو کا سمبل ہیں۔ جنگ عظیم کے قیدیوں کی محنتوں کا ثمر۔ نووڈوچی کونونٹ (Novodevichy) کی خوبصورت عمارتوں کے بیرونی نظاروں سے ہی دل کا رانجھا راضی کیا۔ ماسکو کی مغربی سمت کی انتہاؤں پر واقع اس مناسٹری کو ہم سے کہاں دیکھا جانا تھا۔

ماسکو کا صنعتی علاقہ، اُس کے پارک، دریائے ماسکو کے پانیوں سے بنائی ہوئی مصنوعی جھیلوں میں شام کی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں میں تیرا کی کرتے چھوٹے چھوٹے بچے، برچ اور صنوبر کے درختوں کے ذخیروں میں اُترتی شاموں کی اُداسی اور تنہائی کو ہم نے بہت قریب سے دیکھا۔

اب ماسکو کے پونے دوسو کے قریب میوزیم اور نمائش گاہوں کو دیکھنا ہمارے لئے کہیں ممکن تھا؟ کتنے بے شمار تھیٹر ہیں؟ پینتالیس، پچاس۔ ڈھیروں ڈھیر تعلیمی ادارے، لائبریریاں

اور کلچرل سینٹرز ہیں۔ کتنا کچھ دیکھتے لیتے؟

KaOe کی خوبصورت لڑکیوں نے بہت محبت دی۔ سچی بات ہے ہم نے بھی تمہاری چاہت میں باہر کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا۔

تو اب رُخصت ہوتے ہیں۔ ڈھیر سارا پیار۔ زنسکایا۔ دوشا اور روزیکا۔

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ فاروق ہمیں لینے کے لئے آ گیا اور وہ ہمیں اپنے بڑے بھائی کے آفس میں لے آیا۔ وقتِ رُخصت میں ماسکو مین مقیم کسی ایسے رشتے دار کو ملنا نہیں چاہتی تھی جس نے مجھ سے میرے قیام کے دوران ملنا پسند نہ کیا۔ پر فاروق مصر تھا۔ بہت شاندار آفس تھا۔ میں نے ذوالفقار کو دیکھا۔ ایک دلکش نوجوان میرے سامنے کھڑا تھا۔ جس نے معذرت بھرے انداز میں کہا کہ اُسے ہماری آمد کا پتہ نہیں چلا۔

''یہ لڑکے بہت غیر ذمہ دار ہیں۔'' اُس کا اشارہ کراچی اور ماسکو میں مقیم اپنے بھائیوں کی طرف تھا۔ ''کوئی بات نہیں بتاتے ہیں۔ میرا گھر تو آپ کے ہوٹل کے نزدیک ہی تھا۔''

تو کیا وہ گونگلوؤں پر سے مٹی جھاڑ رہا ہے؟ میں نے خود سے پوچھا تھا۔ اور یہ سوال بھی اپنے آپ سے کیا یا وہ سچ کہتا ہے۔ زندگی کی تیز رفتاری بھی تو بڑی ظالم ہے۔

وہ کاروباری میٹنگز میں مصروف تھا۔ چھ سے آٹھ جون تک پیٹرز برگ میں غالباً وہ اسی کانفرنس کی بات کرتا تھا جسے اینڈ کرنے میخائل بھی آیا تھا۔

اُسے افسوس تھا کہ وہ میری ملاقات لُدمیلا سے کرواتا۔ وہ ڈاکٹر لُدمیلا کو جانتا تھا۔ اُس کی خوبصورت اُردو کا مداح تھا۔ میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی اُتر آئی تھی۔ بڑی لمبی سانس میں نے بھری تھی۔

میں لُدمیلا سے نہ مل سکی۔ میں شعبہ اُردو کے طلبہ و طالبات سے نہ مل سکی۔

اگر میں یہ سب جانتی تو ڈھیٹ بن کر اُس کے دروازے پر جا کھڑی ہوتی۔ کم از کم اِس ''ہُوک'' کے ساتھ تو واپسی نہ ہوتی۔

اس کمرے میں چائے کا کپ مجھے جس لڑکے نے تھمایا تھا وہ میرے گاؤں کا خوشیا تھا۔
جو مجھے حیرت سے دیکھتا تھا کہ یہ یہاں کیسے؟
خوشیا تو وہاں محنت مزدوری کرنے گیا تھا۔ اور میں؟ رُوس دیکھنے۔
مگر دیکھا میں نے کتنا؟

اِتنے بڑے وجود کی
چھوٹی سی اِک جھلک